

اسیرِ موسمِ ہجر

ضواریہ سامر

PDFBOOKSFREE.PK



PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

www.pdfbooksfree.pk

اسپر موسم ہجران



PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

ضواریہ سآتر

پبلیکیشنز

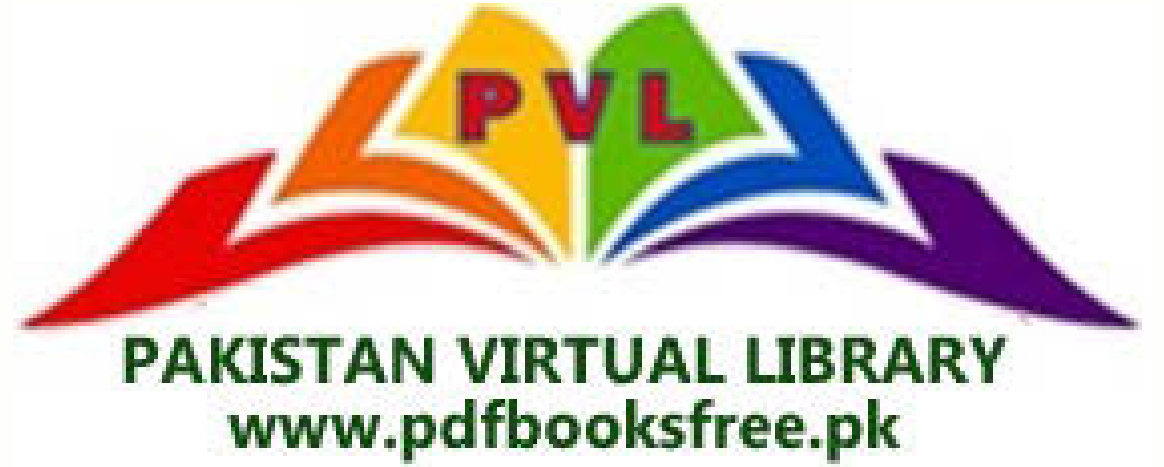


ہیڈ آفس: مٹہ بابا فرید ضلع کچہری لاہور 042-37311965

For More Urdu Books Please Visit: www.pdfbooksfree.pk
سب مبر 12 مرسہ قلمی منڈی (اردو بازار، لاہور)

انتساب

اپنے پیارے سے باباجانی اور امی کے نام
جن کی محبتیں پا کر ماضی کا ہر دکھ بھول گئی
ان کے تعاون کے بغیر شاید میں یہ چند
لفظ بھی نہ لکھ پاتی۔



جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

- ناشر آفتاب ہاشمی
- نام کتاب اسیرِ موسمِ ہجراں
- مصنفہ ضواریہ سائر
- کمپوزنگ ایمان گرافکس، لاہور
- قیمت 175/- روپے

بھاگتے ہوئے قدم یکدم رک گئے اس نے پلٹ کر اپنے عقب میں دیکھا، سیاہ گھورتا رنگی کا عفریت چاروں اور اپنے پنجے گاڑے ہوئے تھا لیکن اسے اس اندھیرے میں سفر کرتے کچھ دیر ہو چکی تھی اس لیے یہ اندھیرا یہ تاریکی اس کی نگاہوں سے نامانوس ہرگز نہیں تھی۔ پھولی ہوئی سانسوں کو اعتدال پر لانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اس نے ایک بار پھر پاؤں آگے بڑھا دیئے۔ حلق خشک لکڑی کی مانند چیخ رہا تھا ہر بن مو سے پسینہ کسی سیل آب کی مانند رواں تھا۔ اس کے پرانے بوسیدہ لباس کو پسینہ تر کر چکا تھا لیکن وہ بھاگ رہی تھی۔ اسے بھاگنا تھا جانے کون سی منزل اس کی منتظر تھی؟ کہاں اس کا پڑاؤ ہونا تھا؟ کون سی جگہ ایسی تھی جہاں پہنچ کر اس کی مسافت نے دم توڑنا تھا؟ وہ خود نہیں جانتی تھی۔ جو وہ چھوڑ آئی تھی نہیں سوچنا چاہتی تھی لیکن بار بار سوچیں اس کے ذہن میں کیٹلس کے خار بن کر اتر جاتی تھیں۔ وہ غمناک تھی پیاس سے بے حال تھی لیکن پھر بھی جس قدر جلدی ہو سکتا تھا وہ یہاں سے بہت دور نکل جانا چاہتی تھی۔ جہاں اس کے ماضی کا اندھیرا اس کا تعاقب نہ کر سکے۔ یہ سڑک سے ابھی قدرے فاصلے پر تھی۔ جھاڑیوں اور درختوں کی اوٹ لے کر بھاگ رہی تھی کہ یکدم کہیں دور سے روشنی کی ایک باریک سی لکیر نے اس کی اندھیرا شناس آنکھوں کو جھنجھوڑ دیا۔ وہ ڈر گئی، سہم گئی۔

انسان نما درندوں کے چنگل سے نکلنے کی خاطر اس نے مسافت کا راستہ چننا تھا لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ دنیا میں قدم قدم پر اسے ایسے ہی انسانوں سے واسطہ پڑے گا۔ وہ سڑک کے کنارے نئی تعمیر شدہ دیوار کے ساتھ رکھے اینٹوں کے ڈھیر کے پیچھے دبک کر بیٹھ گئی۔ اس کی رگ رگ میں خون کی جگہ خوف دوڑ رہا تھا۔ دل کی دھڑکن یوں تھی جیسے اس کی رفتار کا کوئی تعین ہی نہیں تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا ابھی دل سینے کی پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ ہلکی ہلکی روشنی اب قدرے تیز ہو گئی تھی ساتھ ہی قدموں کی چاپ بھی ابھرتی معلوم ہوتی محسوس ہونے لگی۔ اس نے اپنا آپ مزید سمیٹ لیا۔ تیز ہوتے تنفس کو قابو میں کرنے کے لیے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر سختی سے دبایا۔ اور سر کو قدرے اونچا کر کے آہٹوں کی سمت دیکھا۔ وہ کوئی چوکیدار تھا جو سامنے سے آ رہا تھا۔ پھر کچھ ہی دیر بعد جب قدموں کی چاپیں بالکل مدہم پڑ گئیں تو



PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

اس نے ایک بار پھر اینٹوں کے ڈھیر کے عقب سے جھانکا تاریکی میں چوکیدار کا بس ہیولا سا ہی دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ڈھیر کے پیچھے سے نکلی اور ایک بار پھر اندھا دھند بھاگنے لگی۔ وہ جلد سے جلد کسی محفوظ پناہ گاہ پر پہنچ جانا چاہتی تھی۔ سڑک کے کنارے درختوں کے جھنڈے سے نکل کر وہ سڑک پار کرنا چاہتی تھی لیکن اچانک اسی اثناء میں ایک تیز رفتار گاڑی اس کے بے حد قریب پہنچ گئی۔ اس کی خوفزدہ آنکھیں جیسے ساکت سی ہو گئی تھیں۔ اسے اتنا ہی محسوس ہوا تھا جیسے گاڑی کے نائز چرچرائے تھے۔ پھر جیسے اس کے وجود کو ایک زوردار دھکا لگا تھا۔ اس کے بعد کیا ہوا اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ باہر کی پھیلی ہوئی تاریکی اور سناٹا اس کے وجود کے اندر اتر گیا تھا۔



آج خلاف معمول انہیں کلینک سے کچھ دیر ہو گئی تھی اور دیر کا موجب وہ ایمر جنسی کیس تھا جو شام سات بجے ان کے کلینک پر لایا گیا تھا۔ ایک چھ سالہ بچے کو ایک تیز رفتار بس نے کچل دیا تھا۔ بچے بالکل جاں بلب تھا جب ان کے پاس لایا گیا۔ انہوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ کسی طرح اس معصوم کو بچالیں لیکن شاید مشیت ایزدی نے اس کی زندگی کی اتنی ہی بہاریں لکھی تھیں۔ اس بچے نے ڈاکٹر فواد کے ہاتھوں میں دم توڑا تھا۔ اور اس وقت سے اب تک جبکہ رات کے گیارہ بجے کا عمل ہو گا ان کی طبیعت کا بوجھل پن دور نہیں ہو پایا تھا۔ مسلسل اڑھائی گھنٹوں کی محنت ضائع ہو گئی تھی۔ ذہن پر جیسے اداسی کی لکیر سی جم گئی تھی۔ سوچوں پر جمود طاری تھا۔ نگاہوں کے سامنے جیسے ایک ہی منظر ظہر سا گیا تھا۔ نادانستگی میں ایک سیلیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھتا چلا گیا سوچوں میں گم ہونے کے باعث انہیں روڈ کراس کرتا ہوا وہ نسوانی وجود نظر نہیں آیا تھا۔ وہ چونکے تب جب وہ گاڑی کے سامنے آ گئی۔ غلٹ میں بریکوں پر پاؤں رکھنے کے باعث گاڑی کے نائز بری طرح چرچرائے تھے لیکن دیر ہو چکی تھی۔ وہ وجود ان کی گاڑی کی زد میں آ چکا تھا۔ انہوں نے جلدی سے اپنی طرف کا دروازہ کھولا اور گاڑی سے باہر نکلے۔ ہلکے سرمئی رنگ کے پلین کاٹن کے سوٹ میں ملبوس وہ اس سیاہ تاریک رات کا ہی ایک حصہ لگ رہی تھی اور وہ سڑک پر اوندھے منہ مڑی ہوئی تھی۔ ریشمی سیاہ بالوں نے اس کے چہرے کو اپنی حفاظت میں لے رکھا تھا۔ انہوں نے تیزی سے آگے بڑھ کر اسے سیدھا کیا۔ اس کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا جو غالباً سڑک پر گرنے کے باعث لگنے والی چوٹ کی وجہ سے تھا۔ بظاہر پورے وجود پر کوئی زیادہ نمایاں چوٹ یا زخم نظر نہیں آ رہا تھا۔ ممکن ہے وہ خوف و دہشت کی زیادتی سے بے ہوش ہو گئی ہو۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اچانک کوئی غیر متوقع حادثہ ہمارے حواس سلب کر لیتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی شاید یہی ہوا ہو گا۔ ڈاکٹر فواد نے سر اٹھا کر ارد گرد دیکھا اور دور تک کسی ذی روح کا وجود اساطعت میں نہیں آیا تھا۔

”تو کیا یہ لڑکی اتنی رات گئے اکیلی ہی کہیں سے آ رہی تھی۔ کیا مسئلہ ہو گا اس کے ساتھ۔“ انہوں

نے اس کی پیشانی سے بھل بھل بہتے خون کو دیکھا۔ ایک ہاتھ سے اس کی پیشانی کے زخم کو زور سے دباتے ہوئے انہوں نے ایک بار پھر سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا مگر نتیجہ اب بھی وہی تھا۔ ہرگز رتا لحد اس اجنبی لڑکی کو زندگی کی رنگینیوں سے دور لے جا رہا تھا۔ انہوں نے پیشانی سے اس لڑکی کی طرف دیکھا اور پھر جیسے یکدم ہی فیصلہ ہو گیا انہوں نے اسے اٹھا کر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔ خود تیزی سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی آگے بڑھادی۔ تیزی سے گاڑی دوڑاتے وہ پانچ چھ منٹ میں ہی پندر منٹ کا راستہ طے کر کے گھر پہنچ گئے تھے۔ چوکیدار نے گیٹ کھولا اور وہ گاڑی اندر لے گئے۔ گاڑی کو پورچ میں کھڑا کر کے باہر نکلے۔ وسیع و عریض کوٹھی کے بیشمار کمروں کی لائٹس آف ہو چکی تھیں لیکن ایک کمرہ جو کوٹھی کے بالکل کونے میں تھا۔ اس کے باہر جلنے والی لائٹ دیکھ کر ڈاکٹر فواد نے طمانیت بھرا سانس لیا۔ بیک ڈور کھول کر انہوں نے اس زخمی لڑکی کو باہر نکالا اور کندھے پر ڈال کر لمبے لمبے ڈگ بھرتے اس کمرے کی جانب بڑھ گئے۔ دروازے کے بالکل قریب پہنچ کر انہوں نے اندر جھانکا۔ پھپھوہینا حسب معمول تحت پوش پر بیٹھی ہاتھ میں تسبیح لیے اپنا وردہ ہراریں تھیں۔ ان کی خوبصورت آنکھیں بند تھیں۔ چہرے پر نرمی اور روشنی کا جو ملا جلا تاثر تھا ان کی شخصیت کو ایک عجیب سا تقدس بخشتا تھا۔ سفید دوپٹے کے ہالے میں ان کا صبیح چہرہ اپنے اندر جیسے پوری کائنات کا حسن سمیٹے ہوئے تھا۔ ڈاکٹر فواد نے آگے بڑھ کر دھیرے سے ان کو پکارا۔

”پھپھوہینا۔“

انہوں نے چونک کر آواز کی سمت دیکھا۔ آنکھوں میں تعجب کی پرچائیں سی لہرائی۔ ”فہدی تم اس وقت اور..... اور یہ.....“ ان کا جملہ ڈاکٹر فواد کے کندھے پر جھولتی بے ہوش لڑکی کو دیکھ کر ادھر وارہ گیا۔ ڈاکٹر فواد نے آگے بڑھ کر اس لڑکی کو بیڈ پر لٹا دیا۔

”میری گاڑی سے ایکسڈنٹ ہو گیا ہے۔ نہ جانے کون ہے..... کہاں سے آ رہی تھی..... کہاں جانا تھا..... کچھ علم نہیں؟ جب سے ایکسڈنٹ ہوا ہے بے ہوش ہے۔ پھپھوہینا اسے دیکھئے گا میں اپنا فرسٹ ایڈ باکس لے آؤں۔“ ڈاکٹر فواد کمرے سے نکل گئے۔ پھپھوہینا نے جائے نماز کا کونہ موڑا اور اٹھ کر بیڈ کی طرف آ گئیں۔ بیڈ پر بے ترتیبی سے بکھرے وجود کو قدرے سمیٹ کر چادر اوڑھائی اور اس کے قریب بیٹھ گئیں۔ بخور اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ کچھ مانوس سے نفوش تھے لیکن پہلے کبھی دیکھا نہیں تھا۔ اس کی غلافی آنکھیں..... پگھڑیوں جیسے ہونٹ..... تالیاں ناک..... چاند کی طرح روشن پیشانی اور پیشانی کے گرد کالے بالوں کا ہالہ۔ شینا پھپھو کی آنکھوں میں اس کے لیے محبت بلکورتے لینے لگی۔ دل میں ایک نرم سا احساس چٹکیاں لینے لگا۔ دروازے پر کھٹکا ہوا۔ ڈاکٹر فواد اندر آ گئے تھے۔ انہوں نے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر باکس رکھا۔ روٹی بھلو کر اس کی پیشانی کا زخم صاف کیا اور پھر اس کی بیڈ میں

کرنے لگے۔ پھپھو بھی قریب بیٹھی بغور ان کو دیکھے جارہی تھیں۔ بینڈ تاج سے فارغ ہو کر وہ کمرے سے ملحقہ ہاتھ روم میں جا کر ہاتھ دھو کر آئے اور پھر پھپھو کے پیروں کے پاس نیچے قالین پر بیٹھ گئے۔
 ”فہدی کوئی اور مسئلہ تو نہیں؟“

”اوہ پھپھو! کیوں پریشان ہو رہی ہیں کوئی اور مسئلہ نہیں ہے۔ آپ تو جانتی ہیں اچھی طرح میں امی سے پھر بھی جھوٹ بول سکتا ہوں لیکن آپ سے..... ناممکن!!“

”فہدی میں تمہیں اچھی طرح جانتی ہوں میں پریشان نہیں ہوں۔ بس یونہی لڑکی ذات ہے ناں سب گھر والے کیا کہیں گے یہ سوچ پریشان کر رہی ہے۔ خیر پتی تو تم نے کر دی ہے اب اس کو ہوش میں لانے کی بھی کوئی تدبیر کرو۔“ پھپھو ہینا کے کہنے پر انہوں نے خود بھی سوچا کہ ایک گھنٹے سے زائد وقت گزر چکا تھا۔ حادثہ اتنا شدید بھی نہیں تھا کہ بے ہوشی اتنی طویل ہوتی۔ ابھی وہ اسے ہوش میں لانے کا سوچ ہی رہے تھے کہ کمرے میں کسی نے جھانکا یہ تائی مقسوم تھیں۔ گھر بھر میں پھپھو ہینا کے بعد ڈاکٹر فواد اگر کسی پر اعتبار کرتے تھے تو وہ تائی مقسوم تھیں۔ اللہ کی طرف سے ان کی گود خالی تھی لیکن دل غنی تھا۔ خدا نے ان کے دل میں ممتا کے خزانے بھر دیئے تھے۔

”ہینا کیا بات ہے! یہاں کیا کر رہا ہے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟“ تائی کے لہجے میں سچی پریشانی تھی۔

پھپھو ہینا کے چہرے پر ایک مسکراہٹ پھیل کر معدوم ہو گئی۔

”بھابی..... میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ اندر تو آئیے۔“ تائی مقسوم نے بینڈ پر لپٹی ہوئی لڑکی کو دیکھ لیا تھا۔ قدرے حیران سی وہ کبھی پھپھو کی طرف دیکھ رہی تھیں اور کبھی ڈاکٹر فواد کی طرف۔

”یہ..... یہ..... کون ہے یہ لڑکی؟“

”تائی امی میری گاڑی سے ٹکرا ہوئی تھی۔“ ڈاکٹر فواد نے مختصر سا جواب دیا۔

”او اللہ کے بندے تو اس کو گھر کی بجائے ہسپتال لے کر جانا چاہتے تھے۔ خدا جانے کتنی زخمی ہو۔“ تائی کے لہجے میں تردد تھا۔

”اوہ تائی امی..... کچھ زیادہ چوٹ نہیں ہے۔ دہشت کے زیر اثر بے ہوش ہے۔ ابھی ہوش میں آجائے گی۔“

”تو بھلا کوئی پوچھے تو سہی یہ رات کے اس پہر سڑک پر کیوں دندناتی پھر رہی تھی۔ ایک تو آج کل کی لڑکیاں بھی شتر بے مہار کی طرح جدھر منہ اٹھا چل پڑیں۔ اب خدا معلوم کس کی بہن بیٹی ہے۔ ان کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی؟“ تائی مقسوم ہمدرد تو تھیں لیکن حقیقت پسند بھی تھیں اس بارے میں نہ ڈاکٹر فواد نے بھی نہیں سوچا تھا۔ پھپھو ہینا کی دو ہی بیٹیاں تھیں روپیہ اور بیٹھہ وہ دونوں بھی باتوں کی آوازن کر

پھپھو کے کمرے میں آگئیں۔ وہ دونوں انتہائی اشتیاق سے اس خوابیدہ وجود کو دیکھ رہی تھیں۔
 ”مما..... یہ کون ہیں؟“ بیٹھہ کا لہجہ بھی اشتیاق سے لبریز تھا۔

”جنا نہیں جینا..... زخمی ہے۔ ہوش میں آئے گی تو پتا چلے گا۔“ پھپھو ہینا اسے جواب دینے کے ساتھ ساتھ اس لڑکی کو بھی دیکھ رہی تھیں۔ جود میرے دھیرے کسماری رہی تھی۔ اس کے بند ہونٹ وا ہوئے اور ان میں سے ایک سسکاری بلند ہوئی اور پھر جیسے رفت رفت وہ ہوش میں آنے لگی تھی۔ نیم وا ہونٹوں سے غہر غہر کر کر اہیں نکل رہی تھیں۔ کمرے میں موجود افراد نے چونک کر اس کی سمت دیکھا اور پھر سب ہی اس کے ارد گرد بیٹھ گئے۔ سب کی نظروں نے اسے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ اور پھر سب نے دیکھا کہ اس نے دھیرے دھیرے اپنی غلافی آنکھوں پر سے پردہ اٹھالیا۔



اسے خبر نہیں تھی کہ وہ کتنی دیر تک تاریکیوں کی ہمسایہ رہی تھی۔ جانے کتنے لمبے کتنے گھنٹے کتنے دن بیت چکے تھے۔ اس کے حواسوں پر سیاہ کپڑے نے تسلط جما رکھا تھا۔ پھر جیسے اس کپڑے کی چادر میں نئے نئے شکاف پڑنے لگے۔ اندھیرے پر روشنی غالب آنے لگی۔ روشنی جو زندگی ہے۔ روشنی جو سانسوں کی ضمانت ہے۔ وہی روشنی اس کے کانوں کو سماعت اس کے ہونٹوں کو گویائی اور آنکھوں کو بصارت دینے پر غنی ہوئی تھی۔ اس کے وجود کے ریشے ریشے میں درد سانس لے رہا تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں آپس میں یوں پیوست تھیں گویا کبھی نہ کھلنے کی قسم کھالی ہو۔ اس نے لڑکھڑاتے قدموں سے ہوش کی وادی میں قدم رکھا تو سماعت ارد گرد کے ماحول سے کچھ بھنسنے لگا۔ آوازوں سے آشنا ہوئی۔ شاید اس کے ارد گرد کچھ لوگ جمع تھے جو آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ وہ کہاں تھی؟ اور کب سے تھی؟ یہ نہیں جانتی تھی۔ بس ذہن کے ایوانوں میں ایک حوت جاگ رہی تھی کہ اس کی آنکھوں میں تیز روشنی کا جھماکا ہوا تھا اور اس کے وجود کو ایک زوردار درد آمیز جھٹکا لگا تھا۔ پھر اندھیروں کے ساحروں نے اسے اپنے سحر میں جکڑ لیا تھا۔ جانے کون کون سی ظلمتوں کی مسافت طے کی تھی اس نے اور اب روشنیوں کے سفیر جانے کہاں لے کر آئے تھے اسے۔ اس کے ہونٹوں سے درد بھری سسکاری بلند ہوئی اور پھر وہ آہستہ آہستہ کراہنے لگی۔
 ”فہدی دیکھو اسے ہوش آ رہا ہے۔“ ایک نسوانی آواز کہیں بہت دور سے آئی تھی اور اس کی نیم وا آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ اس کے ارد گرد کئی افراد جمع تھے۔ نکھرے نکھرے خوبصورت چہروں والے افراد جن کے چہروں پر اسے ہوش میں آتے دیکھ کر عجیب سا سکون پھیل گیا تھا۔ اس نسوانی آواز کے جواب میں ایک شخص تیزی سے آگے بڑھا تھا۔ شاید ڈاکٹر تھا کیونکہ اس کے ہاتھ میں طبی آلات تھے۔ اس نے اسے کھینچ کر اس کی ہارٹ بیٹ چیک کی۔
 ”اب یہ بالکل ٹھیک ہیں۔“

"خدا یا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔" قدرے فریبی مائل صبح چہرے والی خاتون جو اس کے سر ہانے بیٹھی ہوئی تھیں آسودہ سے انداز میں بولیں۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے ارد گرد کھڑے ہوئے یہ مہربان چہرے کون تھے؟ وہ یہاں کس طرح پہنچی؟

"کیسا محسوس کر رہی ہو جینا؟" تکیے تکیے نقوش والی خاتون چہرے پر محبت سجائے اس سے پوچھ رہی تھیں۔ یکدم اس کی آنکھیں گرم پانیوں سے بھر گئیں۔

"ارے ارے ماما یہ تو رونے لگیں۔" ایک معصوم سی سترہ اٹھارہ سال لڑکی آگے بڑھ کر فرہ اندام خاتون سے مخاطب ہوئی۔

"نہیں جینا روؤ نہیں۔ تمہیں چوٹ لگی ہوئی ہے آرام کرو۔ ہاں یہ بتا دو کہ اس وقت کچھ کھانا پینا پسند کرو گی؟"

"پچھوہینا ان کو دودھ گرم کر کے پلائیں۔" بھاری پر وقار آواز پر اس نے ہلکوں کی چلمن اٹھا کر آواز کی سمت دیکھا۔ وہ اس کے بالکل سامنے ہی تو بیٹھتے تھے۔ ان کی آواز پر وہ بیہ تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ پچھوہینا کی طرح ان کی دونوں بینیاں بھی ہر دھڑکنا اور ہمدرد طبیعت کی مالک تھیں۔ ہیچہ میں تو معصومیت تھی لیکن وہ بیہ کی طبیعت میں ٹھہراؤ و بردباری تھی۔

"جینا اگر تمہاری طبیعت قدرے بہتر ہو تو کیا آتا سکتی ہو کہ تمہارا نام کیا ہے؟ کہا، رہتی ہو؟" پچھوہینا نے نرمی سے کہا لیکن ان کے سوال کے جواب میں جو رد عمل ظاہر ہوا وہاں موجود سبھی افراد بوکھلا گئے۔ وہ جو خاموش آنسو بہا رہی تھی ان سوالوں پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"دیکھئے۔ دیکھئے پلیز خاموش ہو جائیے۔ آپ کی پیشانی پر کافی گہرا زخم ہے۔ اس طرح تو وہ مزید کھل جائے گا اور بلیڈنگ شروع ہو جائے گی۔ پلیز خاموش ہو جائیے۔ تائی امی پلیز انہیں خاموش کروائیں۔" ڈاکٹر فواد اس کی ظاہری حالت کے پیش نظر قدرے پریشان نظر آ رہے تھے۔

"دیکھیں آپنی۔ آپ ہماری بہن ہیں خود کو اکیلا مت سمجھیں۔" ہیچہ آگے بڑھ کر اس کے قریب بیٹھ گئی اور اس کا سر میں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر سہلاتے ہوئے بولی۔ وہ ان نرم رویوں کی کہانی میں الجھی ہوئی تھی۔ اوپر والے نے اس کی زندگی کی ڈور کو یوں الجھا دیا تھا کہ وہ چاہنے کے باوجود سلجھا نہیں پاری تھی۔ تن پتھروں میں وہ محبوس تھی اور ان کا صبر زدہ دھار توڑ کر آئی تھی وہ تو اب بھی اس کے وجود میں گڑے ہوئے تھے۔ وہ کس طرح ان سے پیچھا چھڑا سکتی تھی لیکن اس وقت اس کے ارد گرد پھولوں سے نرم، چاندنی جیسے ٹھنڈے رویے تھے۔ خوشبودار لہجے تھے اور وہ ان لہجوں کو کھوتا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے بمشکل اپنے آپ کو بولنے پر آمادہ کیا۔

"میرا نام آریان ہے۔ مم۔ میرا دنیا میں کوئی نہیں۔" وہ ایک بار پھر رونے لگی تھی۔ "ارے۔۔۔ بس خاموش بھی ہو جاؤ۔ جس کا کوئی نہیں ہوتا اس کا خدا ہوتا ہے۔ تم اپنے آ۔۔۔ محفوظ سمجھو۔ ہم سب کو اپنا سمجھو۔ اکیلی تھی تم اب نہیں ہو سمجھیں۔" تائی مقصوم اپنے از مایہ بھر۔۔۔ سبک میں نہایت اپنائیت سے گویا تھیں۔

"لور وہ بھی آگئی۔۔۔ اٹھو شاہاش ہمت کرو۔۔۔ ایک گلاس دودھ ہے پی لو پھر سونے کی کوشش کرنا۔" پچھوہینا نے اسے سہارا دے کر بٹھایا اور وہ بیہ نے دودھ کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس نے چند ایک گھونٹ لے کر باقی کا دودھ گلاس میں ہی چھوڑ دیا۔ "اوہو بھی۔۔۔ پی بھی لو اب۔" وہ بیہ نے گلاس دوبارہ اس کے ہونٹوں سے لگا دیا تو وہ گھونٹ لے کر اس نے منہ موز لیا۔ "بس دل نہیں چاہ رہا۔"

"چلو پھر سونے کی کوشش کرو۔ فہدی کوئی دوائی کھانے کو بھی دی۔" تائی مقصوم نے ڈاکٹر فواد سے پوچھا۔

"نہیں کچھ خاص ضروری تو نہیں اگر یہ اپنی طبیعت بہتر سمجھیں تو بتا دیں میں کوئی جین کھڑے دیتا ہوں۔" تائی سے بات کرتے کرتے انہوں نے اپنا رخ آریان کی جانب کر دیا۔ "نہیں میں اب ٹھیک ہوں شکریہ۔" وہ کچھ کترائے سے انداز میں بولی۔

"چلو پھر سب اپنے اپنے کمرے میں چلو آرام کرنے دو اسے۔" تائی مقصوم حتی انداز میں کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ تو ان کی تقلید میں وہ بیہ، ہیچہ اور ڈاکٹر فواد بھی کمرے سے نکل گئے۔ البتہ پچھوہینا اسے آرام کرنے کی تلقین کرتی ہوئی خود دوبارہ جائے نماز پر بیٹھ گئی تھیں۔ آریان کی نگاہیں ان کے چہرے کو بار بار گرفت میں لے لیتیں۔ ایسا نورانی اور مقدس چہرہ اتنی مہربان طبیعت۔ کیا دنیا میں نکلی اب بھی قائم ہے۔ کیا یہی وہ لوگ ہیں کہ جن کے باعث آسمان ہمارے سروں پر چھاتا تانا کھڑا ہے اور زمین نے کسی ماں کی طرح اپنا سینہ فراخ کر کے ہمارے قدموں کو جا بخشی ہوئی ہے۔ ہاں ایسے لوگ ہی درحقیقت سراپا رحمت ہوتے ہیں۔ جن کے وجود سے مترشح ہونے والا نور چاند اور سورج کے قائم رہنے کی دلیل ہے۔ اس کے ذہن میں بہت کچھ گنڈہ ہو رہا تھا لیکن آنکھیں ٹکان کے باعث بند ہونے لگی تھیں۔ سو اس نے خود کو خیند کی دیوی کی آغوش کے سپرد کر دیا۔ پچھوہینا جب اپنا ورد مکمل کر کے اٹھیں تو وہ نہایت گہری خیند میں تھی۔ انہوں نے جھک کر اس کی پیشانی پر آئی پریشان لٹوں کو نرم انگلیوں سے پیچھے کیا اور اس پر کھل درست کر کے نائٹ بلب جلا کر اپنے کمرے سے ملحقہ گیسٹ روم میں جا کر لیٹ گئیں۔ اس لڑکی کے وجود سے انھیں مانوس سی خوشبو انہیں بہت کچھ یاد دلانے لگی تھی لیکن یہ سب ان کا وہاں ہی ہو سکتا تھا۔ بھلا ایسا کب ممکن تھا جیسا وہ سوچ رہی تھیں۔ خیند تو ان کی ویسے بھی کم تھی زیادہ تر وقت ذکر و عبادت

میں ہی گزرتا تھا لیکن اس وقت جو خیال سوئی کی طرح ان کے ذہن میں چھب گیا تھا وہ چاہنے کے باوجود اس سے چھپا نہیں چھڑا سکی تھیں۔ موذن کی پہلی آواز کے ساتھ ہی انہوں نے بستر چھوڑ دیا۔ ساری رات بستر پر کروٹیں بدلتے گزرتی تھیں۔ خیند کی ایک جھپکی بھی نہیں آئی تھی۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئیں۔ آریان بہت گہری خیند میں تھی۔ انہوں نے ایک لمحہ کو غمہ کر اس کے پاکیزہ چہرے کے ایک ایک نقش کو بغور دیکھا۔ ہر نقش ان کے خیال پر مہر تصدیق ثبت کر رہا تھا۔ پھر جیسے وہ یکدم حال کی دنیا میں واپس آگئیں اور وضو کر کے فجر کی نماز ادا کرنے میں مشغول ہو گئیں۔



ڈاکٹر نوا کا گھرانا اچھے خاصے افراد پر مشتمل تھا۔ ان کی فیملی سمیت پانچ فیملیاں ایک ہی وسیع و عریض کوٹھی میں سمی ہوئی تھیں۔ سب سے بڑے شفقت تایا اور تائی مقوم اولاد کی نعمت سے محروم ہونے کے باوجود ہر ایک کے لیے اپنے دل میں بے حد پیار رکھتے تھے۔ ان سے چھوٹے عارب تایا اور عینا پھپھو جنہیں کبھی بچوں نے تائی کہہ کر نہیں پکارتا تھا کیونکہ انہیں پھپھو کہلوانا زیادہ پسند تھا۔ ان کی دو بیٹیاں روبیہ اور انیتہ۔ ان سے چھوٹے باہر چچا اور زابدہ چچی۔ اظہر اور حسین۔ سب سے چھوٹے چچا شاکر اور ان کی بیگم حدیقہ تھیں ان کے دو بچے تھے۔ انا اور باصر۔ سب گھر والے الگ الگ پورشنز میں رہتے تھے لیکن کھانا ایک ہی جگہ پکایا اور کھایا جاتا تھا۔ چھوٹی چچی حدیقہ اپنے مزاج اور طبیعت کے باعث فیملی میں چھڑ زیادہ ہر دلعزیز نہیں تھیں نہ ہی انہیں کچھ خاص پرواہ تھی۔ البتہ چچاؤں میں آپس میں گاڑھی چھتی تھی یہی وجہ تھی جو سب مختلف النوع مزاج رکھنے کے باوجود ایک ہی گھر کے مکین تھے۔

اس گھر کو جو کر رکھنے میں دو شخصیات کا ہاتھ زیادہ تھا۔ تائی مقوم اور پھپھو عینا۔ تائی مقوم تو دور پرے کی رشتہ دار تھیں جبکہ پھپھو عینا، تایا عارب کی سگی چچا زاد بھی تھیں۔ سو اس لحاظ سے وہ دینی اہمیت کی حامل تھیں لیکن انہیں تایا عارب نے وہ مقام نہیں دیا تھا جس کی وہ اہل تھیں اگرچہ سسرال میں ان کے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔



مسرت جہاں اسم سسکی تھیں۔ شوخ، چنچل، کھلندری، دوشیزگی کی مکمل تصویر۔ حسن ایسا کہ بہار بھی آئے تو پہل بھر کر رک کر دیکھے اور دل میں حسد لے کر روانہ ہو جائے۔ لمبے لمبے سیاہ گیسو، بادلوں کو شرماتے ہوئے۔ بڑی بڑی سیاہ گھوڑا نکھیں جن میں رات کی ساری سیاہی سمٹ آئی تھی۔ دو دھیارنگت جیسے سورج کی پہلی انمول، ان چھوٹی کرن نے صبح کا ماتھا چومایا۔ پانچ بھائیوں کی لاڈلی بہن۔ بچپن سے ہی اماں بی نے ان کی تربیت پر خاص توجہ دی تھی۔ آٹھل سے ڈھکاسر۔ سینے کی افغانوں پر حیا کا پلہ۔ چال میں نزاکت اور بولنے میں حلیم۔ اماں بی جانتی تھیں کہ نجیب الطرفین سادات گھرا نے کی بیٹیوں میں کیا

خوبیاں ہونی چاہئیں لیکن اس سب کے باوجود انہوں نے کبھی مسرت جہاں پر ضرورت سے زیادہ سختی نہیں کی تھی۔ گھر بھر میں ان کے چنچل قہقہے گونجتے رہتے تھے۔ بھابھیاں ان سے بہت پیار کرتی تھیں۔ بلکہ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ بھابیوں نے انہیں اپنے بچوں کی طرح پالا تھا۔

شبیر حسین بہت بڑے نر اسپورٹر تھے۔ شہر میں ان کی کئی گاڑیاں چلتی تھیں۔ مسرت جہاں ان کی بھی بے حد لاڈلی تھیں۔ شام گئے وہ جب گھر آتے تھے۔ تو مسرت جہاں ان کے گلے میں بازو ڈالے فرمائش کرتے نہ تھکتی تھیں اور انہوں نے کبھی آدمی زبان سے بھی نال نہیں کہا تھا۔ دولت کی ریل ویل ہونے کے باوجود اخلاقی برائیاں اس گھر سے کوسوں دور تھیں۔ شاید اس کی وجہ یہی رہی ہو کہ یہ گھرانہ خالصتاً اسلامی گھرانہ تھا۔ نماز روزے کی پابندی، صدقہ و خیرات کی روایت اس خاندان میں شروع سے چلی آرہی تھی۔ شبیر حسین ماہ رمضان میں کتنے ہی غریب گھرانوں کو پورے پورے مہینے کا راشن ڈلو کر دیتے۔ ان کی گاڑیوں پر کئی ایسے بچے کام کرتے تھے جن کے آگے پیچھے کوئی نہ تھا لیکن انہوں نے کبھی ان کا حق مارنے کی کوشش نہیں کی۔ اچھا کھلایا۔ اچھا پہنایا۔ وقت پر مزدوری دی۔ یہی وجہ تھی کہ خدا نے انہیں سعادت مند اولاد دی تھی۔ وہ اپنے بچوں سے پیار بھی بہت کرتے تھے۔ لیکن جہاں اصول کی بات آتی تھی وہاں ان کا رویہ اور برتاؤ بے پلک ہو جاتا تھا۔ اماں بی ان کی مزاج آشنا تھیں۔ عاجز اور منسکراہت انج ہونے کے باعث ان دونوں کی بہت اچھی بھہ رہی تھی۔ بلکہ شبیر حسین اپنی بیوی کا بہت احترام کرتے تھے۔ ان دنوں ساون کی آمد آ رہی تھی۔ گھٹا گھٹا آسمان کو اپنی سرمئی آغوش میں سمیٹتی ادھر سے ادھر چکراتی رہتی تھیں لیکن ابھی ساون کی پہلی بارش نہیں ہوئی تھی۔ مسرت جہاں نے ہار سنگھار کے درخت کے ساتھ جھولا باندھ لیا۔ ساری ساری شام ان کی جھولا جھولنے میں گزر جاتی۔ اماں بی بھی اپنی چار پائی درختوں کے نیچے لاجھاتیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی نم آلود ہوائے گرمی کا زور توڑ دیا تھا۔ جلتے جھلتے درود یوار کو بھی ٹھنڈک میسر آگئی۔ مسرت جہاں شام کے وقت وسیع دالان میں پانی کا چھڑکاؤ کر دیتی تھیں۔ پھر تو گویا زمین کی سوندھی سوندھی خوشبو ایک خمار کی طرح فضا پر طاری ہو جاتی تھی۔ یوں جیسے زمین اپنے بار آور ہونے کے خواب دیکھنے لگتی۔ اس کی تادید و آنکھوں میں بہار کے سپنے ہلکورے لینے لگتے۔ آسمان کی روشنیاں اس کی گود بھرنے کو بے چین اور وہ بارش کی بوندوں کو ماں کی طرح آغوش میں لینے کو بے تاب۔

اس دن مسرت جہاں جھولا جھولنے کے لیے ہار سنگھار کے درخت کی پٹا ہوں میں جانے لگیں تو یکدم فلک رعبہ کو ان پر ٹوٹ کر پیار آیا۔ اس کی آنکھوں میں بے بہتہ خوشی کے ٹھنڈے آنسوؤں نے بڑھ کر مسرت جہاں کے صبح رخساروں کی بلائیں لیں۔ انہوں نے نہمت سے سر اٹھایا۔ گھوڑ گھٹائیں بڑے مدد بھرے انداز میں انہیں تک رہی تھیں۔ یوں لگا وہ برآمدے تک نہ پہنچ پائیں گی اور باؤل ان کا راستہ روک

لیں گے۔ انہوں نے بھاگ کر درخت کے نیچے سے چار پائی اٹھائی اور تیز تیز قدموں سے چلتی برآمدے تک پہنچیں۔ چار پائی بچھا کر انہوں نے کچن میں جھانکا۔ بڑی بھابی رات کے کھانے کے لیے سالن بنانے میں مصروف تھیں۔ ہینا بھابی برتن دھو رہی تھیں۔

”بھابو! بادل آگئے۔“ جملہ کسی چپکار کی صورت ان کے حلق سے نکلا تھا۔ دونوں نے پلٹ کر دیکھا۔

”پگلی.....“ بڑی بھابی مسکرا کر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔

”ارے یہ کوئی چھوٹی موٹی خبر ہے کیا..... باہر نکل کر تو دیکھیں۔ کیا منظر ہے۔ اف..... جی چاہتا ہے کسی پرندے کی طرح اڑ کر بادلوں تک جاؤں انہیں چھو کر آؤں اور پھر آ کر آپ کو بتاؤں کہ بادل کیسے ہوتے ہیں۔“ وہ آنکھیں میچے خود ہی اپنے کپے لفظوں سے محفوظ ہو رہی تھیں۔

”ارے پاگل لڑکی! بادل صرف دھواں ہوتے ہیں اور کچھ نہیں۔ ان کا سارا لطف اس پانی میں ہے جو ان سے برستا ہے۔ بادل تو بس یہاں سے دیکھنے میں ہی اچھے لگتے ہیں۔“ ہینا بھابی ان کی باتوں پر مسکراتے ہوئے گویا انہیں سمجھا رہی تھیں۔

”جانتی ہوں! لیکن حسن کو محسوس کرنے میں بھلا ہرج بھی کیا ہے۔“ انہوں نے مصنوعی ناراضگی سے ہینا بھابی کی طرف دیکھا۔

”ہرج ہے! کیوں نہیں ہے؟ حسن اگر موجود ہو تو اسے محسوس کیا جاسکتا ہے۔ سراب تک پہنچنے کا خواب ہمیشہ تعبیر کو روکتا ہے۔ پگلی! تم ابھی بچی ہو۔ زمانے کے سرد گرم سے نا آشنا۔ تم کیا جانو جو چیزیں دور سے دیکھنے میں بھلی لگتی ہیں جب ہاتھوں میں آ جاتی ہیں تو ان کا اصل کتنا بے رنگ، کتنا پھیکا ہوتا ہے۔“ ہینا بھابی کے لہجے میں ہلکا سا ملال گھل گیا۔ بھابی مقصوم نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا ان کی نگاہوں میں ہینا بھابی کے لیے محبت اور شاید سمجھوتے کا پیغام تھا اور یہ پیغام تو وہ پچھلے دو سال سے سمجھ رہی تھیں۔ وہ یہاں سمجھوتہ ہی تو کر رہی تھیں۔ ان کے والد بلال حسین کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد ان کے تایا شبیر حسین نے انہیں اپنے بڑے سے چھوٹے بیٹے عارب کے لیے مانگ لیا تھا۔ سب جانتے تھے کہ عارب بھائیوں میں مزا جاتا سب سے اچھا ہے لیکن اس کی ایک دو عادات ایسی تھیں جن کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کیا جاسکتا تھا لیکن ہینا بھابی پچھلے دو سال سے نباہ کر رہی تھیں اور حقیقت حال کا سوائے بھابی مقصوم کے کسی کو علم نہیں تھا۔ اس وقت بھی بھابی ہینا نے فوراً اپنے محسوسات کو کنٹرول کیا اور موضوع بدل دیا۔

”مسرتی! بارش تو برسے بھی لگ گئی۔“ کچن کی کھڑکی سے باہر کا سماں چند ہی لمحوں میں جل تھل

ہو گیا تھا۔

”بھابی ماں! ایسے موسم میں بھلا کیا کیا جاتا ہے؟“ ان کے لہجے پر فرمائش کا عنصر غالب تھا۔ بھابی مقصوم نے مصنوعی انداز میں انہیں گھورا۔

”چنوری کہیں کی! تم چل کر اماں بی کے پاس بیٹھو میں ابھی پکوزے بنا کر لاتی ہوں۔“ اور مسرت جہاں تو جیسے من کی مراد بن گئے پوری ہو جانے پر نہال ہی ہو گئیں۔ چچا جوں چچان برستائیند۔ درختوں کے مکھڑھو کو زمین کو سیراب کر رہا تھا۔ پرندے کچھ دیر لطف اٹھانے کے بعد اب شاید اپنے گھونسلوں میں دبک گئے تھے کہ آسمان پر سوائے ٹھنڈاؤں کے اور کچھ نہ تھا۔ ہاں دھرتی کے رنگ ٹھنڈے کر اپنی نیرنگیاں بکھیرنے لگے تھے۔

”اماں بی! بارش میں نہانے کو جی چاہ رہا ہے۔“ مسرت جہاں اٹھا کر بولیں۔

”بیٹا! ساون کی پہلی بارش ہے آسمان کی میل اتارنے کو ہوتی ہے۔ اگلی بار خوب دل بھر کے نہانا۔ یہ بارش تو سو بیکاریاں لاتی ہے۔“ اماں بی کے سمجھانے پر وہ مان گئیں۔

”اماں بی! کیا آسمان ہی میلا ہوتا ہے۔“

”ہاں! کیا بارش سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ کیسا تھا اور اب دیکھو کیا ہے؟“ اماں بی کے کہنے پر انہوں نے غور سے دیکھا تو قائل ہو گئیں۔

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں اماں بی! اب آسمان صاف لگ رہا ہے۔“

”اماں بی! رات کے کھانے میں بیٹھا کیا بتایا جائے؟“ بھابی مقصوم اماں بی کے قریب آ کر بیٹھ گئیں۔

”ارے بیٹا! جودل چاہے بناو۔ میرے شاکر اور اظہر تو کھیر پسند کرتے ہیں۔ باقی سب سے بھی پوچھاؤ۔“

”اماں بی! کھیر ہی ٹھیک ہے کبھی شوق سے کھا لیں گے۔“ ہینا بھابی ہاتھ میں پکوزوں کی پلیٹ تھامے آگئی تھیں۔

”پھلو! پھر تیاری کرتے ہیں۔“ بڑی بھابی اٹھ گئیں۔ اماں بی بھی مغرب کی نماز پڑھنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں لیکن مسرت جہاں وہیں کرسی پر بیٹھی بارش سے لطف اندوز ہوتی رہیں۔ چنانچہ کیا بات تھی۔ بارش انہیں یونہی لگتی تھی جیسے آسمان کوئی غنی تھا جو بنا مانگے اپنے دامن کے موتی لٹاتا پھرتا تھا۔ وہ برآمدے کے ستون سے لگ کر کھڑی ہو گئیں اور ہاتھ کا دامن پھیلا کر وہ موتی سینے کی کوشش کرنے لگیں۔ اسی پل ہلک لینڈ کروزر گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ پورچ میں آ کر رتی اور اس میں سے شبنم حسین اپنے شاہانہ طعراق کے ساتھ باہر نکلے۔

”بیٹا رانی! آپ یہاں بارش میں کیا کر رہی ہیں۔“ یہ ان کا مخصوص انداز تھا۔

”وہ اہا میاں! موسم بہت اچھا تھا اس لیے یہاں کھڑے ہو کر بارش دیکھنے کو دل چاہا۔“

انہوں نے جواب دیا تو وہ سر ہلا کر آگے بڑھ گئے۔ سرت جہاں بھی پھر وہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہریں۔ اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ شاید وہ موسم کی ٹھنڈک اپنے وجود میں اتار چکی تھیں۔



اس کی آنکھ کسی کھٹکے سے کھلی تھی۔ چند ٹانگوں کو تو اسے احساس ہی نہ ہوا کہ وہ کہاں ہے۔ اجنبی اور نامانوس جگہ۔ وسیع و عریض بینڈ پر کبل اوڑھے اس کا وجود ایک پل کو اسے خود بھی بیگانہ سا لگا۔ ماحول میں کچھ ہلچل تھی۔ کوئی چہل پہل تھی۔ چند نسوانی آوازیں تھیں۔ جو غالباً ساتھ والے کمرے سے آرہی تھیں کیونکہ جس کمرے میں وہ تھی۔ اس کے علاوہ وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔

”اما۔ آپ روٹی کو سمجھالیں اس نے پھر میرا چین نکال لیا۔“ ایک آواز آئی قدرے بھنبھلاتی ہوئی۔ ”اوہو بیٹا! اس میں لڑنے والی تو کوئی بات نہیں۔ الماری میں دیکھو۔ شاید کوئی چین رکھا ہو۔“

بہت بڑی بات سے جواب دیا گیا۔

”اما جھگڑنے کی بات نہیں۔ بات اصول کی ہے۔ جب وہ خود اپنی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی تو میری چیزیں کیوں اصرار دھرتی ہے۔“ وہ آواز ہنوز غصے کا اظہار بنی ہوئی تھی۔

”نہیک ہے! اب بند کرو صبح صبح اس طرح لڑنا۔ سمجھا دوں گی اسے میں۔ تم آکر ناشتہ کر لو کالچ سے دیر ہو جائے گی۔“ جواب میں قدرے خاموشی چھا گئی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ماں کی بات مان لی گئی تھی۔ وہ خاموشی سے لیٹی ہوئی تھی۔ ابھی تک اس گھر کے مکینوں میں سے کوئی بھی اس کے سامنے نہیں آیا تھا۔ کافی دیر زرخیز۔ یوں لگتا تھا جیسے اس گھر کے لوگ اسے کسی بے جان شے کی طرح اس کمرے میں رکھ کر بھول گئے تھے۔ کس قسم کے لوگ تھے؟ وہ نہیک طرح جان نہیں پاتی تھی۔ اتنا اسے یاد تھا کہ ان سب کے رویوں میں اس کے لیے سختی اور اجنبیت نہیں تھی۔ ملائمت اور اپنائیت تھی اور یہی احساس اس کے اندر سکون، وقتی سکون بن کر اترتا تھا۔ اور طویل مسافت کے بعد جس نے اس کے جسم سے زیادہ اس کی روح کو تھکا یا تھا۔ اسے نیند آگئی تھی۔ کل کیا ہونا تھا؟ کل کیا ہو سکتا تھا؟ سب کچھ وقتی طور پر بھلا کر وہ مطمئن سی ہو گئی تھی۔

”ارے! تم کب سے جاگ رہی ہو؟“ فرہی مائل خوبصورت سی خاتون اس کے قریب آئیں۔ شاید یہ انہی کا کمرہ تھا جہاں وہ براجمان تھی۔

”میں۔ میں تو کافی دیر سے جاگ رہی ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

”اوہو سوری بیٹا۔ دراصل صبح صبح میری بینیاں گھر کو میدان کا دروازہ بنائے ہوئے ہوتی ہیں۔ سب کچھ بھول جاتا ہے کیا کرتا ہے۔ کیا نہیں کرتا۔ ایک منٹ باتیں بعد میں مجھے یقین ہے تمہیں بھوک لگ رہی ہوگی۔ وہ سامنے واش روم ہے تم فریش ہو جاؤ میں اتنی دیر میں ناشتہ لے آتی ہوں۔“ وہ کمرے سے

باہر نکل گئیں۔ آریان کبل ایک طرف پھینک کر اٹھ گئی۔ ہاتھ روم کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو مکینوں کی امارت اور خوش ذوقی سے مرعوب سی ہو گئی۔ ہلکے سرمئی رنگ کی ٹائیکز کے ساتھ ہاتھ روم فٹنگ۔ واش بین۔ چیمبر کموٹ۔ ہاتھ ملب ہر چیز ہلکے سرمئی رنگ کی تھی۔ اس نے واش بین کے ساتھ لگے بڑے سے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ گلابی رنگت صرف ایک دن اور رات میں ہی مرجھا کر سرسوں کے پھول سی ہو گئی تھی۔ سیاہ بالوں کی اٹھ بھی ہوئی تھیں چہرے کے گرد بے ترتیبی سے جھول رہی تھیں۔ پیشانی پر دائیں طرف بھنڈوں سے تھوڑا اوپر زخم کی جینڈا تھی۔ اس نے ہلکے ہلکے دو چار مچھکے سے مارے بال سمیٹ کر یونی جوڑا سا باندھ لیا اور تولیے سے منہ خشک کرتی ہاتھ روم سے باہر آ گئی۔ سامنے ہی وہ خاتون ناشتے کی ٹرے بیڈ پر سجائے اسے محو انتظار ملیں۔

”آؤ! بیٹھو اور تکلف برطرف رکھ کر ناشتہ کرو۔ فہدی ابھی تھوڑی دیر میں آئے گا تمہیں چیک کرنے کے لیے۔ ویسے وہ رات بھی کہہ رہا تھا کہ کوئی ایسی میجر انجری نہیں ہے۔ جلدی امپروو کر لو گی تم۔“ وہ بولتے بولتے یکدم رک گئیں پھر کچھ سوچ کر دو بارہ گویا ہوئیں۔

”میرا خیال ہے کہ جب سے تم جاگی ہو اس وقت سے مسلسل میں ہی بولے جا رہی ہوں تم نے کیا نہ بولنے کی قسم کھا رکھی ہے؟“ وہ اب مسکرا رہی تھیں۔

”آئی! میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں۔ کیا کہوں۔ یوں بھی آپ بولتی زیادہ اچھی لگتی ہیں۔“ اس نے ان کی جانب مسکرا کر دیکھا تھا۔ جانے کیوں ان کی موجودگی اور ان کی باتوں کی وجہ سے وہ خود کو کسی حد تک ہلکا محسوس کر رہی تھی۔

”ہوں! تو باتیں کرنے کا گڑ جانتی ہو۔ ویسے میری رو بہ تہبہاری طرح ہے۔ خاموش خاموش۔ سبھی ہلکے کبھی کبھی کچھ ابھی ابھی لیکن اس سے چھوٹی ایڈ تو ایسی ہے جیسے کسی باتیں کرنے والے کھلونے کو چابی دے کر چھوڑ دیا جائے۔“ وہ بہت محبت بھرے انداز میں کہہ رہی تھیں۔ آریان کی پلکوں پر نمی سی دم توڑ گئی۔

”اماں! تم۔ تم بھی تو یونی پیار کرتی تھیں مجھ سے۔ چھوٹے چھوٹے نوالے بنا کر کھلانے سے لے کر تعلیم کے میدان تک میرے ہمقدم رہیں۔ پھر پھر آخر۔ اب کیوں دوریاں حائل ہو گئیں ہمارے درمیان۔ کیوں تمہاری محبت بھری آنکھیں مجھے نظر نہیں آتیں۔ تمہاری ممتا بھری آغوش کیوں دور ہو گئی مجھ سے۔“ نوالہ جیسے اس کے حلق میں اٹک گیا تھا۔ بالکل ایسے کہ اسے لگا کہ بس اس کی آخری سانسیں ہیں۔ شینا پھپھو کی نظریں اس کے چہرے پر پڑیں۔

”ارے۔۔۔ ارے تمہیں کیا ہوا۔“ تیزی سے سرخ پڑتی رنگت اور آنکھوں سے بہتے پانی نے انہیں بوکھلا دیا۔ ان کی سمجھ میں اور تو کچھ نہ آیا گا اس پانی کا بھر کر اس کے منہ سے لگا دیا۔ ایک دو گھونٹ پی

کر اس نے آنسوؤں کے گولے کو حلق سے نیچے کیا لیکن چہرے کے تاثرات بدستور ویسے ہی تھے۔
 ”دیکھو بیٹا! تمہیں جو پریشانی ہے ہم سے کہو یقین کرو ہم تمہاری پوری مدد کریں گے لیکن تم تنہا اس طرح پریشان ہوتی رہو گی تو بھلا کیا حاصل۔“
 ”ہیٹنا پھپھو جیسے اسے حوصلہ دیتے ہوئے بولیں۔
 لیکن اس کی کہانی ایسی ہی تھی جو اس کے دریدہ دل میں ہی پنہاں رہتی تو اچھا تھا۔ وہ ذہن رکھتی تھی۔ اس لیے تنکے کا آسرا چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کا دماغ مسلسل ادھیڑ بن میں لگا ہوا تھا۔ ظاہر تھا کہ وہ یہاں مستقل طور پر رہنے نہیں آئی تھی۔ اسے سوچنا تھا کہ آگے کیا قدم اٹھایا جائے کہ وہ حادثہ زمانہ سے محفوظ ہو جائے۔ فی الحال تو یہی پناہ ہی اس کے لیے غنیمت تھی۔

”نہیں آنٹی کوئی پریشانی نہیں۔“ وہ جبراً مسکرائی۔ ”دراصل آپ کی باتیں سن کر مجھے اپنی ای کی یاد آتی تھی۔“

اس کی بات پر انہیں یقین نہیں آیا تھا۔ وہ مہربان آنکھوں والی عورت ساری رمزیں جانتی تھی۔ ضرور اس لڑکی کے بیک گراؤ میں کوئی ایسی بات تھی جو یہ اپنے بارے میں بات کرتے ہوئے ہنسی چکا چاری تھی لیکن وہ اصرار کر کے اس کے زخموں کو کربید نہ نہیں چاہتی تھیں۔

”کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟“ انہوں نے آواز کی سمت دیکھا ڈاکٹر فواد اپنی سحر انگیز شخصیت کے ساتھ دروازے میں موجود تھے۔

”ارے فہدی! میرے کمرے میں آنے کے لیے تمہیں اجازت کی ضرورت کب سے پڑنے لگی۔“
 ”پھپھو! اب یہ صرف آپ کا کمرہ نہیں ہے ناں!“ انہوں نے آنکھوں سے آریاں کی طرف دیکھتے ہوئے قدرے شرارت آمیز انداز میں کہا۔

”دیکھو بھئی! میرے کمرے میں کوئی اجنبی نہیں ہے۔ آریاں بھی روبیہ، ایتھ کی قیسری، بہن ہے سمجھے۔“ انہوں نے محبت سے کہا۔ آریاں کا سر جھکا ہوا تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ اس پل شین پھپھو کے چہرے پر جو خوبصورت تاثر سمنا ہوگا۔ وہ دیکھ کر ماں کی ہوک کم ہو جائے گی۔

”ذرا اپنی نبض چیک کرو ایسے۔“ جھکے ہوئے سر کے سامنے بھاری مردانہ ہاتھ نظر آیا۔ اس نے خاموشی سے دایاں ہاتھ آگے کر دیا۔ ان کی انگلیاں اس کی کلائی پر متحرک ہوئیں تو ایک لمبے کو وہ حیا آمیز جھجک کا شکار ہو گئی۔ ان کی نظریں گھڑی کی سوئیوں پر تھیں۔

”شی از پر فیکلی آل رائٹ پھپھو!“ وہ ہیٹنا پھپھو سے مخاطب تھے۔

”فہدی! ذرا اس کا زخم بھی دیکھ لو۔“ پھپھو کے کہنے پر انہوں نے آگے بڑھ کر بینڈیج کھول دی۔ خون میں تر روئی کو نہایت احتیاط اور نرمی سے زخم سے الگ کیا۔ چوستانی پر ایک انچ لمبا اور تقریباً دو سینٹی میٹر گہرا زخم کا نشان تھا۔ خون رسنا بند ہو چکا تھا۔ انہوں نے نیوب نکال کر زخم پر دوا لگائی۔

”پتی کی اب ضرورت نہیں ہے۔ یہ نیوب رکھ لیں۔ دن میں تین چار بار لگائیں گی تو ایک آدھ دن میں کافی بہتر ہو جائے گا۔ اچھا پھپھو میں کھینک چلوں۔ دیر ہو رہی ہے۔“ وہ پہلے آریاں سے پھر پھپھو سے بات کر کے باہر نکل گئے۔ آریاں اس سارے عرصے میں خاموش رہی تھی۔ پھپھو ہیٹنا بھی اسے لینے کی تلقین کرتی ہوئی برتن اٹھا کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔ کمرے میں اب وہ تھی یا پھر بگلوں کی طرح چکر اٹاتا ہوا اس کا ماضی، عفریت کی طرح منہ کھولے سامنے کھڑا حال اور بے اماں مستقبل۔



آج ”سادات نگر“ میں جیسے رنگ ہی رنگ اترے ہوئے تھے۔ مسرت جہاں نے فرسٹ کلاس پوزیشن لی تھی میٹرک میں۔ اماں بی کے تو فخر کے مارے جیڑی زمین پر نہ ٹک رہے تھے۔ ان کی آنکھیں جھک رہی تھیں اپنی ہونہار بیٹی کی کامیابی پر۔ بھائی الگ بے حد خوش تھے۔ سوئے اتفاق سب ہی گھر پر موجود تھے۔ شام کی چائے کے انتظار میں سب درختوں کے نیچے کرسیاں بچھائے بیٹھے تھے۔ جب کرمو نے کوئی رجسٹری لا کر مسرت جہاں کے ہاتھ میں تھمائی۔

”چھوٹی بی بی! باہر ڈاکے نے یہ کاغذ دیا ہے اس پر دستخط کر دیں۔“ مسرت جہاں نے دستخط کر کے وہ کاغذ اسے تھمایا اور ابھی کاغذ کھولنے ہی لگی تھیں کہ شا کر نے اچک لیا۔ لفاظی قبول کر مارکس شیٹ پر نظر دوڑائی۔
 ”جیج... جیج... پانچ بھائیوں کی لاڈلی بہن، اور اس بری طرح فعل... افسوس صد افسوس۔“

ہماری تو ناک کنوا دی تم نے۔“ سنجیدہ صورت لیے وہ مسرت جہاں سے ہمکلام تھا۔

”کیا مطلب...؟“ اس نے اچھے پیچے ہوئے تھے میرے۔ مجھے دکھائیں مارکس شیٹ۔“ وہ رو ہانسی ہو کر بولیں اچک اچک کر خود سے دو فٹ لمبے شا کر حسین سے مارکس شیٹ چھیننے کی کوشش کرنے لگیں۔

”ارے کیوں ہماری بیٹا رانی کو ستاتے ہو۔“ بتا دو کیا نتیجہ نکلا؟“ ابامیاں کی مداخلت نے شا کر حسین کو مزید شرارت سے باز رکھا اور انہوں نے مصنوعی روئی صورت بنا کر مسرت جہاں کے ہاتھ میں دے دی۔ مارکس شیٹ پر نگاہ ڈالنے کے بعد پہلے تو مسرت جہاں کی آنکھیں مسرت سے پھیلیں یوں کہ ریج کر کانوں سے جا لگیں۔ پھر ایک فلک شکاف جیج ان کے شگرتی ہونٹوں سے بلند ہوئی۔ کاغذ ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا اور پھر جو انہوں نے چبکوں چبکوں روٹا شروع کیا تو مانو اماں بی اور بھائیوں کے تو ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے۔

”ارے بچی! رہنے دو کوئی بات نہیں۔ پھر امتحان دے دینا یوں رونے سے بھلا اب کیا حاصل!“ اماں بی اس کا سر سینے سے لگائے تسلی آمیز انداز میں کہہ رہی تھیں۔

”ارے اماں بی! کیوں دل چھوٹا کرتی ہیں۔ ہم نے تو پہلے ہی عرض کی تھی کہ ان کموں میں تیل نہیں۔ آپ ہی کو شوق چڑایا تھا۔“ اظہر بھائی نے چھیڑا تو مسرت جہاں نے شاکی نظروں سے ان کی

طرف دیکھا اور تنگ کر بولیں۔

”یہ آنسو غم کے نہیں خوشی کے ہیں۔ دشمن جلتے رہیں۔ اماں بی ہم پاس ہو گئے ہیں ساڑھے آٹھ سو میں سے ساڑھے چھ سو نمبر لیے ہیں۔“ وہ اظہر بھائی کو زبان دکھا کر چڑا رہی تھی۔ اماں بی تو خوشی سے نہال ہو گئیں۔ جھٹ سے بڑھ کر ان کی پیشانی چوم لی۔ ابامیاں نے اسی وقت جیب سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر ان کے ہاتھ پر دھرا۔ شفقت بھائی اور عارب بھائی دونوں زمینوں پر گئے ہوئے تھے۔ باہر بھائی نے کہا کہ جوان کی لاڈلی بہن فرمائش کرے گی وہ پوری کریں گے۔

”تو ٹھیک ہے باہر بھائی! مجھے کانچ میں ایڈیشن دلا دیں۔“ مسرت جہاں دلار سے بولیں تو باہر بھائی ایک لکھ خاموش ہو کر ابامیاں کی صورت دیکھنے لگے۔ جن کے چہرے پر مسرت جہاں کی فرمائش سن کر سنجیدگی سی طاری ہو گئی تھی۔ گھر بھر میں میٹرک سے آگے صرف اظہر بھائی اور شاہجی گئے تھے۔ اب مسرت جہاں بھی اس میدان کارزار میں اترتا چاہتی تھیں۔ اماں بی بھی کچھ خاموش نگاہوں سے مسرت جہاں کو دیکھنے لگیں۔

”کیا ہوا؟“ ابامیاں کیا میں نے کچھ غلط کہہ دیا۔ ابامیاں! اتنے اچھے مارکس آئے ہیں میرے، کسی بھی اچھے کانچ میں آسانی سے ایڈیشن مل جائے گا۔“

”بات یہ نہیں ہے بیٹا جی! ہم جانتے ہیں کہ آپ کا ذہن بہت اچھا ہے۔ تعلیمی ریکارڈ بھی قابل تعریف ہے لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ہم آپ کو آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔“ ابامیاں کے حتمی انداز نے ہل بھر کو ماحول پر سکوت طاری کر دیا۔ مسرت جہاں کو تو جیسے سانپ سو گھ گیا۔ شاید انہیں توقع نہیں تھی کہ ابامیاں یہ فیصلہ صادر کریں گے۔

”لیکن کیوں ابامیاں؟“ بہت دھیمی آواز میں انہوں نے کمزور سا احتجاج کیا۔

”اس لیے کہ بیٹیاں گھر کی چار دیواری کے اندر اچھی لگتی ہیں۔“ ابامیاں یہ کہہ کر انھ گئے تھے اور اپنے ساتھ ساتھ خوشیوں کے سارے رنگ بھی سمیٹ کر لے گئے تھے۔ آہستہ آہستہ کرسیاں خالی ہونے لگیں۔ مقسوم بھابی اور حینا بھابی انھ کرکین کی طرف چل دیں۔ اظہر بھائی کسی دوست سے ملنے نکل کھڑے ہوئے اور شاہجی اپنے کمرے کو چل دیا۔ اب وہاں صرف اماں بی تھیں یا پھر باہر بھائی۔ مسرت جہاں نے عجیب سے انداز میں ان دونوں کی طرف دیکھا۔

”اماں بی۔ ابامیاں کیا سمجھتے ہیں مجھے۔ کیا ان کا یہ خیال ہے کہ پڑھ لکھ کر میں اس خاندان کی ذلت کا باعث بنوں گی۔ اماں بی۔ کیا میں نہیں جانتی کہ کن حدود کا تعین کیا گیا ہے ہمارے خاندان میں لڑکیوں کے لیے۔“ وہ بولتی ہوئی ان کے قریب نیچے بیٹھ گئیں ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

”اماں۔ مجھے اجازت لے دیجئے۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ ابامیاں کو پار نہیں کروں گی جو

میرے لیے مقرر کی جائیں گی۔ پلیز اماں بی۔ ابامیاں کو منالیں۔“ ان کے لہجے اور آنکھوں میں التجا تھی۔

”بیٹا! تم اچھی طرح جانتی ہو، تمہارے ابامیاں ایک بار جو فیصلہ کر لیں کبھی اس سے ہٹتے نہیں ہیں۔۔۔۔۔ انہوں نے کچھ سوچ کر ہی ایسا کہا ہوگا۔ ورنہ وہ تمہارا دل کبھی نہیں دکھا سکتے۔“ انہوں نے مسرت جہاں کو سمجھانا چاہا۔

”اماں بی۔۔۔۔۔ صرف ایک بار کوشش کر کے دیکھیں۔ ممکن ہے آپ کی بات مان جائیں وہ۔“ مسرت جہاں نے ہمت نہیں ہاری تھی۔

”ٹھیک ہے۔ ایک بار بات کر کے دیکھ لیتے ہیں۔“ باہر بھائی بھی مسرت جہاں کے ہموار بن گئے۔ اماں بی خاموشی سے دونوں کی طرف دیکھ رہی تھیں لیکن ان کا ذہن کبہ رہا تھا کہ لفظ رائیگاں جائیں گے۔ وہ ان کے شریک حیات تھے۔ زندگی کی تیس، تینتیس بہاریں ان کے سنگ دیکھی تھیں انہوں نے۔ ان سے زیادہ بہتر بھلا کون جان سکتا تھا کہ شبیر حسین جس قدر نرم دل رکھتے تھے اندر سے چٹان کی طرح سخت اور مضبوط تھے۔ ان کے فیصلے شروع سے ہی مقدم جانے جاتے تھے۔ کسی میں جرأت نہیں تھی کہ کوئی فیصلے میں ترمیم کی خواہش کرتا یا ان کی ماننے میں کوئی عذر رنگ گھڑتا۔ خود اماں بی نے بھی ان کے جلال کو آواز دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ جو کچھ انہوں نے کہا فوراً تسلیم کر لیا۔ شاید اسی لیے ان کی اچھی نبھی تھی لیکن اب مسرت جہاں کی فرمائش سن کر وہ محضے میں پڑ گئی تھیں۔ اتنا تو وہ جان گئی تھیں کہ جو فیصلہ انہوں نے کر لیا ہے وہ بدلے گا نہیں۔ لیکن بیٹی کا دل رکھنے کی خاطر انہوں نے ابامیاں سے بات کرنے کی ٹھان لی۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد جب سب اپنے اپنے کمروں کو سدھار گئے اور ابامیاں حسب معمول کچھ دیر کے لیے اسٹڈی روم میں جا بیٹھیں تو اماں بی بھی ان کے پیچھے اسٹڈی روم میں چلی آئیں۔

”کیا بات ہے زہرہ خاتون۔۔۔۔۔ آپ کچھ پریشان ہیں۔“ ابامیاں نے خاموش بیٹھی اماں بی سے پوچھا۔ ان کے اس طرح آکر بیٹھ جانے اور بات نہ کرنے سے ابامیاں یہ تو سمجھ گئے تھے کہ انہوں نے کوئی بہت اہم بات کرنی ہے لیکن ان کی ناراضگی یا غلطی کے ذرے کہہ نہیں رہیں۔

”آپ کچھ کہنا چاہتی ہیں؟“ انہوں نے جیسے حوصلہ آمیز انداز اپنایا۔

”شاہجی! ساری زندگی آپ نے جو کہا۔۔۔۔۔ میں نے تسلیم کیا۔ کبھی آپ کی کسی بات کسی حکم سے سرتابی کی جرأت نہیں کی۔“

”تو آپ کو تجدید کی ضرورت کیوں پیش آگئی۔“ ابامیاں نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا۔

”اس لیے کہ آج پہلی بار آپ سے کچھ مانگنے آئی ہوں۔ سوچتی ہوں ایسا نہ ہو کہ دست سوال دراز کرنے کے بعد خالی لوٹ آنے کا بچھتاوا مل جائے۔“

”کیا مطلب؟“ کیا آپ ہم سے کوئی ایسی چیز مانگنا چاہتی ہیں جس کی قدرت ہم نہیں

رکھتے۔" ابا میاں سیدھے ہو بیٹھے تھے۔ کتاب جو ان کے ہاتھ میں تھی انہوں نے بند کر کے سامنے نہیں پر رکھ دی اور پوری طرح اماں بی کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"نہیں قدرت تو رکھتے ہیں..... لیکن شاید وہ چیز آپ دینا نہ چاہیں۔" اماں بی کا انداز انہیں الجھائے جا رہا تھا۔

"زہرہ خاتون! یہ آج آپ کس انداز میں بات کر رہی ہیں۔ جو بھی کہنا ہے کہہ دیجئے۔ یقین جانے اگر اس چیز پر ہمارا اختیار ہوا۔ آپ کی فرمائش پوری کرنے کی جرأت ہم میں ہوئی تو بخدا انکار نہیں کریں گے۔"

"میں آپ سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ مسرت جہاں زمانے کی اونچ نیچ، اپنا اچھا، برا سمجھتی ہے۔ عزت، مذلت کا خیال رکھ سکتی ہے۔ اس کی آرزو ہے کہ اسے آگے بڑھنے دیا جائے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ اس میں ایسی قیامت بھی نہیں۔ آخر لوگوں کی بینیاں سکولوں کالجوں میں پڑھ رہی ہیں۔"

"ان لوگوں میں اور ہم میں بہت فرق ہے زہرہ خاتون! ہم آل نئی اولاد ملی ہیں۔ جن کی مستورات نے سورج سے بھی پردہ کیا تھا۔ ہم کس طرح مسرت جہاں کو کھلے منہ کاٹ آئے جانے کی اجازت دیں۔ ہم ان کی اس بے پردگی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے پڑھنا ہے تو ہم انہیں کتابیں منگوادیں گے۔ گھر بیٹھ کر پڑھیں اور بیچہ دے دیں۔"

"شاہو جی! کانٹ میں جا کر پڑھنے اور خود تیاری میں بہت فرق ہے۔ پھر وہ جو مضامین لینا چاہتی ہے وہ ایسے صریح نہیں پڑھ سکتے۔"

"زہرہ خاتون! زندگی کے اتنے سال گزار کر بھی آپ سمجھ نہیں پائیں کہ ہمارا مزاج کیا ہے؟ ہم کیا چاہتے ہیں۔ افسوس صد افسوس ہم اور اب کیا کہہ سکتے ہیں جب زندگی کا ساتھی ہی سمجھ نہ پائے۔" انہوں نے میز پر سے کتاب اٹھائی تھی۔ یہ گویا اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ اب اس موضوع پر مزید گفتگو نہیں کرتا چاہتے۔ اماں بی تو پہلے ہی جانتی تھیں کہ وہ اپنا فیصلہ کسی حور نہیں بدلیں گے۔ وہ خاموشی سے ان کے پاس سے اٹھ گئیں۔ چھ مہینوں کی مسرت جہاں کے پوچھنے پر کیا کہیں گی؟ اپنے کمرے میں آتے ہوئے انہوں نے مسرت جہاں کے کمرے کی جتنی جلتے دیکھی تھی۔ وہ ان کے دل کی بے چینی کو جان گئیں۔ مسرت جہاں نے اپنی تھیں اور پڑھائی کی شوقین بھی۔ خود اماں بی واجبی سا پڑھی لکھی ہوئی تھیں لیکن تعلیم کے حصول کو برا نہیں سمجھتی تھیں۔ پھر اب تو زمانہ بدل گیا تھا۔ بیٹا اور بیٹی دونوں کو مساوی حقوق دیئے جا رہے تھے۔ پھر ان کے گھر میں بیٹی کے لیے الگ سے قوانین کیوں وضع کیے جا رہے تھے۔ رات ایسی ہی سوچوں میں گزر رہی تھی۔ جانے کس گھڑی پلک سے پلک لگی۔ اذانوں سے کچھ دیر بعد میں آنکھ کھلی۔ وضو کر کے فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد وہ بیچ کر رہی تھیں۔ جب دروازے سے مسرت جہاں داخل ہوئیں۔

سفید قمیض شلوار پر بڑا سا انڈین ملل کا دوپٹہ اوڑھے وہ اجلی ٹکھری صبح کا سی حصہ لگ رہی تھیں۔ بالوں کی لٹیں دوپٹے کی اوٹ سے جھانک رہی تھیں۔

جانے کیوں اماں بی کو ان کے چہرے پر پھیلے رنگ کچھ پیچھے اور ملال میں ڈوبے ہوئے لگے۔ ایک ہی شب جانے کو ہی سوچوں کے تانوں بانوں میں الجھ کر ان کے معصوم چہرے نے سنجیدگی کی دبیز چادر اوڑھ لی تھی۔ شرارت سے چمکتی آنکھیں کچھ نیچھی نیچھی سی لگیں۔

"بیٹا رانی! وہاں دروازے کے پاس کھڑی کیا کر رہی ہو؟ یہاں آؤ میرے پاس۔" انہوں نے بہت پیار سے کہا تو مسرت جہاں نے ایک پل کو سہراٹھا کر ان کی سمت دیکھا اور پھر دھیرے دھیرے کچھ قدم اٹھاتی ان کے قریب آ گئیں۔ جیسے وہ کانچ کی بنی ہوں اور پتھر ملی زمین پر چھنا پڑ گیا ہو۔

"یہاں بیٹھو میرے پاس۔" اماں بی نے جانے نماز سمیٹ کر وہیں اپنے قریب ہی تخت پوش پر ان کے بیٹھنے کی جگہ بنائی۔ وہ خاموشی سی اماں بی کے پاس بیٹھ گئیں۔

"بیٹا! کیا ناراض ہو گئیں مجھ سے؟"

"نہیں اماں بی! ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ نے ایسا کیوں سوچا؟" مسرت جہاں نے ان کے خیالات کی تردید کی۔

"بیٹا! ہم نے تو پوری کوشش کی لیکن تمہارے ابا میاں جب ایک بار کچھ کہہ دیتے ہیں تو پھر اس پر سے ایک انچ ادھر ادھر نہیں ہوتا۔ ان کا اقرار، اقرار ہوتا ہے اور انکار کا مطلب انکار۔"

"اماں بی! آپ مجھے وہ بات کیوں سمجھا رہی ہیں۔ جو پہلے سے میرے علم میں ہے۔ میں جانتی ہوں کہ وہ نہیں مانیں گے۔"

"تو پھر بیٹا! یوں دل چھوٹا نہ کرو۔ ہنسو بولو۔ جیسے پہلے خوش رہتی تھی اسی طرح۔" اماں بی کے کہنے پر ایک پھٹکی سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر بکھر کر معدوم ہو گئی۔

"اماں بی! میرا ایک خواب تھا میں ڈاکٹر بننا چاہتی تھی۔ اور خواب ہی تو زندگی کا حاصل ہوتے ہیں۔ مجھے کم سے کم اپنے خوابوں کے ٹوٹنے پر اداس تو ہونے دیں۔" ان کی بات سن کر اماں افسردہ سی نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگیں۔

"بیٹا! میرے اختیار میں ہوتا تو تمہارے خواب ٹوٹنے نہ دیتی۔ تمہارے ابا میاں کی سوچ بھی اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ وہ باہر کا ماحول دیکھتے پرکھتے ہیں۔ اچھی طرح جانتے ہیں۔ اسی لیے مستقبل کی پریشانی سے بچنے کی پیش بندی کرتے ہیں۔ تم بھی یہ سوچ لو کہ ان کا یہ فیصلہ شاید تمہارے حق میں اچھا ہو۔" وہ بے دلی سے اماں بی کی باتیں سن کر وہاں سے اٹھ گئیں۔ پھر آئے۔ یہ بات پہلے دن جیسے گھسٹ گھسٹ کر گزرے تھے۔ مسرت جہاں کی خوش نوائیوں پر تو جیسے خزاں نے سیاہ پنچے گاڑ دیئے

تھے۔ مگر میں سنانے سے گونجنے لگے۔ جس بلبل کی لہکار سے ہر دم رونق رہتی تھی وہ خاموش ہو گئی تھی اور اس کی یہ خاموشی گھر بھر کو تشویش میں جھلا کیے دے رہی تھی۔ مسرت جہاں نے نہ تو ضد کی نہ ہی رونا دھونا مچایا۔ بس غیر ضروری باتیں ختم کر دیں۔ ان کی اس نمایاں تبدیلی نے اماں بی اور ابامیاں کو بھی پریشان کیا۔

”زہرہ خاتون! مسرت جہاں آج کل کیوں چپ چاپ رہنے لگی ہیں؟“ ابامیاں کے سوال پر انہوں نے کچھ ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں کہ آپ سے زیادہ بہتر اس کا سبب کون جانتا ہے۔ لیکن منہ سے کچھ نہ بولیں۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہیں ہماری طرف؟“ کیا ہم قصور وار ہیں اس بات کے؟“ ان کے دوبارہ سوال کرنے پر بھی اماں بی کچھ نہ بولیں۔ خاموشی سے بیٹھی ساگ بتاتی رہیں۔

”ٹھیک ہے آپ جواب نہیں دیتا چاہتیں تو ہم مسرت جہاں کو بلا کر خود پوچھ لیتے ہیں۔“ اور پھر انہوں نے واقعی اسی وقت مسرت جہاں کو بلوایا۔

”بیٹھے بیٹا!“ مسرت جہاں ان کے سامنے بیٹھ گئیں۔

”کیا ہم آپ کی خاموشی اور اداسی کا سبب جان سکتے ہیں؟“ وہ عمیق نظری سے مسرت جہاں کے کھلے کتاب جیسے چہرے کا مطالعہ کرنے لگے۔ ابھی وہ اتنی سمجھدار نہیں ہوئی تھیں کہ جذباتوں اور تاثرات کو چھپا سکیں۔ ہر جذبہ آنکھوں کے آئینے پر آ کر اپنی اصل صورت حال دکھا دیتا تھا۔

”جی..... ابامیاں!“ انہیں توقع نہیں تھی کہ ابامیاں یوں بطور خاص انہیں بٹھا کر ان کی خاموشی کا سبب جاننا چاہیں گے۔

”ہم کہہ رہے ہیں کیا آپ ہمیں اپنی اس خاموشی کی وجہ بتائیں گی؟“

”کوئی نہیں ابامیاں! ایسی کوئی بات نہیں۔“ وہ کچھ زور سے ہو گئی تھیں۔ شاید اس لیے کہ آج تک انہوں نے ابامیاں سے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔

”بیٹا! اولاد کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو جائے کتنی ہی خود مختار، کتنی ہی انڈیپنڈنٹ ہو جائے۔ ماں باپ کی نظروں میں اس کا بچپن ہی رہتا ہے۔ آپ اس وقت جھوٹ بول رہی ہیں۔ ہم یہ بھی اچھی طرح جان رہے ہیں۔ آپ نہیں بتانا چاہتیں تو نہ سہی، ہم ان باپوں میں سے نہیں جو اولاد پر بے جا سختی کریں۔“ ان کے لہجے میں تاسف کا ہلکا سا شائبہ تھا۔

”ابامیاں..... آپ ناراض مت ہوں۔ اصل میں میرا ایک خواب تھا۔ ڈاکٹر بننے کا خواب۔ لیکن میں آپ کے فیصلے کے آگے سر نہیں اٹھاؤں گی۔ بس وقتی طور پر کچھ دکھ ہوا۔“ مسرت جہاں سادگی سے کہتی ہوئی شبیر حسین کو اتنی پیاری لگیں کہ انہوں نے جھٹ سے گوہر مقصود ان کی گود میں ڈال دیا۔

”اور اگر ہم اس دکھ کا اس رنج کا مداوا کر دیں۔“ وہ مسکراتی نگاہوں سے ان کی جانب دیکھ رہے

تھے۔ وہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں ان کی طرف دیکھنے لگیں۔

”ہم کل ہی کالج سے آپ کے لیے فارم منگوائیں گے۔ اب تو خوش ہیں ناں۔“ ان کی بات سن کر مسرت جہاں کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ گویا ایک مژدہ جانقراء تھا جس کا حرف، حرف ان کے اندر روح بن کر اتر گیا تھا۔

”لیکن ایک بات..... اسے ہماری پہلی اور آخری نصیحت، تنبیہ یا پھر حکم سمجھ لیں کہ اپنے خوابوں کی تکمیل میں ہماری عزت و حرمت کا خون شامل مت کیجئے گا۔ جس بے داغ پوشاک میں ملیں ہیں آپ اس پر ہم ذلت کا کوئی چھینٹنا نہیں برداشت کر پائیں گے۔“ ابامیاں کے جملوں میں جانے کیا تھا کہ ایک پل کو مسرت جہاں لرز کر رہ گئیں لیکن ان احساسات پر بہت جلد خوشی کا احساس غالب آ گیا۔ گھر بھر کو خبر ہو گئی تھی کہ مسرت جہاں کو ابامیاں نے کالج میں انڈیشن لینے کی اجازت دے دی۔ بھائیوں نے مبارکباد دی۔ سوائے عارب بھیا کے ابامیاں کے اس فیصلے کو کبھی نے سراہا تھا۔



PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

مغنیہ کی آواز میں درد تھا، سوز تھا۔ اس کے لبوں سے تلخ حقیقت نزل نزل لفظوں کی صورت میں
 ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہی تھی۔ سارے ماحول پر فسوں طاری تھا۔ وہ منچلے جوائنکھوں میں شوق و ہوس کا ایک
 جہاں آباد کیے رقصہ کی ایک ایک جنبش کو نظروں ہی نظروں سے دل میں اتار رہے تھے۔ گانے والی کی
 جانب متوجہ ہو گئے۔ کالے بارڈر کی کریم کلر کی سازھی میں لمبے سیاہ بال پشت پر دھرے، بالکل سادہ
 چہرے والی یہ عورت اس ماحول کا حصہ تو ہرگز نہیں لگ رہی تھی۔

اس گھڑی کوئی کسی کا بھی نہیں رہنے دو
 کوئی اس وقت ملے گا ہی نہیں رہنے دو

اور ملے گا بھی تو اس طور کے پچھتاؤ کے
 اس گھڑی اسے دل آوارہ کہاں جاؤ گے؟

اور کچھ دیر ٹھہر جاؤ کہ پھر نشر صبح
 زخم کی طرح ہر اک آنکھ کو بیدار کرے

اور ہر کشتہ و ماندگی آخر شب
 بھول کر ساعت در ماندگی آخر شب

جان پہچان، ملاقات پہ اصرار کرے

لفظ ختم ہو چکے تھے یا شاید گویائی سے محروم ہو گئے تھے۔ رقص کرتے قدم بھی ختم گئے۔ طبلہ نواز،
 سارنگی نواز گونگے ہو گئے لیکن اس سراپا نازنین کے الفاظ نے ماحول پر جو فسوں طاری کر دیا تھا وہ اسی
 طرح قائم تھا۔ وہ جا چکی تھی اور اس کے جاتے ہی روشنیوں کے باوجود اندھیرا سا پھیل گیا۔ جھروکے
 سے لگ کر گھڑی چھ سات سال کی بچی وہ سب بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ اس اجنبی
 ماحول میں اگر اس کی شناسائی کسی کے ساتھ تھی وہ صرف اور صرف اسی ساحرہ سے تھی جو ابھی ابھی محفل کو
 حنوط کر کے جا چکی تھی۔ پھر اس چھ سات سال کی بچی کو کسی نے نرم گرم آغوش میں لیا تھا۔ ماںوں کی خوشبو نتھنوں
 سے نکرائی تھی۔

”ماں..... اس کے لبوں نے بڑے پیار سے یہ لفظ کہا تھا اور پھر پلٹ کر وہ اس سے لپٹ گئی تھی۔

”ماں..... ماں..... اس کی روح اسی لفظ کی تکرار کر رہی تھی۔ جب کسی نے اسے سمجھوڑا۔ اس
 کی آنکھیں کھل گئیں۔

”تو..... تو..... کیا وہ سب خواب تھا یا میرے تحت اشعور میں چھپا ماضی کس بن کر آنکھوں میں

طبلے پر تھاپ پڑی اور ہتھکڑیاں جھنناٹھے۔ سرخ قالین کے وسط میں دو گورے گورے پاؤں
 موسیقی پر جذب کے عالم میں متحرک ہو گئے۔ سفید چاندنیوں پر گاؤں کیے لگائے بیٹھے امارت کا رعب
 ڈالنے والے، دن کو اچلے لباسوں میں گھومنے والے اور راتوں کی سیاہی میں گمناہوں سے آلودہ قفس
 ہونے والے تماش بین پوری طرح متوجہ ہو گئے۔ اس بازار میں جہاں عورت جس کی طرح بکتی ہے۔
 اسے خریدنے والے ایسے ہی شریف ابن شریف آتے ہیں۔ عورت بے بس بھی ہے، خود مختار بھی۔ ظالم بھی
 ہے، مظلوم بھی۔ حاکم بھی ہے، محکوم بھی لیکن اس بازار میں جہاں دن سوتے، راتیں جاگتی ہیں عورت محض
 ایک کھلونا ہے۔ بگڑے ہوئے بچوں کے ہاتھوں میں تھمایا گیا ایسا کھلونا کہ جس کے نصیب میں صرف نوٹنا
 اور بار بار نوٹنا ہی لکھ دیا گیا ہے۔

اور کچھ دیر میں کٹ جائے گا ہر بام پہ چاند
 عکس کھو جائیں گے آئینے ترس جائیں گے

عرش کے دیدہ نمناک سے باری باری
 سب ستارے سر خاشاک برس جائیں گے

آس کے مارے تھکے ہارے شبتانوں میں
 اپنی تہائی سینے گا، بچھائے گا کوئی

بے وقائی کی گھڑی، ترک مدارات کا وقت
 اس گھڑی اپنے سوا یاد نہ آئے گا کوئی

ترک دنیا کا سماں ختم ملاقات کا وقت
 اس گھڑی اسے دل آوارہ کہاں جاؤ گے؟

انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ معاملہ عدالت عالیہ تک پہنچ چکا ہے لیکن بیچ اس وقت خاموش تھا۔ البتہ متحارب گروپ جی جان سے ایک دوسرے پر کچڑا پھال رہے تھے۔ دودلوں کمرے میں داخل ہوئیں۔ حدیث چچی اور زاہدہ چچی دونوں ہی شدید غیض و غضب کے عام میں ایک دوسرے کو گھور رہی تھیں کہ اگر اجازت ہوتی تو ایک دوسرے کی تھک ہوئی کر دیتیں۔ بھابی مقصوم نے آگے بڑھ کر زاہدہ چچی کو کندھے سے تھاما۔

”زاہدہ! تم بڑی ہو۔ درگزر سے کام لو۔ چھوٹے اکثر ایسا کر جاتے ہیں۔ بڑوں کا کام ہے صبر و تحمل سے پیش آئیں۔“

”بالکل بڑوں کا کام ہے صبر و تحمل سے پیش آئیں تاکہ چھوٹے سرچڑھ کر نہ پھیں۔ ارے بھابی۔ گز بھری زبان ہے اس کی۔ نہ لحاظ نہ مروت۔ خدا جانے ماں نے کیسی تربیت کی ہے نہ چھوٹے کا پتہ نہ بڑے کی خبر۔ اپنی انہی عادتوں کی وجہ سے سارے خاندان سے کٹ گئی ہے۔ شا کر جیسے اچھے لڑے کو بھی خاندان بھر میں ذلیل کر کے رکھ دیا۔ اب بھی کھجے میں خضہ نہ پڑی۔“ زاہدہ چچی نے موشگافی کی۔

”بس بس۔ اچھی طرح جانتی ہوں میں اس گھر کے بڑوں کو۔ خرابی اپنی ادا د میں ہوتی ہے اور دوسروں پر چڑھ دیتے ہیں۔ بیٹی تو آپ کی بھی ہے۔ کیا تربیت کر رہی ہیں اس کی۔ اتنی بڑے گائے کی گائے ہو گئی۔ چائے تو بنانی نہیں آئی اسے۔“ حدیث چچی نے جواباً حملہ کیا۔

”دیکھو حدیث! بات بڑھانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ تم ماں کیوں نہیں جانتی ہو کہ تمہاری غلطی ہے۔ بغیر تحقیق و تصدیق کے تم نے بات کیوں کی۔ فہدی سے تم اچھی طرح واقف ہو۔ کس سپر امنٹ کا نر کا ہے وہ۔ وہ کوئی کھنڈ رائٹن اہل نہیں۔ ایک سلجھا ہوا۔ پڑھا لکھا، پروفیشنل آدمی ہے۔ کھینک چلا۔ ہا ہے ذمہ دار! اکثر ہے۔ ایسی چیپ اور غیر ذمہ دارانہ حرکت کر سکتا ہے وہ؟ پھر تم نے اس کی ماں سے اس کے متعلق اس طرح بات کی تو اس کا بھڑکنا تو بنتا ہی تھا۔“ ہینا چھپو نے سمجھانے کی کوشش کی۔ حدیث چچی بدلتی غمی سے کچھ دیر سب کی طرف دیکھتی، جس پھر تن فرم کرتی کمرے سے نکل گئیں۔ یعنی سمجھنے کے باوجود انہوں نے اپنی غلطی تسلیم نہ کی۔

”اماں بی! آپ کچھ کہتی کیوں نہیں اسے۔ آپ نے سر پر چڑھا رکھا ہے۔ ہوتے ناں آج ابا میاں! پھر میں دیکھتی کہ یہ کس طرح بڑوں کے منہ لگتی ہے۔“ زاہدہ چچی کا پارہ نیچے آئی نہ رہا تھا۔ اس لیے کہ حدیث چچی غلطی کر کے ماننے والوں میں سے نہیں تھیں۔ وہ غلطی کر کے شیر کی طرح سینہ تان کر کھڑی ہوئی جانتی تھیں کہ کر لو جو کرنا ہے اور ان کی بیٹی عادت گھروالوں کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ انہوں نے آتے ہی الگ گھر کا مطالبہ کر دیا تو اماں بی نے فوراً اشاکر حسین کو گھر بنا دیا۔ اس کے باوجود کسی نہ کسی معاملے میں نہنگ اڑانے کو آموجود ہوتیں۔

”زاہدہ! میں عزت سے ذرتی ہوں۔ تم چاروں نے کبھی میرے سامنے زبان نہیں کھولی۔ ہمیشہ

میرا احترام کیا لیکن اس عورت کی زبان کے آگے خندق ہے۔ یہ بولتے سے سوچتی نہیں اس لیے میں اس سے زیادہ کام ہی نہیں کرتی۔“ بڑی اماں رسان سے بولیں۔ زاہدہ چچی خاموش ہو گئیں لیکن اندر سے کھول رہی تھیں۔ بھابی مقصوم اور ہینا چھپو کے سمجھانے پر کسی حد تک وہ مان گئیں لیکن ان کے چہرے سے ناراضگی کے تاثرات بدستور مترشح تھے۔

”ہینا! کیا وہ بچی یہاں آ سکتی ہے؟ میں ملنا چاہتی ہوں اس سے۔“ بڑی اماں نے کہا۔ ”پتہ تو چلے کون ہے۔۔۔ کہاں سے آئی ہے۔۔۔ فہدی اسے کیوں لے کر آیا؟“

”کیوں نہیں بڑی اماں! آ کیوں نہیں سکتی۔ اصل میں مسئلہ یہ تھا کہ فہدی اس لڑکی کے متعلق جانتا کچھ نہیں تھا کہ یہ کون ہے کہاں سے آئی ہے۔ آدمی رات کو تنہا سڑک پر کس لیے کھڑی تھی۔ چوٹ تو کچھ زیادہ نہیں آئی تھی۔ وہشت سے بے ہوش ہو گئی تھی۔ فہدی کہہ رہا تھا کہ میرے ضمیر نے گوارا نہ کیا کہ میں اسے یوں تنہا سڑک پر بے ہوش پڑا چھوڑ کر آ جاتا۔ پھر خیر سے بھرپرا گھر ہے۔ اس کی با آسانی عیادت اور دیکھ بھال کی جا سکتی تھی۔“

”لیکن وہ اسے ہسپتال بھی تولے جا سکتا تھا۔ وہاں اس کی زیادہ بہتر دیکھ بھال ہو سکتی تھی۔“ بڑی اماں نے کہا۔

”اس نے یہ بھی کہا کہ لے جانے کو تو میں اسے کھینک میں بھی لے جا سکتا تھا لیکن اس کے ساتھ کسی اور کا نہ ہونا اس کو مشکوک بنا دیتا اور مجھے بھی۔ اس لیے میں نے بہتر سمجھا کہ گھر لے چلوں۔“

”ہوں۔“ ٹھیک ہے تم اس لڑکی کو ہمیں لے آؤ۔“ ہینا چھپو بڑی اماں کی بات سن کر کمرے سے نکل گئیں۔ کمرے میں گھمبیر خاموشی چھا گئی۔ برنفس اپنی اپنی جگہ سوچوں کے گرداب میں پھنس ہوا تھا۔ چند ثانیوں پر محیط یہ وقفہ اس وقت ختم ہوا جب ہینا چھپو کے ہمراہ وہ کوئل سی لڑکی کمرے کے اندر داخل ہوئی۔ کمرے میں موجود تینوں خواتین نے بیک وقت اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ بھی انہی کی جانب متوجہ تھی۔ سوائس یوں اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ قدرے زروں ہو گئی۔

”جی اماں بی! یہ آریاں ہے اور آریاں یہ ہماری اماں بی۔ یہ بھابی مقصوم ان سے تو کسی حد تک تمہارا تعارف ہو بھی چکا ہوگا اور یہ زاہدہ۔“ فہدی کی امی۔ ”آریاں نے تینوں خواتین کو بغور دیکھا اور پھر جیسے اس کی نگاہیں بڑی اماں کے جھریوں زدہ چہرے پر ٹپک گئیں۔ بڑی بڑی خواب ناک آنکھیں جو وقت کی ستم ظریفی سے قدرے ڈھلک گئی تھیں لیکن وقت کا ظالم ہاتھ ان کی چمک چھیننے میں ناکام رہا تھا۔ پتلے پتلے گا بی ہونٹ اور ستواں ناک۔ سفید بالوں کو بڑے سے سفید آنچل میں چھپائے سفید چکن کے سوٹ میں ان کا وجود اس قدر مقدس اور پاکیزہ لگا کہ وہ بے اختیار چند قدم پھل کر ان کے قریب نیچے بیٹھ گئی۔ انتہائی ادب اور احترام کے ساتھ ان کا نرم گرم لچلی سا ہاتھ اپنے سر د ہاتھوں میں تھام کر

آنکھوں سے لگا لیا۔ یوں لگا جلتی ہوئی آنکھوں پر کسی نے برف کی ذلی رکھ دی ہو۔ بڑی اماں عالم حیرت میں اس کی جانب دیکھ رہی تھیں۔ اس کا یہ طرز عمل ان کے لیے بالکل غیر متوقع اور عجیب سا تھا لیکن وہ بولیں کچھ نہیں۔ شاید وہ منتظر تھیں کہ آریان کچھ کہے۔

”بڑی اماں! کیا آپ مجھے بھی بڑی اماں کہنے کی اجازت دیں گی؟“ یہ سوال تھا یا اس کے ذہنی وجود سے نکلی کراہ، اس کی محرومیوں کا آئینہ جو بڑی اماں کے درد مند دل میں ترازو ہو گیا تھا۔

”ہاں بچی! کیوں نہیں۔ شوق سے کہو میں تمہاری بڑی اماں ہوں۔“ ان کا خلوص لفظوں میں ڈھل کر لبوں سے آزاد ہوا تو جیسے اسے سکون سا آ گیا۔

”بس! مجھے اور کچھ نہیں چاہئے۔ بڑی اماں! میں نے زندگی میں اوپر والے سے کچھ مانگا تو صرف رشتوں کا غرور مانگا اور آج آپ نے مجھ سے یہ رشتہ جوڑ کر میری تمنا پوری کر دی۔ اوپر والے نے میری دعا مستجاب کر دی۔“ عینا پھپھو نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔ کل سے اب تک یہ پہلی طویل بات تھی جو اس نے کی تھی۔ اس کی بات کے جواب میں پھر بڑی اماں کچھ نہیں بولی تھیں۔ اس لیے کہ جب اسے اپنا لیا تھا تو پھر یہ جان کر کیا لینا تھا کہ وہ کون تھی؟ کہاں سے آئی تھی؟ وہ اب ان کی تھی، ان کے پاس رہنا تھا اسے۔ ان سب کے لیے یہی کافی تھا۔



آج اسے اس گھر میں تیسرا دن تھا۔ روہیہ اور ایتھ تو اس سے ایسی دوستی ہو گئی تھی جیسے وہ شروع سے ہی ان کے ساتھ رہتی آ رہی ہو۔ روہیہ اور وہ تقریباً ہم عمر ہی تھیں۔ جبکہ ایتھ چھوٹی تھی۔ چھوٹی تو تھی لیکن ہرٹی مرتب۔ اس وقت وہ تینوں لان کے گھاس پر براجمان تھیں۔ موسم نے یکدم ہی بے وفا محبوب کی طرح رنگ بدلا تھا۔ صبح سے کڑکٹی دھوپ کی تمازت سے جھلستے دیوار و دراب آسمان کی عنایت پر کچھ پر سکون دکھائی دے رہے تھے۔ ہو لے ہو لے جلتی ہو اور رختوں اور پودوں کے پتوں سے سرگوشیاں کرتی ان کی کہتی آجاری تھی۔ یہ تینوں پھولوں کے کنارے کے قریب بیٹھی تھیں ان سے قدرے فاصلے پر چھٹی ان چیمیز پر گھر کی دیگر خواتین چائے پینے اور خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔

”ویسے آریان آپ! آپ نے اب تک ہمارے گھر کے افراد کے بارے میں کوئی رائے نہیں دی۔“ ایتھ نے شریعہ ہوا کی آنکھیلی سے ماتھے پر جھول آنے والی لٹ کو انگلی سے پیچھے کرتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ اس کے سوال پر ایک جھکی سی مسکراہٹ آریان کے لبوں پر در آئی۔

”کیا بہت ضروری ہے؟“ سوال کے جواب میں اس نے انسا سوال کر دیا۔

”بالکل! جب ہم کسی خاص ماحول میں یا چند افراد کے درمیان میں رہتے ہیں تو خود بخود ہمارا ذہن وہاں کے بارے میں ایک رائے قائم کر لیتا ہے مثبت یا منفی اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آپ کے

ذہن میں بھی رائے محفوظ ہے اس وقت۔“ ایتھ فلسفیانہ انداز میں گویا ہوئی۔

”خدا رایتھ! اپنا فلسفہ بول کر بلا وجہ دماغ پلپلا کرنے کی کوشش مت کرو۔ اچھا خاصا موسم ہے اور بہت ہی اچھا موز بھی۔ دونوں غارت ہو جائیں گے۔“ روہیہ اس کی باتوں سے اکتا کر بولی۔

”آریان آپ! ازل سے ہی بے چارے فلسفیوں کے ساتھ ایسا ہوتا آیا ہے۔ خواہ وہ جبران ہو یا سقراط۔ دکھ کا زہر پلاتے ہیں اسے یہ زمانے والے۔ کوئی قدر نہیں میلنڈ لوگوں کی یہاں۔“ مصنوعی سرد آہ بھر کے ایتھ نے کہا تو آریان مسکراتے لگی۔

”دیکھو بھئی! سیدھی سی بات ہے نہ تو ہم فلسفی کی بکریاں ہیں کہ تمہاری باتیں سن کر دماغ کا خانہ خالی کر دیں اور نہ ہی تم کوئی اتنی بلند پایا فلسفی ہو جس کا کہا ہوا اتنا قیمتی ہو کہ ہم اپنا وقت ضائع کرتے پھریں۔“ روہیہ نے کہا۔

”ٹھیک ہے! ناپک چینیج کیے لیتے ہیں۔ آریان آپ! نے تو اپنی رائے نہیں دی۔ البتہ ہماری خواہش ہے کہ ہم اپنی رائے سے اس بیماری سی لڑکی کو جواب ہماری آپنی بھی جس ضرور شیعہ کریں۔“

”کیا مطلب؟“ ”کون سی رائے؟“ کس کے بارے میں؟“ روہیہ نے حیرت سے ایتھ کی طرف دیکھا۔

”ارے یہی جو رشتوں کی فوج ظفر مومج ہے ہمارے ارد گرد انہی کے بارے میں اور کیا۔“ ایتھ نے جیسے روہیہ کی کم عقلی پر ماتم کرنے والے انداز میں کہا۔

”اس کی کیا ضرورت ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی؟“

”ارے روہیہ! کیوں بے چاری کو بار بار ٹوک دیتی ہو۔ کہنے دو۔ ہاں ایتھ بولو۔ کیا کہنا چاہتی ہو تم۔“ آریان نے پہلے روہیہ اور پھر ایتھ کو مخاطب کیا۔ تو ایتھ نے چڑانے والے انداز میں روہیہ کی طرف دیکھا اور گویا ہوئی۔

”ہاں جی! تو ہم یہ کہہ رہے تھے کہ ہر انسان کی اپنے ماحول اور ارد گرد بسنے والوں کے بارے میں اپنی ذاتی رائے ہوتی ہے۔ پانی سب کیا سوچتے ہیں۔ اس کا تو ہمیں علم نہیں البتہ ہماری رائے سادات گھر کے پاسیوں کے بارے میں کچھ یوں ہے۔ ارے۔۔۔۔۔ ایک منٹ۔۔۔۔۔ ایتھ یوں خاموش ہوئی جیسے اسے کچھ بھول گیا ہو اور وہ یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

”ہوں۔۔۔۔۔ تو جناب سفید کرتے شلوار اور دوپٹے میں لمبی پٹنائی، کمٹی سمنائی سی یہ ہمارے گھر کی سب سے بزرگ ہستی ہیں۔ ان کے سفید بالوں اور پروقاہ شخصیت کی طرح ان کا دل بھی اسی قدر قابل تعظیم و تکریم ہے۔ اور ہمیں یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ اس گھر میں سے ہماری سب سے زیادہ دوستی انہی سے ہے۔ عرف عام میں انہیں بڑی اماں کہتے ہیں اور عرف خاص یعنی ہم انہیں دادو کہتے ہیں۔ سادات

گھر انہی کی راج دھانی ہے۔ گھر کے اندر داخل ہوتے ہی آپ کو ایک خوبصورت مہربان نظر آئے گا۔ یقیناً لان کی دلکش آرائش، ترتیب اور خوبصورتی دیکھ کر آپ مینوں کی خوش ذوقی اور محنت کو سراہیں گی لیکن ایسا ہرگز نہیں کیونکہ یہ سارا کمال مینوں کا نہیں، مالی کا ہے۔ اس گھر والے آرائش و زیبائش اور محنت کو پسند ضرور کرتے ہیں لیکن اس آتش میں بے خطر کودیں ایسا قلعی نہیں۔ "ایقہ ایک ہل کو رکی۔ آریان دلچسپ نگاہوں سے اس کی سمت دیکھ رہی تھی۔ جبکہ رو بہ اسے کھا جانے والی نگاہوں سے گھور رہی تھی۔ اس نے وہ بیہوشی کی تھنگائی کو نظر انداز کرتے ہوئے بیان دیا وہیں سے جوڑا جہاں سے سلسلہ کلام نونا تھا۔

"لان کے بالکل سامنے تین میز حیاں چڑھنے کے بعد ایک چمکدار چکنے فرش والا برآمدہ ہے۔ برآمدے کے بالکل سامنے لکڑی کا بڑا سا منقش دروازہ ہے۔ یہ ہال کمرہ ہے جسے گھر کے افراد ہی وی لاؤنج کہتے ہیں لیکن آپ اسے کچھ بھی کہہ لیں۔ ڈرائنگ روم، سٹنگ روم، میٹنگ روم جو بھی آپ سمجھ لیں۔ کمرے کی دیدہ زیب ڈیکوریشن اور لشکارے مارتے ہوئے فرنیچر کی صفائی اپنے ہاتھوں سے نہیں بلکہ ملازمہ کے ہاتھوں پر کڑی نظر رکھ کر کروائی جاتی ہے۔ یہ ملازمہ اس گھر میں برسوں سے کام کرتی چلی آرہی ہے۔ نام شاکرہ ہے لیکن صبر، شکر نام کو نہیں۔ گھر میں کھانا سب سے پہلے یہی کھاتی ہے چاہے مالکان نے کھایا ہو یا نہیں۔ اس بات کی محترمہ کو رتی برابر پرواہ نہیں۔ اب آتے ہیں گھر کے افراد کے پاس تو جناب سب سے پہلے ہم یہ وضاحت کرتے چلیں کہ اس رائے سے مرد حضرات مستثنیٰ ہیں۔ ہم ان کے بارے میں رائے محفوظ رکھتے ہیں۔" ایقہ کی آخری بات پر وہ بیہ اور آریان کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

"کیوں مرد حضرات کے بارے میں رائے کیوں نہیں دی جاسکتی؟"

"دی جاسکتی ہے لیکن اس سے نقص امن کا خدشہ ہے۔ ہاں تو جناب گھر کی سب سے بزرگ خاتون کا تعارف تو ہو چکا۔ اب آتے ہیں اس گھر کی بڑی بیوی یعنی تائی جی کی طرف۔ تائی جی ایک "موصوم اور بھولی بھالی خاتون ہیں۔ ہم انہیں پیدائشی ماں سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ صرف انسانوں کے لیے ہی نہیں جانوروں کے لیے بھی دل میں ڈھیروں ڈھیر پیار رکھتی ہیں۔ گھر بھر میں کسی کو کوئی تکلیف ہو سب سے زیادہ دکھ تائی کو ہوتا ہے اور وہ اس تکلیف کو رفع کرنے کی کوشش میں لگ جاتی ہیں۔ شاعر نے انہی کے بارے میں کہا ہے کہ

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

"کیوں روہی! ہم نے کچھ غلط تو نہیں کہا؟" ایقہ ایک شان بے نیازی سے بولی۔

"نہیں بھئی ہم میں اتنی جرات کہاں کہ آپ کی کبھی کسی بات کو غلط کہہ سکیں۔" روہی نے اس کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ آریان کو یہ دونوں نہیں انتہائی پیاری لگی تھیں۔

"تم خاموش کیوں ہو گئیں۔" آریان نے ایقہ کو کچھ سوچتے پا کر کہا تو اس نے آریان کی طرف

دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے کچھ دیر پہلے کی شوخی ختم ہوئی تھی۔ چہرے پر ایک سنجیدہ مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"دراصل جس ہستی کا میں اب ذکر کرنے جا رہی ہوں لوگوں کے لیے تو شاید وہ اتنی اہم نہ ہو۔ لیکن آپ! ان کی حیثیت کا اندازہ اس بات سے لگالیں کہ ہماری سانسوں کا ایک تاننا پاننا انہی کے مہربان منت ہے۔ آپ کے چہرے کی مسکراہٹ بتا رہی ہے کہ آپ جان گئی ہیں وہ کون ہیں! جی ہاں آپ نے ٹھیک سمجھا باقی سب کی ہینا پھپھو اور ہماری ماما۔ یہ ایسی شخصیت ہیں جن کے بارے میں میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہوں گی کہ اگر کسی نے جنت کو مجسم و متحرک دیکھنا ہو تو وہ ہماری ماما کو دیکھ لے۔" محبت، عقیدت، احترام جانے کتنے ہی جذبے اس کے لہجے میں سمٹ آئے تھے۔ ایک ماں کی ذات کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے۔ لیکن شاید دنیا میں ایسے لفظ ہی نہیں کہ جنہیں گل ہائے عقیدت کی صورت میں ماں کے قدموں پر نچھاور کر کے ہم یہ سمجھ لیں کہ ہمارا فرض پورا ہوا۔ ہم نے اپنی محبت کا ثبوت دے دیا۔ آریان کی گھنیری چٹکوں تلے ماں کی پاکیزہ شبیہ لہرائی۔ کتنا سکون کتنی طمانیت تھی اس آغوش میں۔ کتنا پیار تھا آنکھوں میں۔ وہ سکون، وہ طمانیت وہ ماما۔ وہ محبت بھی کچھ اس کی میراث۔ اس کی جائز تھا لیکن آج وہ راستوں کی بیٹی تھی۔ گرد سفر کی طرح قافلے کے پیچھے رہ گئی تھی۔ ڈار سے چھڑی ایک ایسی کرلائی کوچ تھی جس کی کڑیاں نہیں، سسکیاں، جس کی چٹخیں اور دکھ صرف اس کی ذات کے اندر تک محدود تھا۔ کوئی نہیں تھا جو اس کے اندر جھانک کر اس دھج بے اماں میں اس کی خواہشوں کی بے کفن لاشیں ڈھونڈ سکتا۔ پھر کسی کو کیا پڑی تھی بے اثر دعاؤں کے مستجاب ہونے کے منتظر رہنے کی۔ سو پوری دنیا اپنی رنگینیوں میں کھولی ہوئی تھی۔

"آریان آپ! آپ کیا سوچ رہی ہیں!" ایقہ نے پوچھا تو وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"یہ سوچ نہیں رہی ہیں بوری ہوری ہیں تمہارے اس طویل و عریض تعارف سے جس کا نہ سر ہے نہ پیر۔ جس کے ختم ہونے کے کوئی چانس نظر نہیں آرہا ہے۔ اگر تم اسی طرح تعارف پیش کرتی رہی تو یقیناً یہ سال ہمیں لان میں بیٹھے بیٹھے گزر جائے گا۔" روہی کی بات سن کر ایقہ نے برا سا مانیایا۔

"دیکھ لیا آریان آپ! ایسے لوگ ہوتے ہیں شخصی آزادی کو سلب کرنے والے، غیر جمہوری، ڈکٹیٹر۔"

"ارے نہیں بھئی! میں ہرگز بوری نہیں ہو رہی۔ جس کے پاس تم جیسی اچھی اور مخلص دوستوں کا ساتھ ہو بھلا وہ بوری یاد کی ہو سکتا ہے۔ اصل میں مجھے اپنی یاد آگئی تھیں۔" آریان دھیمے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

"آہم..... ہم بھی اتنی دیر سے یہی سوچ رہے تھے کہ آج تک ہماری پہنی سوائے روہی کے کبھی کسی کو ناگوار نہیں گزری پھر آپ کی نفیس طبع ہمیں کیوں نہ برداشت کر پائی۔ خیر مس روہی کے کانوں تک یہ خبر یقیناً پہنچ چکی ہوگی کہ آریان آپ! ہرگز بوری نہیں ہو رہی ہیں بلکہ گہری دلچسپی سے ہماری گفتگو سے مستفید

ہوری ہیں۔ لہذا امید ہے کہ اب وہ اپنی چونچ بند رکھیں گی۔“ ایقہ شرارتی نظروں سے روبیہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی تو اس نے ہونہ کہہ کر رخ دوسری طرف کر لیا۔

”یہ ہماری بہن کا مخصوص انداز ہے اس طرح رخ پھیر کر یہ ہمیں باور کرانا چاہتی ہیں کہ اب ان کی ناراضگی کا دور شروع ہو گیا ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں۔ یہ رخ پھیر کر اس لیے بیٹھی ہیں تاکہ ہماری باتوں پر جو تاثرات ان کے خوبصورت چہرے پر آئیں وہ ہماری نگاہوں کی دستبرد سے محفوظ رہ سکیں۔“ ایقہ کی بات سن کر آریان مسکرا دی جبکہ روبیہ کھسپائی سی ہو کر سیدھی ہو بیٹھی۔ ”کیا مصیبت ہے؟ تم باز نہیں آسکتیں۔“

”یہ ہوئی ناں بات۔۔۔ ہاں تو مکمل تعارف کی طرف آتے ہیں۔ اوہو کچن میں اٹھا بیٹھ ہو رہی ہے یہ۔۔۔ پلیٹ تو نئے کی آواز ہے۔ گھبرائیے مت۔ ہمارے گھر کی ان خاتون کی کچن میں موجودگی کا ثبوت ہی یہی ہے۔ جی ہاں آپ ٹھیک سمجھتے ہیں یہ زیادہ چچی ہمارے خاندان کے اگوتے ڈاکٹر فخر واداد پر واداد جناب فواد حسین کی والدہ ماجدہ۔ خاندان بھر میں نیم حکیم مشہور ہیں۔ کسی کو کوئی بیماری ہو ایسے ایسے ایسی نسخہ جات سے بہرہ مند کرتی ہیں کہ مریض کی زندگی محض ایک معجزہ ہی رہ جاتی ہے۔ ابھی تک فیملی کے افراد ٹھیک ٹھاک ہیں کیونکہ ان کے بتائے ہوئے نسخہ جات پر عمل نہیں کرتے۔ پورا خاندان حیران ہے کہ زیادہ چچی کے ہاں اتنے ذہین و فطین بیٹے نے جہنم کیسے لے لیا۔ غالباً وہ ان کی قربت و محبت سے زیادہ فیض یاب نہ ہو پائے ہوں گے۔“ ایقہ کی بات سن کر آریان کے ذہن کے پردے پر ایک ہیو لا سا سرسرایا اور پھر ٹکس بن کر آنکھ کی پٹی پر سٹ آیا۔

ان تین دنوں میں اس نے محض دو بار ڈاکٹر فواد کو دیکھا تھا۔ انہوں نے سرسری سا اس کا حال چال پوچھا تھا اور بس۔ یوں جیسے وہ اسے یہاں لاکر بھول گئے ہوں یا شاید وہ کوئی بے جان بے وقعت سی چیز تھی جس کا خیال انہیں پھر دوبارہ آیا نہیں۔

”فیضی چچی نہ ہم کسی کے نہ ہمارا کوئی کی مکمل تفسیر ہیں۔ نہ کسی کے معاملات میں ناٹک اڑاتی ہیں نہ اپنے معاملوں میں دخل اندازی پسند کرتی ہیں۔ انہیں صرف اپنے میاں اور بچوں کی ہمہ وقت پرواہ رہتی ہے لہذا یہ سارا دن ہی آپ کو کسی نہ کسی کام میں جتی ہوئی نظر آئیں گی۔ اظہر بچا انہیں کو لہو کا تیل کہتے ہیں اور غالباً غلط بھی نہیں کہتے۔“ ایقہ نے قریبی فیضی چچی کو ہدف بنایا۔ روبیہ اور ایقہ مسکرا مسکرا کر اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

”کی۔۔۔ کتنا بولتی ہو تم۔۔۔ تھکتی ہی نہیں؟“ روبیہ نے کہا۔

”ارے دنیا میں آزادی رائے کا حق ہر ایک کے پاس ہے۔ ماما اور تم دونوں ہی مجھے بولنے نہیں دیتیں۔ آریان آپ کی غیر تو نہیں ہیں کم سے کم ان کے سامنے بولنے سے تو مت روکو۔“

”میں یہ تو نہیں کہہ رہی کہ آریان کوئی غیر ہے۔“

”چلو ٹھیک ہے بچوں کا تعارف پھر کسی دن پرانھا رکھیں گے۔ فیملی کی سب سے بڑی عزت شخصیت کا تعارف تو ہونا چاہئے ناں۔“ ایقہ کی آنکھوں میں شرارت آمیز مسکراہٹ نے گروت لی۔

”کون۔۔۔؟“ روبیہ نے پوچھا۔

”میری۔۔۔ تمہاری، خاندان بھر کی آئینہ دل۔۔۔ حدیقہ چچی۔“

”کیا۔۔۔؟“ روبیہ تو جیسے مارے صدمے کے بیہوش ہونے لگی۔

”آئینہ دل۔۔۔ حدیقہ چچی؟“

”ہاں بھئی۔۔۔ اس میں غلط کیا ہے آئینہ دل بہو کی تمام تر خوبیاں ان میں بہ درجہ اتم موجود ہیں۔ آریان آپ کی روایت کا حسین ترین نمونہ ہیں ہماری یہ چچی آئینہ دل بیوی، آئینہ دل بہو، آئینہ دل چچی اور آئینہ دل بھابی۔“ آریان نے بغور اس کی طرف دیکھا۔ ایقہ کے لہجے میں اسے طنز کا شائبہ سا ہوا۔

”تیس سال سے جڑا ہوا خاندان محض ان کی تنہا جدوجہد سے بھر گیا۔ آئے روز گھر میں ہونے والے جھگڑوں میں بڑی جانفشانی سے کام لیتی ہیں۔ اکثر گھریلو نوک بھونک انہی کی تنگ دود کی مرہون منت ہے۔ بڑی اماں کا غرور، چچوں، چچیوں کا محبت بھرا ساتھ اور احساس کارشتہ انہوں نے بڑی عرق ریزی سے اور جان بڑا کر توڑا۔ کیا ایک خاتون میں آپ کو یہ سب خوبیاں مل سکتی ہیں۔“

”کی۔۔۔ بس کرو۔۔۔ چچی نے سن لیا تو فساد کھڑا کر دیں گی۔“ روبیہ نے لان میں چھٹی کر سیوں کی طرف دیکھا جہاں ابھی تک تمام خواتین بیٹھی ہوئی تھیں۔ آریان نے سب کی طرف دیکھا۔ جانے کیا بات تھی۔ بڑی اماں کی طرف اس کا دل کھینچتا تھا۔ اس کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ بڑی اماں کے پاس بیٹھے ان سے باتیں کرے لیکن پھر یہ سوچ کر رک جاتی کہ جانے وہ کیا محسوس کریں۔ اس کی پر سوچ نکا ہیں بڑی اماں پر جمی تھیں اور ذہن جانے کن بھول بھلیوں میں ڈوب اُبھر رہا تھا۔ شاید ایقہ نے موضوع بدل دیا تھا۔ ماحول اب بھی خوشگوار تھا۔ سب کے چہروں پر اب بھی وہی مسکراہٹیں بہاؤ دکھا رہی تھیں۔ لیکن آریان اس ماحول سے یکدم کٹ گئی تھی۔ یوں ہی جیسے بھری بہار میں جب ہر طرف پھول ہی پھول کھلے ہوں کوئی نوخیز گل اچانک شاخ سے ٹوٹ کر نیچے آگرے۔



گھر سے باہر لے آیا۔ مسرت جہاں پہلے بھی سکول جاتی رہی تھیں لیکن آج جانے کیا بات تھی۔ سیاہ نقاب کے پیچھے سے بھی انہیں دنیا ٹھہری ٹھہری، اجلی، اجلی، نئی نئی سی لگ رہی تھی۔ یوں جیسے کائنات ساری کی ساری بدل کر ان کے سامنے آگئی ہو۔ انہوں نے نئی کتابوں سے بھرا بیگ یوں دبوج کر سینے سے لگا رہا تھا جیسے اس میں ہفت اقلیم کی دولت سنبھال رکھی ہو جس کے کھوجانے کا خدشہ لاحق ہو۔ جانے ذہن کس سوچوں میں غلطیاں وہ پہچاں تھا کہ کالج پہنچنے کی انہیں خبر تک نہ ہوئی۔

”اے! اب اترا نا بھی ہے یا چھٹی تک۔ یہیں بیٹھے رہنے کا ارادہ ہے۔“ شاکر حسین کی آواز انہیں حقیقت کی دنیا میں لے آئی۔ منزل آچکی تھی یا شاید یہ وہ راستہ تھا جو انہیں ان کی من پسند منزل پر لے جاسکتا تھا۔ وہ ہائیک سے اتر آئیں۔

”ایک بجے آ جاؤں گا لینے۔۔۔ اس درخت کے نیچے میرا انتظار کرنا بھی۔“ گیت کے ہائیک طرف گئے بڑے سے پتھل کے درخت کی طرف اشارہ کر کے انہیں سمجھانے کے بعد شاکر حسین نے ہائیک کو گھوڑے کی طرح ایڑ لگا کی اور پلک جھپکنے میں یہ جاوہ جا۔ مسرت جہاں تو جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئیں۔ کالج کی لڑکیاں ابھی آ رہی تھیں۔ وہ بھی ان میں شامل ہو کر کالج کے گیٹ سے اندر داخل ہو گئیں۔ کہاں گورنمنٹ کا ایک سادہ سا مختصری عمارت پر مشتمل سیکنڈری سکول اور کہاں پوسٹ گر بجوائٹ کالج۔ جس بات نے مسرت جہاں کو پریشان کیا وہ یہ بھی کہ کالج میں کو ایجوکیشن سسٹم تھا۔ جگہ جگہ لڑکے لڑکیاں ٹولے بنائے کھڑے اور بیٹھے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ پریشان سی وزیر لابی میں کھڑی دیکھ رہی تھی۔ غالباً اپنے ڈیپارٹمنٹ کے بارے میں عدم معلومات نے انہیں کچھ حواس باختہ کر دیا تھا۔ بمشکل برقع اتار کر تہہ کر کے انہوں نے بڑا سا میرون دوپٹہ چھپی طرح اوڑھ لیا۔ عجیب گاؤدی قسم کے لوگ تھے۔ جنہیں بے چاری مسرت جہاں کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت ہی نہیں تھی۔

”ایکسکوز می مس! کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں؟“ بھاری مردانہ آواز مسرت جہاں کو کچھ پریشان کر گئی۔ انہوں نے بوکھلا کر اپنے سامنے موجود شخصیت کو دیکھا۔ مہذب لب و لہجہ اور سلجھی ہوئی شخصیت۔ مسرت جہاں کے بوکھلانے پر وہ بھی قدرے پیچھے ہٹ کر دیکھنے لگا۔ غالباً اپنی بات کا یہ رد عمل اس کے لیے غیر متوقع تھا۔

”وہ۔۔۔ وہ سائنس ڈیپارٹمنٹ کس طرف ہے؟“ وہ کچھ بکلا کر اپنا مدعا بیان کر گئیں۔ کسی نہ کسی سے تو انہیں پوچھنا ہی تھا۔ اب اس نے اپنی خدمات پیش کیں تو انہوں نے بھی جھٹ سے اپنا مسئلہ بیان کر دیا۔

”آئیے میرے ساتھ۔۔۔“ وہ آہستہ روی سے ان کے آگے آگے چل پڑا۔ مسرت جہاں کی مثال ایسے اندھے کی طرح تھی جسے بالکل انجان جگہ پر لا کر تباہ چھوڑ دیا جائے اور اسے کچھ سمجھائی نہ دے رہا ہو کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑیں۔

سفید براق یونیفارم میں لمبے سیاہ بالوں کی چوٹی گوندھے سادہ سے چہرے کے ساتھ وہ اس وقت ابامیاں کی عدالت میں کھڑی تھی۔

”مسرت جہاں! آج سے آپ کا کالج آنا جانا شروع ہو رہا ہے۔ آپ کو پک اور ڈراپ کرنے کی ذمہ داری ہم نے شاکر حسین کے ذمے لگا دی ہے۔ یہ بتانے کی سروس ہم ضرورت نہیں سمجھتے کہ سکول اور کالج میں انسان پڑھائی کے حصول کے لیے جاتا ہے۔ اس لیے دیگر غیر نصابی سرگرمیوں میں مشغول ہونے کو ہم اچھا نہیں سمجھتے۔ آپ سمجھ رہی ہیں ناں ہم کیا کہنا چاہتے ہیں؟“ شبیر حسین عمیق نگاہی سے مسرت جہاں کے پاکیزہ چہرے کو جانچ رہے تھے۔ شاید وہ نظروں ہی نظروں میں ان کے اعتماد کو ٹول رہے تھے کہ کیا ان کے گھر کی یہ۔۔۔ زمانہ سے انجان کچی اتنی مضبوط ہے کہ گھر کی چار دیواری سے باہر نکل سکے۔

”اجلے کپڑے پہننا مشکل نہیں ہوا کرتا بیٹیا رانی! ان کے اجلے پن کو برقرار رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ آپ گھر سے باہر ضرور جا رہی ہیں لیکن ہر دم اس گھر کی روایات کو اپنے ساتھ رکھیے گا۔ ہم مزید کچھ نہیں کہیں گے۔ تھوڑے کوئی بہت جاوے۔“ ابامیاں نے بات ختم کر کے چائے کی پیالی ہاتھ میں تھام لی۔ اماں بی نے ان کے ہاتھ میں پچاس کا نوٹ تھمایا اور وہ دونوں کو خدا حافظ کہتی ہوئی باہر نکلی آئیں۔ باہر آتے ہی فضا میں یوں گہرا سانس لیا جیسے بڑی دیر سانس روکے کھڑی ہوں۔ اپنے کمرے میں آ کر انہوں نے یونیفارم پر اوڑھنے والا میرون دوپٹہ تہہ کر کے فائل میں رکھا اور برقعہ جسے وہ خیمہ کہا کرتی تھیں اوڑھ کر باہر آ گئیں۔ شاکر حسین اپنی ہائیک چکانے میں مصروف تھا۔

”آگئی چڑیل! تم بھی میری آزادی سلب کرنے کی کوششوں میں لگی رہا کرو۔ آؤ بیٹھو۔“ مسرت جہاں کو اس کی بات سن کر غصہ تو بہت آیا مگر ضبط کر گئیں۔ کہ اگر کچھ کہہ دیتیں تو شاکر حسین نے یہیں سب کچھ بھول بھال کر جھگڑا شروع کر دیتا تھا۔ اور وہ ابامیاں کی عدالت کی وجہ سے پہلے ہی کافی لیٹ ہو چکی تھیں۔ سو چار و ناچار خلاف عادت خاموشی سے ہائیک پر بیٹھ گئیں۔ شاکر حسین ہائیک اشارت کر کے

”آپ غالباً نوائے مشن ہیں؟“ وہ جیسے پرستل تذکرہ پوچھ رہا تھا۔

”جی ہاں!“ مسرت جہاں کے طلق سے مری مری سی آواز برآمد ہوئی۔ انہیں تو اپنا پہلا دن ہی بہت کٹھن لگ رہا تھا اور ابھی تو کئی سال پڑے تھے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

”میں یہاں انگلش ڈیپارٹمنٹ میں فورتحہ ایئر کانسٹوڈنٹ ہوں۔ فرجادیلی نام ہے میرا۔“ وہ اسی طرح ان کے آگے آگے چلتے ہوئے اپنا تعارف بیان کر رہا تھا۔ مسرت جہاں نے کوئی جواب نہ دیا۔ انہیں اس بات سے بھلا کیا دلچسپی ہو سکتی تھی کہ وہ کون ہے کیا کرتا ہے؟ البتہ اس مہربانی پر وہ اس کی شکر گزار تھیں کہ اس کی وجہ سے وہ بھٹکتے رہنے سے بچ گئی تھیں۔

”لیجئے مس! آپ کا ڈیپارٹمنٹ آگیا۔“ وہ جیسے کسی بڑی فتح یا کامیابی کا اعلان کر رہا تھا۔ مسرت جہاں کے چہرے پر اطمینان اور سکون کا رنگ پھیل گیا۔ شاید انہیں خدشہ تھا کہ وہ کہیں ان کی غلط رہنمائی نہ کر رہا ہو لیکن وہ ان کے ارادے کے برخلاف کافی اچھا شخص ثابت ہوا تھا۔

”بہت بہت شکریہ!“ منزل پر پہنچنے ہی ان کے حواس اور اعتماد بحال ہو گیا۔

”اُس اوکے..... ایسی کوئی بات نہیں“ وہ جانے لگا پھر جاتے جاتے جانے کیا یاد آیا کہ پلٹ کر ان کی طرف دیکھا اور وہ جو آگے بڑھنے لگی تھیں اس لیے رک کر اپنی جانب دیکھتا پا کر رک گئیں۔

”میں نے یہ کہنا تھا کہ یہ آپ کے ہمسایہ میں میرا ڈیپارٹمنٹ ہے۔ کسی بھی پریشانی میں آپ بلا جھجک مجھ سے کنسلٹ کر سکتی ہیں۔“ وہ یہ کہہ کر کانٹھیں آگے بڑھ گیا مسرت جہاں بھی اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف بڑھ گئیں۔ باقی کا دن کافی سکون سے گزرا۔ تین چیریدز لگے تھے باقی دن فری گزر گیا۔ مسرت جہاں کے لیے یہ دنیا انوکھی سی تھی۔ رنگین اور شاید کسی حد تک پراسرار بھی۔ وہ اپنی فطری سادگی اور معصومیت کے باعث کسی سے زیادہ کھلی ملی تو نہیں تھیں لیکن انہیں یہ ماحول کچھ عجیب سا ضرور محسوس ہوا تھا۔ کہاں ان کا گھر اتنے خیمہ پوش خواتین جو بازار جانے کو بھی گناہ تصور کرتی تھیں۔ اور کہاں یہ فیش زدہ مغربیت کی دلداد لڑکیاں جو لڑکوں جیسے ڈر بسز زب تن کیے بالوں کو آزادی کے نام پر کٹوا کر عجیب و غریب ہیبت بنائے ہوئے تھیں۔ آزادانہ لڑکوں سے میل جول اور دوستیاں گانٹھ رہی تھیں۔ ”شاید اسی لیے ابامیاں مجھے اجازت نہیں دے رہے تھے۔ وہ تو مرد ہیں ناں باہر کی دنیا سے اچھی طرح واقف شاید انہیں یہ خدشہ ہو کہ میں بھی ان لڑکیوں جیسی ہو جاؤں گی!“ اپنی اس سوچ پر وہ خود ہی ہنس پڑیں۔

”اب ایسی بھی گئی گزری نہیں ہوں جو یوں اوٹ پناٹگ حرکتیں کرنے لگ جاؤں۔ ابامیاں کا خدشہ بے بنیاد تھا میں یہ ضرور ثابت کروں گی۔“ انہوں نے گویا دل میں مہم ارادہ کر لیا۔ کالج آف ہو چکا تھا۔ انہیں درخت کے نیچے کھڑے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ لیکن شا کر حسین کا کہیں کوئی پتا نہیں تھا یہ فرجاد بانیک پر سوار ان کے پاس رک کر انہیں آفر دینے کے بعد جا چکا تھا۔ کالج بھی تقریباً خالی ہو چکا

تھا۔ پہلا ہی دن اور ایسا عجیب و غریب انہیں شا کر حسین پر غصہ آنے لگا تھا۔

”آجائیں ایک دفعہ میں کسی طرح گھر پہنچ جاؤں پھر دیکھنا اماں بی سے دس جوتے نہ پڑوائے تو۔“ سڑک تقریباً سنسان ہو چکی تھی اور اب مارے خوف کے ان کی جان آدھی ہو رہی تھی۔ اور اس سے پہلے کہ وہ بے ہوش ہو کر زمین کا بوسہ لینے کو لپکتیں سامنے سے آتے شا کر حسین کو دیکھ کر ان کی جان میں جان آگئی۔ شا کر حسین نے ان کے بالکل سامنے بانیک روکی۔

”اے! فوت تو نہیں ہوئیں ڈر کے مارے۔“ انہیں خاموش کھڑا دیکھ کر شا کر حسین ان کا کندھا ہلا کر بولا۔ جواب میں انہوں نے ڈبڈباتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ارے ارے! تم تو رونے لگ گئیں۔ سوری بہنا اوقت کا صحیح پتا نہیں تھا۔ میں تو دیکھو ٹھیک ایک بجے پہنچ آیا ہوں اب مجھے کیا پتا کہ کالج ساڑھے بارو بجے آف ہو جائیگا۔ اگر کالج جلدی آف ہو جایا کرے تو وزیٹرز لابی میں میرا انتظار کیا کرنا یہاں نہیں۔“ انہیں بھلا پھلا کر بانیک پر بھا کر شا کر حسین گھر لے آیا۔ لیکن ان کا موڈ کچھ زیادہ اچھا نہیں تھا۔ سومت سرلیٹ کر پڑی رہیں۔ شاید انہیں اس بات کا غصہ تھا کہ پہلا ہی دن گزرا تھا کالج کا اور پریشانیوں میں گھری رہی تھیں۔ مستقبل میں کیا ہونا تھا۔ شام کو سو کر اٹھنے پر البتہ طبیعت بحال تھی۔ نہادھو کر فریش ہو کر وہ باہر صحن میں آگئیں جہاں گھر کی خواتین بیٹھی باتوں میں مصروف تھیں۔ موضوع گفتگو زائدہ بھابی تھیں جو چند روز سے اپنے میکے میں مقیم تھیں۔ باہر بھائی جتنے متمتع اور پردہ دار تھے زائدہ بھابی اسی قدر تیز مزاج تھیں۔ اماں بی اور ابامیاں کے ساتھ تو انہوں نے کبھی جھگڑا نہیں کیا تھا۔ نہ ہی گھر کے دیگر افراد کو ان سے کوئی شکایت تھی۔ لے دے کے بچے تھے باہر بھائی تو ان کے پاس شکوے شکایات کے دفتر کھلے تھے۔ جانے کیا بات تھی دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے محبت کرنے کے باوجود ایک دوسرے کی بات سمجھ نہ پاتے تھے۔ زائدہ بھابی چھوٹی سی بات پر بھڑک اٹھتی تھیں۔ جھگڑا ہمیشہ ان کی وجہ سے طول پکڑتا تھا۔ پھر گھر کا کوئی نہ کوئی مرد بچ بھاؤ کر دیتا تھا۔ لیکن اس بار شاید معاملہ کچھ سنگین نوعیت کا تھا جو وہ فواد اور مہوش کو بھی اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔ اور باہر بھائی بھی اس بار کچھ زیادہ ہی خاموش اور بے پرواہ سے بنے پھر رہے تھے۔

”اماں بی.....!“ مسرت جہاں صحن میں آ کر اماں بی کے قریب رکھی کر سی پر بیٹھ گئیں۔

”کیا بات ہے؟ زائدہ بھابی کہاں ہیں؟ کیا پھر روٹھ کر گئی ہوئی ہیں؟“

”ارے بیٹا! جانتی تو ہو مزاج کی تیز ہے دل کی بری نہیں پر یہ بات باہر کو کون سمجھائے۔ روٹھ کر میکے جا بیٹھی ہے لاکھ کہا بیٹا جا کر لے آؤ۔ اسی مان سامن میں گئی ہوگی کہ میاں منا کر واپس لے آئے گا۔ مگر یہ بھی رٹ لگائے بیٹھا ہے کہ جیسے گئی ہے اسی طرح واپس آ جائے میں لینے نہیں جاؤں گا۔ اور میرا فہدی کے بغیر دل نہیں لگ رہا۔“ اماں بی افسردہ سی تھیں۔

”تو اماں بی! آپ خود جا کر لے آئیں۔“

”ہاں شاید اب مجھے ہی جانا پڑے گا۔ پتہ نہیں زادہ میرے ساتھ آتی بھی ہے یا نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ میں جاؤں اور وہاں سے خالی ہاتھ بھیج دی جاؤں۔ یہ باعزت مجھ سے برداشت نہ ہوگی۔ ایسا نہ ہو کہ میں جاؤں اور وہاں سے خالی ہاتھ بھیج دی جاؤں۔ یہ بے عزتی مجھ سے برداشت نہیں ہوگی۔“

”ارے نہیں اماں بی! زادہ کم سے کم آپ کے ساتھ ایسا رو یہ نہیں رکھے گی۔ مجھے یقین ہے۔“

ہینا بھابی عصر کی نماز سے فارغ ہو کر یہیں آ بیٹھی تھیں ان کی بات سن کر اماں بی نے پڑھ سوچ انداز میں سر ہلا دیا۔ مسرت جہاں جو شا کر حسین کی شکایت کرنے آئی تھیں۔ گھر لو پریشانی میں بھول بھال گئیں۔



”ویسے بھابی فیضی..... آپ نے دیکھی ہے وہ لڑکی جو دو تین دنوں سے یہاں آئی ہوئی ہے یا شاید لائی گئی ہے۔“ حدیقہ کا انداز تسخرانہ تھا۔ فیضی چچی انظر بچا کے لیے ناشتہ تیار کرنے میں مصروف تھیں۔

”ارے حدیقہ! ہمیں کیا کوئی کچھ کرتا پھرے۔ ہماری صحت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ پھر بڑی اماں نے اسے قبول کر لیا۔ بھابی ہینا الگ اس کی طرفدار ہیں۔ بھابی مقسوم کی بھی ساری ہمدردیاں اس کے ساتھ ہیں۔ پھر دیکھنے میں وہ کسی اچھے خاندان کی لڑکی لگتی ہے۔ سلی بھی ہوئی باوقار سی۔“ فیضی چچی نے گویا بات ختم کرنا چاہی۔

”ارے کیوں کوئی کچھ کرتا پھرے۔ بھر پڑے گھر میں ایسے غلط اقدام کی حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہوتا ہے کیا نکل سکتا ہے۔ گھر میں بچیاں بھی ہیں کل کو ان کے ذہنوں پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔ لگتا ہے اس گھر کے کیمینوں کے لیے پہلا جھٹکا نا کافی تھا۔ ماضی میں پیش آنے والے سانچے سے بھی کوئی سبق نہ سیکھا ان لوگوں نے۔“ حدیقہ کی زبان زہرا گل رہی تھی اس کی بچن کے دروازے کی جانب پشت تھی۔ سو وہ جان نہ سکیں کہ ان کا کہا ہوا سن کر اندر آئی اماں بی کا چہرہ کیسے دھواں دھواں ہو گیا تھا۔ وہ لرزرتے قدموں سے واپس چلیں۔ دیوار کا سہارا لیا۔ حوادث زمانہ نے ان کے وجود کو ریت کی دیوار سے بھی زیادہ کمزور کر دیا تھا۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی وہ اپنے کمرے میں آ گئیں۔ ان کی آنکھیں ڈبڈبائے لگیں۔

”اُمی! عمر کی نقدی ختم ہونے میں کیوں نہیں آتی۔ شبیر حسین آپ مجھ سے زیادہ نیک تھے۔ پرہیزگار متھی تھے۔ سوا پر والے نے ذلت کی زندگی سے عزت کی موت دینی بہتر جانی تھی اور میرے لیے اس دنیا میں بس خارزدہ سانس رہ گئے ہیں۔ ہر آتی جاتی بہانس حلق میں نیزے کی انی کی طرح چبھتی ہے۔ زخم زخم وجود لیے کب تک جیوں گی میں۔“ وہ بے آواز رو رہی تھیں۔ کیا ایسا اسم اعظم تھا جو انہیں

اس اذیت سے نجات دلا دیتا۔ ماضی کے دھندلکے ان کی آنکھوں کی پتلیوں پر کالج کے باریک ذروں کی مانند چھ رہے تھے۔ اکھڑی اکھڑی سانس لیتی وہ اپنے بستر پر نیم جاں سی ڈھیر ہو گئیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے کوئی مسافر خاردار راستوں پر آبلہ پا چلتا ہوا اذیت کا بحر بیکراں عبور کر کے جب منزل پر پہنچے تو اسے ہٹا چلے کہ اس کی تو ساری مسافت رائیگاں گئی۔ یہ منزل اس کے لیے تو نہیں تھی۔ اماں بی کی حالت بھی اس وقت ایسے ہی لئے ہوئے مسافر جیسی تھی۔ اپنے لخت، لخت دل کو سنبھالے، زبان پر خاموشی کا قفل لگائے، آنکھیں بند کیے وہ ماضی کی راکھ تخیل کے ہاتھوں سے نولے لگیں۔ یقیناً کوئی پڑگاری تھی جس کی حدت وہ اپنی سوچوں میں محسوس کرتی تھیں۔



موسلا دھار بارش ہو رہی تھی سورج کی تاریخی شعاعوں پر بادل اپنے وجود کی سیاہی طاری کیے جیسے اپنی فتح کا جشن منا رہے تھے۔ پھول پودے نکھر گئے تھے۔ لان کی گھاس تر و تازہ ہو کر پھلے سے زیادہ اچھی لگنے لگی تھی۔ گھر میں آریان، اہیقہ، روبیہ کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ زادہ چچی کی خالہ جو ایک طویل عرصے سے بستر علالت پر تھیں۔ ان کے فوت ہو جانے کی اطلاع پر گھر کے تمام افراد ان کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ وہ پشاور کے قریبی شہر نوشہرہ میں سکونت پذیر تھیں۔ اس لیے روبیہ کا خیال تھا کہ سب کی واپسی کل شام سے پہلے نہیں ہو سکتی۔ البتہ ڈاکٹر فواد ایک ضروری کیس کے سلسلے میں کھینک چھوڑنے پر تیار نہ تھے۔ سو وہ گھر پر ہی رہ گئے۔ یوں بھی کسی نہ کسی مرد کا گھر پر رہنا ضروری تھا۔ روبیہ اپنی جاب سے چھٹی نہیں کر سکتی تھی اور اہیقہ کے لیے اب یوں سال کے آخر میں کالج سے فراغت نصانہ تھا۔

”آریان آپنی! ایسا کرتے ہیں آج ماما کی راج دھانی میں تخریب کاری کرتے ہیں۔“ اہیقہ بڑے پُرجوش انداز میں بولی۔ وہ تینوں اس وقت روبیہ، اہیقہ کے مشترکہ کمرے میں براجمان تھیں۔ صبح کے دس بج رہے تھے۔ ڈاکٹر فواد کھینک جا چکے تھے۔ ماما گھر بھر کی صفائی کر کے اور برتن دھو کر جا چکی تھی۔ اہیقہ، روبیہ اور آریان نے تمام بستر وغیرہ تہہ کیے تھے اور کمروں میں پھیلی چیزوں کو ٹھکانے لگا کر اب اطمینان سے بیٹھی کاجوؤں سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

”کیا مطلب!“ آریان نے سوال کیا۔ روبیہ نے بھی بھنویں اچکا کر اہیقہ کی طرف دیکھا۔

”مطلب یہ کہ اس قدر بوردن یوں بیٹھے بیٹھے گزرے گا نہیں۔ کتابیں پڑھنے کا ابھی وقت نہیں ہوا۔ سو بچن میں جا کر کوئی نیا نوایا، انوکھا، اچھوتا سا کام کیا جائے۔ کوئی انسائیکلش سی ڈس تیار کی جائے۔ کالج کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور وقت بھی گزر جائے گا۔“ اہیقہ نے گویا ایک قیمتی اور مفت مشورہ پیش کیا۔

”پہلی بات تو یہ ڈیز سسٹر کے پڑھنے کا کوئی خاص وقت نہیں ہوتا۔ اور جس قسم کی انسائیکلش ڈس آپ بنائیں گی۔ اگر کالج میں اس سے استفادہ کیا گیا تو نتائج کی ہولناکی کا تصور ہی لرزادینے کے لیے

کافی ہے۔ اور آخری بات یہ کہ ماما کہہ گئی ہیں۔ فریز میں چکن چیز مصالحہ لگا کر رکھے ہوئے ہیں دل چاہے تو وہ تیار کر لینا یا پھر کباب کل لینا۔ روٹی وہ صبح جاتے ہوئے بنا گئی ہیں۔" روبیہ بڑے ٹھنڈے لہجے میں بولتی ہوئی گویا ایقہ کے خانسامی جذبات کا تیا پانچ کر گئی۔

"کبھی ہو ہی نہیں سکتا کہ یہ گھر ترقی کر جائے۔ جس گھر میں مس روبیہ جیسے ڈکٹیٹر ہوں وہاں جمہوریت بے چاری کیا مجال جو دم بھی مار سکے۔" ایقہ کوفت بھرے لہجے میں بولی۔ آریان اب تک خاموش بیٹھی ان کی باہمی گفتگو پر محض مسکرانے پر اکتفا کر رہی تھی لیکن لگ رہا تھا جیسے حسب معمول امن عامہ کے متاثر ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔

"روبیہ کیا ہرج ہے؟ کوشش کرنے دو اسے۔ کرے گی تو سیکھ سکے گی۔" آریان نے ایقہ کی طرف داری کی تو روبیہ خاموش ہو گئی۔ غالباً آریان کی سلجھی ہوئی طبیعت کے باعث اس نے اس سے اختلاف کرنا مناسب نہ سمجھا تھا۔

"ٹھیک ہے، آپلی تم کہتی ہو تو مان لیتے ہیں لیکن ان موصوفہ سے یہ ضرور کہہ دو کہ کچن کا کباز انہیں ہونا چاہئے۔ جو چیز جہاں سے اٹھائے۔ استعمال کے بعد وہیں رکھ دے۔ کیونکہ کام والی ماسی جا چکی ہے اور کاتھ کباز پھیلا کر سینے کی عادت نہیں ہے ان محترمہ میں۔"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ آریان آپلی میرے ساتھ ہی تو ہوگی کچن میں۔ میں پھیلائی جاؤں گی یہ یقینی جائیں گی۔ کیوں آپلی؟" ایقہ شرارت بھرے لہجے میں آریان سے مخاطب ہوئی تو وہ مسکرا دی۔ وہ تینوں ہی کچن میں آئیں۔ ایقہ نے کچن کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ سارے کیبنٹ کھجال ڈالے اور طے یہ پایا کہ کچن جنرل ایقہ تیار کرے گی۔ سلاز اور جیلی بنانے کی ذمہ داری روبیہ کی ٹھہری اور سویت ڈش آریان نے اپنے ذمے لے لی۔ دو گھنٹوں کی محنت کے بعد جب انہوں نے ڈائننگ ٹیبل پر اپنی اپنی تیار کی ہوئی ڈشیں رکھیں تو تینوں ہی کی بھوک چمک اٹھی تھی۔ ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ وہ تینوں میز کے گرد بیٹھ گئیں۔

"کتنا اچھا۔ جو فواد بھائی بھی آجائیں۔" ایقہ پلیٹ اپنے آگے رکھتے ہوئے بولی۔

"تھنک آف داؤ یول اینڈ داؤ یول از ہمیز۔" ڈرائنگ روم کے دروازے سے ڈاکٹر فواد نے جھانکا۔ وہ شاید ابھی آئے تھے اور گھر میں اپنی فیملی کی عدم موجودگی کے باعث ہینا پھپھو کے پورشن کی طرف آگئے تھے۔

"آئیے بھائی۔" ایقہ کے بلانے پر وہ اندر آگئے اور آگے بڑھ کر ایقہ کے دائیں طرف رکھی کرسی تھین کر بیٹھ گئے۔

"گلتا ہے آج کچن کو کسی انارزی کے ہاتھ لگے ہیں۔" خوبصورت سی جی سجائی ٹیبل کو دیکھ کر انہوں

نے سٹائش اور شرارت کا ملا جلا انداز اپنایا۔

"بھائی! یہ غاؤل ہے ابھی آپ نے کوئی ایک ڈش بھی نہیں چکھی۔ رائے کھانے سے پہلے نہیں۔ بعد میں دی جاتی ہے۔ ویسے آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ صرف ایک ہاتھ کا کمال ہے۔" ایقہ بولی۔ "نہیں خیر ہمارے گھر میں ابھی کوئی اس قدر پریکٹیکل بھی نہیں ہوا کہ اتنا کام تباہی منالے۔ ویسے تو میں بھی جانتا ہوں کہ اس ٹیبل پر موجود سب سے مشکل ڈش تم نے ہی بنائی ہوگی۔" فواد ہنوز اسی انداز میں گویا ہوئے۔

"کون سی؟" ایقہ کا تجسس اور اشتیاق دیدنی تھا۔

"یہی۔۔۔۔۔ جیلی۔۔۔۔۔" فواد نے جیلی کے باؤل کی طرف اشارہ کیا۔ ایقہ نے ناراضگی سے ان کی طرف دیکھا۔

"کاش بھائی! آپ مجھ سے چند دن چھوٹے ہوتے۔" وہ دانت کچکچاتے ہوئے بولی۔ "ہوں۔۔۔۔۔ تاکہ ڈرائنگ روم میں رکھے سارے کٹن اور گھر میں موجود سارے جتنے میرے سر مبارک کی مزاج پر سی کر رہے ہوتے۔" انہوں نے کچن جنرل پلیٹ میں نکالتے ہوئے شوٹنگکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"روبیہ۔۔۔۔۔ آپ دونوں نے کیا چپ شاہ کا روزہ رکھا ہوا ہے؟" فواد اب روبیہ اور آریان سے مخاطب تھے۔ ان کی بات سن کر آریان نے قدرے شینا کر ان کی طرف دیکھا تھا۔ انہوں نے بھی مخاطب تو روبیہ کو ہی کیا تھا لیکن ان کی کالی گھور شرارت بھری آنکھیں آریان کے صبیح رخساروں پر ٹکی ہوئی تھیں۔ فواد جیسے اس کے حلق میں اٹکنے لگا۔ اس نے سامنے پڑا پانی کا گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ "روبیہ! تمہاری جاب کیسی جارہی ہے؟" فواد، آریان کو مزید بوکھلانے کی بجائے روبیہ سے بات چیت کرنے لگے۔

"ایکدم فرسٹ کلاس۔۔۔۔۔" اس نے جواب دیا۔

وہ روبیہ اور ایقہ کے ساتھ خوش گپیوں کے درمیان کھانا کھاتے رہے۔ آریان کو انہوں نے مخاطب نہیں کیا۔ اس نے بھی چند نوالوں کے بعد کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ اور سر جھکائے بظاہر اپنے ہاتھوں کے ناخنوں کا جائزہ لے رہی تھی لیکن اس کی توجہ انہی کی باتوں کی طرف تھی۔ کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر رک کر ڈاکٹر فواد تو کھینک چلے گئے۔ جبکہ ایقہ اپنی بیالوجی کی بک اٹھا کر سنڈی روم سدھا رہی۔ روبیہ اور آریان نے مل کر کچن صاف کیا اور کمرے میں آ گئیں۔

"رینی! تم نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟" روبیہ اور وہ بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ روبیہ کے پوچھنے پر آریان کے ہونٹوں پر پھیلی مسکراہٹ معدوم ہو گئی۔ جانے کتنے جتنوں سے تو وہ اس مصنوعی

مسکراہٹ کو ہونٹوں پر سجائے خود کو جبراً خوش ظاہر کرنے کی کوشش کرتی تھی۔

”کیا بتاؤں اپنے بارے میں۔۔۔ بہت سادہ سی کہانی ہے۔ ماں باپ کو دیکھا نہیں۔ ہوش سنبھالتے ہی رشتے کی ایک خالہ کے گھر میں خود کو پایا۔ خالہ نے سگی ماں سے بڑھ کر پیار کیا۔ اور آج سے چند دن پہلے محبت اور خلوص کا وہ واحد سہارا بھی مجھ سے چھین گیا۔ اس بے اماں دنیا میں اپنی زندگی کی چند سانسیں بچانے کی جگہ دو کر رہی ہوں اور بس۔۔۔ اتنی سی داستان ہے میری۔“

”تو کیا خالہ کا اور کوئی رشتہ دار بھی نہیں تھا؟“

”کیوں نہیں تھے۔ بہت سے رشتے داری کے دعویدار پیدا ہو گئے ان کے مرجانے کے بعد۔ اس لیے کہ خالہ کی ساری زندگی کی کمائی تین کمروں کا وہ گھر ہے جو مرتے مرتے وہ میرے نام کر گئیں۔ وہ لوگ اس گھر کی خاطر کسی بھی انتہا تک جاسکتے تھے۔۔۔ یہاں تک میری جان تک لے سکتے تھے۔“

آریان کی بات سن کر روبیہ نے حیرت سے دیکھا۔

”کیا مطلب۔۔۔ کیا انسانی جان اتنی بے وقعت ہوتی ہے۔“

”اس سے بھی کہیں زیادہ۔ ہم انسان مہذب دنیا کے باسی۔ اپنے اندر کے حیوان کو سلائے شرافت کا لبادہ پہنے خود کو پارسیانہ اور ظاہر کرنے کی کوششوں میں لگے رہتے ہیں لیکن جب بھی اندر کا سویا ہوا حیوان جاگ جائے تو یہ مہذب دنیا جنگل کے قانون اور تہذیب سے بھی بے بہرہ گئے لگتی ہے۔ ایک طرف کسی مرتے ہوئے کو خون دے کر بچایا جاتا ہے تو دوسری طرف چند سو روپوں کی خاطر، تھوڑی سی زمین کی خاطر کسی کا خون بہایا جاتا ہے۔“ آریان کے لہجے میں تلخیوں کا زہر گھلا ہوا تھا۔ وہ دونوں ہم عمر تھیں لیکن تجربے میں آریان اس سے کہیں آگے تھی۔ اس نے ٹھوکریں سہی تھیں۔ تلخ حالات کے تجھیڑے برداشت کیے تھے۔ جذبات و احساسات کا خون ہوتے دیکھا تھا۔ جبکہ روبیہ جو ماں کی نرم گرم آغوش میں دہکی ہوئی تھی وہ دنیا کی تلخ اور بظرف حقیقتوں کا مشاہدہ کیسے کر سکتی تھی۔ اس کی سوچ اس گھر، اس گھر کے کمینوں، اپنے سکول اور اپنی جاب سے آگے ہی نہیں جا پائی تھی۔ سو وہ حیرت کا بت بنی آریان کی باتیں سن رہی تھی۔

”رینی! پھر تم نے کیا سوچا ہے؟ اب کیا کرتا ہے؟“

”مجھے سوچا ہے کہ کسی خواتین کی فلاح و بہبود کے ادارے سے رابطہ کروں۔ کوئی چھوٹی موٹی نوکری کر لوں گی۔ زندگی کسی نہ کسی طرح تو گزارنی ہی ہے۔“ آریان کے افسردہ لہجے میں محرومیاں چھ رہی تھیں۔

”پاگل ہو گئی ہو کیا؟ تم ایسا نہیں کر سکتیں۔ بڑی اماں ماما ہم دونوں تمہیں ایسا ہرگز نہیں کرنے دیں گے۔ اس گھر میں جہاں پہلے سے اتنے افراد بس رہے ہیں کیا تمہارا حق لیے جگہ نہیں نکل پائے

گی۔“ روبیہ جذباتی انداز میں بولی تو آریان پھسکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگی۔

”روبی! میں کسی کے لیے بوجھ بننا گوارا نہیں کر سکتی۔ یقین کرو تم سب لوگ بے حد اچھے اور مخلص ہو لیکن میں کیا کروں میرا دل نہیں مانتا کہ میری وجہ سے کسی کو بے جا تکلیف ہو۔“

”رینی! تم نے کیا تکلیف دی ہے ہمیں؟ رینی بات بوجھ بننے کی تو اگر تم زیادہ محسوس کرتی ہو تو میرے ساتھ سکول میں جاب کر لو۔ اچھی سٹری ملے گی۔ تمہارا بہت اچھا گزارا ہو سکے گا۔ لیکن پلیز آئندہ یہ گھر چھوڑنے کی بات مت کرنا۔“ روبیہ کے خلوص پر آریان کی پلٹیں نم ہو گئیں۔ اسے لگا جیسے اوپر والے نے اس کی خاطر کہیں پڑاؤ کا مقام چن لیا ہے۔ اس کی آبلہ زدہ روح کو قیام کا اذن مل گیا ہے۔

”ٹھیک ہے روبی! میں سوچوں گی۔“ وہ کسی گہری سوچ کے زیر اثر ہوئی۔

وقت نے اسے کتنا بے اماں کر دیا تھا۔ کتنا بے وقعت کر دیا تھا۔ اس کی ذات تو اب اس کی نظروں میں شاخ سے ٹوٹے ہوئے زرد خشک پتے سے بھی کہیں زیادہ بے مول ہو گئی تھی۔ زندگی ایک بوجھ کی صورت اس کی دھڑکنوں پر مسلط تھی۔ اور اسے یہ بوجھ اٹھانا تھا۔



پھر روبیہ نے ہی اسے اپنی پرنسپل میسرانسیا اور سکول کے فینجنگ ڈائریکٹر سرفاق سے ملایا۔ ایک مختصر سے انٹرویو سے ہی ان دونوں نے آریان کی قابلیت کا اندازہ لگا لیا۔ ان دنوں میٹھ کی نیچر چھٹی پر تھی سو آریان کو ایذا سے کیٹیچرل نیچر پائنٹ کر لیا گیا۔ آریان کو سکول کا ماحول بہت اچھا لگا۔ ننھے ننھے بچے، پڑھتے لکھتے کھیلتے کودتے دل کو بھلے گتے ہیں۔ آریان نے سوچا۔ کسی نے کتنا سچ کہا ہے۔

”جب دنیا تمہیں بد صورت لگنے لگے تو کسی بچے کو آؤس کریم کھاتے ہوئے دیکھ لو۔“

ان معصوم، زمامت آشنا چہروں کا حسن ہی دنیا کی بد صورتی کو کم کر سکتا ہے۔ اسے پلے گروپ کا انچارج بنایا گیا۔ بڑی کلاسز میں میٹھ کے تین چار پیریز لینے کے علاوہ باقی کا تمام وقت پلے گروپ کے ساتھ گزارتا تھا۔ اصل میں روبیہ بھی پہلے پلے گروپ کی ہی نیچر تھی اور اس نے کہہ کر اسے اپنے ساتھ لگوا دیا تھا۔ آریان کو پرنسپل اور اسٹاف بھی بے مدد اچھا لگا۔

”زندگی اب کچھ سہل ہو جائے گی۔“ اس نے سوچا۔

پھر آنے والے دنوں میں اسے لگا کہ اس کی یہ سوچ کچھ ایسی غلط بھی نہیں تھی۔ دن کا آدھا حصہ سکول میں گزارنے کے بعد گھر پر وہ ہینا پھپھو کا ہاتھ بناتی۔ باقی ماندہ وقت وہ بڑی اماں کے سنگ گزارتی۔ ایٹھ کی طرح بڑی اماں اس کی بھی بہت گہری دوست بن گئیں۔ اسے یہاں رہتے ہوئے تقریباً ایک ماہ ہونے کو تھا لیکن جو اسے یہاں تک لانے کا سبب بنا تھا اس نے تو جیسے بھلائی دیا تھا۔ چند ایک بار کے علاوہ اس نے اس کا حال تک دریافت نہیں کیا تھا۔ شاید وہ مطمئن تھا کہ آریان محفوظ ہاتھوں

میں ہے۔



آج سکول کی چھٹی تھی سو روپیہ، بیٹہ اور آریان تینوں ہمنا پھمو کے ساتھ کام میں لگی ہوئی تھیں۔
ہمنا پھمو کے اپنائیت بھر روپے نے کچھ ہی عرصے میں آریان کو ان کے بہت قریب کر دیا تھا۔ جاب
کے معاملے میں بھی وہ کافی حد تک مطمئن ہو چکی تھی۔ اس نے اپنی اس بے اماں زندگی کے ساتھ بھروسہ
کر لیا تھا۔ شاید اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اس کی حیثیت خشک زرد خزاں رسیدہ پتے جیسی تھی
جانے حالات کے چھینڑے اسے کہاں سے کہاں لے جائیں۔ ابھی کچھ طوفان تھا تھا اس کے پاؤں
زمین پر نکلے ہوئے تھے۔ نگاہ اٹھاتی تو نیلا چھار فلک بھی نظر آتا تھا۔ اور یہی غنیمت تھا۔ اسے زیادہ کی
طلب بھی نہیں تھی۔ چند مہربان مگر نا آشنا چہروں کے سچے دو اپنوں کی بے حسی کو بھلانے کی جگہ دو میں تھی۔
”رینی! آج بازار چلو گی میرے ساتھ؟“ روپیہ ہلے ہوئے کپڑے چھت پر پھیلا کر نیچے آئی تو
لان میں اسے ہزنی بناتے دیکھ کر ادھر ہی آگئی۔

”کیوں؟“ کچھ خاص شاپنگ کرنی ہے۔“ آریان نے پوچھا۔ ابھی دو چار دن پہلے ہی تو ہمنا
پھمو نو شہرہ سے واپسی پر ان تینوں کے لیے کافی کچھ خرید کر لائی تھیں۔
”یار! کل تنخواہ ملی ہے اور جب تک تنخواہ میرے پرس میں پڑی رہے گی مجھے چین نہیں آتا۔ مجھے
ایک ہی دن میں ساری سکاری خرچ کر کے مزہ آتا ہے۔“

”کمال ہے پورے مہینے کی محنت ایک ہی دن میں اکارت۔ افسوس نہیں ہوتا کیا؟“ آریان کو
اس کی بات سن کر حیرت ہوئی تھی۔

”ارے۔ یہی تو عیاشی ہے۔ باقی کا سارا خرچ ماما کے ڈسے۔ ان پیسوں سے صرف میں اپنے
مشاغل کی تسکین کرتی ہوں۔ مثلاً ڈانسس، بکس، سٹنس وغیرہ وغیرہ۔ بہر حال کیا تم نے نہیں چلنا؟
ممکن ہے بازار جا کر تمہیں بھی کچھ نہ کچھ یاد آ جائے خریدنے کے لیے۔“

”ہاں چند ایک چیزیں لینی ہیں میں نے۔ ٹھیک ہے شام میں چلے چلیں گے۔“ آریان
کا جواب سن کر روپیہ اندر کی جانب بڑھ گئی۔

مالی لحاظ سے مستحکم ہونے کے باوجود ہمنا پھمو زیادہ تر کام اپنے ہاتھ سے کرتی تھیں۔ خاص طور
پر کوئٹنگ۔ جبکہ آریان نے دیکھا تھا کہ باقی بچیاں ہر کام ماسیوں کے سپرد کر کے سارا دن فارغ رہتی
ہیں۔ خاص طور پر اسے حدیقہ چچی کے مشاغل بہت عجیب لگتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو بالکل نظر
انداز کر کے وہ کسی پنڈولم کی طرح بازار، سٹنگ سنٹر یا بیونی پارلر کے درمیان چکراتی رہتی تھیں۔ شولڈر
کنٹ سلکی بالوں کے ساتھ خوب فریبی مائل پیکے شلیم جیسی رنگت، والی حدیقہ چچی اسے تو بالکل متاثر نہ کر سکی

تھیں۔ خاص طور پر ان کا دیکھنے کا سٹائل ایسا ہوتا تھا۔ جیسے ان کے سوا ساری دنیا بے وقعت و حقیر ہے۔
آریان کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ ان سے اس کا سامنا کم ہو۔ بلکہ ہو ہی نہ تو زیادہ بہتر ہے۔



بازار کی رونقیں اپنے عروج پر تھیں۔ روپیہ اور وہ دونوں اس وقت فیضان آرکائیڈ میں موجود تھیں۔
روپیہ زور شور سے دکاندار کے ساتھ بھاؤ تاؤ میں مصروف تھی۔ آریان وہاں کھڑی بوریٹ محسوس کرنے
لگی۔ اس کی آنکھیں ارد گرد بکھرے انسانوں کے چہروں کو ٹٹولنے لگیں۔

”کیا یہ سب بے فکرے، مست انسان اسی دنیا میں آباد ہیں۔ یہ جن کے چہروں پر خوشیاں
رنگوں کی صورت بکھری ہوئی تھیں۔ جن کی آنکھیں ہر روز نئے نئے خوابوں کی تعبیریں پا کر آسودہ
اور مطمئن نظر آرہی ہیں۔ یہ دھانی آنکھوں والی لالہالی سی لڑکیاں مجھ سے چھوٹی، کچھ بڑی اور کچھ ہم عمر
ان کے گھر ہوتے ہوں گے۔ گھروں میں بسنے والے ہر رشتے کی آسودگی اور سکون انہیں میسر ہوگا۔ ہر
آرزو کا مل جانا ان کے لیے کوئی مشکل یا ناممکن نہیں تو تو پھر اے اللہ! تیری اس اتنی بڑی دنیا میں میں
کس لیے اکیلی ہوں۔ میری آنکھیں خواب دیکھنے سے کیوں ڈرتی ہیں۔ میں خوشیوں کا لمس
کیوں نہیں پاسکتی۔“ وہ روپیہ کے نزدیک ہی کھڑی تھی لیکن خیالوں کی دنیا میں جانے کہاں سے کہاں پہنچ
چکی تھی۔ اسے کچھ پتا نہیں چلا روپیہ نے کیا خریدا۔ لیکن اچانک اس کی کھوئی ہوئی آنکھوں میں دو ہولے
سے کسی شے کی طرح چھپے تھے اور وہ ہوش کی دنیا میں آگئی۔ بڑے سے گلاس ڈور کے باہر

کے نزدیک کھڑے وہ دو آدمی اس کی آنکھوں کے بالکل سامنے تھے۔ گھنی مونچھوں اور سیاہ کالی۔ سیوں
والے دو دونوں بھاری بھر کم شخص اپنے چہرے اور انداز سے ہی کچھ اور دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے
قدموں سے جیسے زمین ہی نکل گئی۔ اس نے اپنے لرزتے ہوئے ایک ہاتھ سے اپنی چادر کا ایک کونا
غیر محسوس انداز میں اپنے چہرے کے آگے کر لیا اور دوسرے ہاتھ سے روپیہ کا ہاتھ تھام کر اسے اپنی طرف
کھینچا۔ روپیہ نے اس کے ہاتھ کے بغیر ہٹ لٹس کو محسوس کرتے ہوئے اس کی جانب نظر اٹھائی۔ اس کی
آنکھیں کسی وحشت زدہ ہرنی کی طرح سہمی ہوئی تھیں۔ اور رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔

”رینی! کیا بات ہے؟“ روپیہ نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔
”وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔ بس چلو یہاں سے۔“ وہ گھبراہٹ آمیز انداز میں
بولی۔ ان چہروں سے بچ کر چھپ کر کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح ذلتی پھر رہی تھی وہ اور وہ ایک بار پھر
اس کے سامنے آگئے تھے۔

”اچھا ٹھیک ہے تم باہر چلو میں بے منت کر کے آتی ہوں۔“ روپیہ کو وہ واقعی اس وقت ٹھیک
نہیں لگتا تھا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ تم میرے ساتھ ہی چلو۔۔۔۔۔“ آریان نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ اس کی بے قرار نگاہیں ایک بار پھر گلاس ڈور کے باہر جھانکنے کو لگیں۔

”اوکے۔۔۔۔۔ اوکے ٹھیک ہے۔ پھر کبھی کسی۔۔۔۔۔“ روبیہ نے مزید شاپنگ کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے دکاندار کو پے منٹ کی۔ وہ دونوں شخص سبز حیاں اتر کر بازار کی شمالی جانب جا رہے تھے۔ آریان کے سینے میں دلی سانس جیسے بہت دیر بعد باہر نکلنے کا راستہ پاسکی۔ وہ دونوں بھی باہر نکل آئیں۔

”کیا خیال ہے رہنی۔ ایک ایک کپ آگس کریم ہو جائے۔“ روبیہ فریش لکچ میں بولی۔ حقیقتاً تو وہ اس کی موجودہ کیفیت سے کچھ کھٹک سی گئی تھی۔ اس کا خیال یہی تھا کہ آریان وہاں موجود کسی شخص کو دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔ اس نے آریان کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھنا بھی چاہا لیکن اسے کوئی مشکوک شخص دکھائی نہیں دیا تھا۔ بہر حال اس وقت تو وہ بس یہی چاہتی تھی کہ کسی طرح آریان کی طبیعت بحال ہو جائے۔ باقی باتیں بعد میں بھی پوچھی جاسکتی تھیں۔

”نہیں روبی! بس اب گھر چلو۔“ آریان ہنوز بوکھلائی ہوئی تھی۔ روبیہ نے اس کی بات مان لی اور گاڑی گھر کی طرف جانے والے روڈ پر موڑ لی۔ آریان فرنٹ سیٹ پر اس کے قریب خاموش بیٹھی اپنی گود میں دھرے ہاتھوں پر نگاہیں جمائے جانے کس سوچ میں گم تھی۔ روبیہ نے بغور اس کی طرف دیکھا لیکن اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اسی طرح خاموشی سے ڈرائیونگ کرتی ہوئی گھر پہنچ گئی۔ آریان تمام راستے خاموش رہی تھی اور اب بھی خاموشی سے گاڑی سے اتر کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ روبیہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ آخر ایسی کون سی بات تھی جس نے رہنی کو اس قدر ڈسٹرب کر دیا تھا۔ بہت زیادہ باتونی تو وہ پہلے بھی نہیں تھی لیکن جو خوف جو وحشت اس نے آج اس کی ذات میں محسوس کی تھی۔ اس سے پہلے کبھی نہیں کی تھی۔

”بہر حال جو بھی ہے بہت جلد سانسے آجائے گا۔“ روبیہ سوچنے لگی۔



کانچ کا گیت عبور کر کے مسرت جہاں فوزیہ کے ہمراہ لان کی طرف بڑھیں۔ آجکل پڑھائی زوروں پر تھی اور وہ تھی فرسٹ سسٹمز کی تیاری۔ اس لیے تقریباً تمام سٹوڈنٹس ہی غیر حاضری سے اجتناب کر رہے تھے۔ وہ بھی نہایت دلچسپی اور توجہ کے ساتھ اپنے تعلیمی مراحل طے کرنا چاہتی تھی۔ ذہن کو صرف ایک مقام پر مرکوز کر کے وہ اپنی تمام صلاحیتیں بروئے کار لانا چاہتی تھیں۔ فوزیہ سے ایک دو قدم آگے چلتے ہوئے جونکی وہ لان کے بائیں جانب مڑیں ان کی نظر سانسے بیٹھے ہوئے فرجاد سے جا کرائی۔ جوان سے قدرے فاصلے پر اپنے دوستوں کے ہمراہ گھاس پر براجمان تھا۔ انہیں فوزیہ کے سنگ دیکھ کر ایک طمانیت بھری مسکراہٹ اس کے منہ بی لبوں پر ابھر کر معدوم ہو گئی۔ ایک پل کو انہیں یہی لگا تھا جیسے

اس کی منتظر نگاہیں ان کو دیکھتے ہی پڑ سکون ہو گئی تھیں اور اب ان آنکھوں میں انتظار کی بجائے شوق، تجسس اور جانے کون کون سے جذباتوں کی پر جھانپیاں رقصاں تھیں۔ وہ ایک پل کو زوریں ہو گئیں۔ تیزی سے اٹھتے قدم یوں چلنے پڑ گئے۔ جیسے وہ کسی ٹرانس کی کیفیت میں مبتلا ہو گئی ہوں۔ انہوں نے بس ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر نگاہوں کا زاویہ بدل لیا تھا لیکن دل ہی دل میں کتنی سوچوں نے یکدم سر ابھارا۔

پچھلے کئی دنوں سے وہ اس شخص کی معنی خیز نظروں کا سامنا کر رہی تھیں۔ کلاس میں کلاس سے باہر، لان میں، کینٹین میں ہر جگہ جہاں کہیں وہ اس کے سامنے آ جاتیں اس کی نگاہوں کا مرکز بن جاتیں۔ وہ انہیں یوں کھٹکی باندھ کر دیکھتا جیسے پلک جھپکے گا تو مسرت جہاں کسی الوٹن کی طرح غائب ہو جائیں گی۔ اور اس سے وہ دنیا و مافیہا سے بالکل بے نیاز ہو جاتا۔ وہ بھول جاتا کہ وہ اس وقت تنہا نہیں ہے۔ اس کے ارد گرد بہت سے لوگ موجود ہیں مختلف کاموں میں مصروف لوگ لیکن جن کی نظروں سے کچھ چھپ جانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ لیکن اگر وہ اسی طرح اپنے موجودہ رویے پر قائم رہا تو مسرت جہاں کے لیے اس کا لچ میں اپنی رہنمائی برقرار رکھنا مشکل ہو جائے گی۔ اس سوچ کے ذہن میں ابھرتے ہی مسرت جہاں جیسے حواسوں کی دنیا میں آ گئیں۔

”انہیں اس شخص کی حد درجہ حوصلہ شکنی کرنی ہوگی۔ صرف اسی طرح وہ سکون کے ساتھ اپنا تعلیمی کیریئر بنا سکیں گی۔“

انہوں فوزیہ کی طرف دیکھا۔ اپنی سوچوں میں غمن وہ یونہی چلتی ہوئی برآمدے کی سیز میوں تک آ پہنچی تھیں۔ جبکہ فوزیہ کافی فاصلے پر اپنی مشترکہ کلاس فیلو سہیہ سے ہاتوں میں مصروف تھی۔ وہ رکت گئیں اور پلٹ کر فوزیہ کی طرف دیکھنے لگیں۔ سہیہ سے ایک دو منٹ بائیں کرنے کے بعد فوزیہ ان کی طرف بڑھی۔

”تو ہے مسرت! کیا کوئی بھوت دیکھ لیا تھا؟“ فوزیہ ان کے قریب آتے ہوئے بولی۔

”کیوں۔۔۔۔۔“

”تم تو یوں آگے ہی آگے جا رہی تھی جیسے کوئی تمہارے پیچھے لگا ہوا ہو سہیہ کی آواز دینے پر بھی نہیں رکیں۔ خیر تو ہے ناں۔“ فوزیہ گہری نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”وہ۔۔۔۔۔ وہ اصل میں سرایاز کا بیڑہ شروع ہونے میں صرف دو چار منٹ ہی رہ گئے ہیں ان کا پتا تو ہے تمہیں کہ دیر سے آہنے پر سٹوڈنٹ کو کلاس میں گھسنے نہیں دیتے۔“ مسرت جہاں کو جیسے اپنی غائب دماغی اور گھبراہٹ کا معقول جواب مل گیا۔

”سہیہ یہی تو بتا رہی تھی کہ سرایاز تین دن کی لیو پر ہیں۔ سو آج کا سارا دن بے کار گیا اور تمہاری اتنی عجلت بھی بے کار گئی۔“

”تو پھر میرا خیال ہے کہ کلاس روم میں جانے سے بہتر ہے یہیں لان میں بیٹھا جائے۔“ مسرت جہاں نے کہا تو فوزیہ بھی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ان کے ساتھ قدم سے قدم ملائی لان کے نسبتاً الگ تھلگ گوشے کی طرف بڑھ گئی۔ کتابیں گھاس پر ڈھیر کرنے کے بعد وہ دونوں خود بھی بیٹھ گئیں۔

”مسرت میں چند دنوں سے تم میں کوئی تبدیلی دیکھ رہی ہوں۔ یہ تو میں نہیں جانتی کہ وہ تبدیلی مثبت ہے یا منفی لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ تمہیں واقعی طور پر بہت ڈسٹرب کر رہی ہے۔“ فوزیہ بچپن سے لے کر اب تک ان کی واحد دوست تھی اور دوست بھی ایسی جسے مزاج آشنا کہا جائے تو غلط نہ ہوگا اور اس کا یہ تجزیہ بھی کسی حد تک درست تھا کہ وہ چند دنوں سے واقعی ڈسٹرب تھیں۔

”نہیں۔“ مسرت جہاں نے مختصر جواب دیا۔ آج نہیں تو کل یہ بات اس کے علم میں آ ہی جانی تھی۔ پھر اب۔۔۔ اس وقت جبکہ یہ موضوع چھری گیا تھا تو مسرت جہاں نے یہی مناسب سمجھا کہ فوزیہ کو اپنی پریشانی کے بارے میں بتا دیں۔

”کیا وہ پریشانی تم میرے ساتھ شیئر کر دو گی۔ میں یہ نہیں کہتی کہ اس طرح میں تمہاری پریشانی دور کروں گی۔ ہاں شاید اس طرح تم کچھ نہ سکون ہو سکو۔“

”فوزیہ! مجھے فرجاء ملک کا دیکھنا اچھا نہیں لگتا۔“ انہوں نے مصومیت سے اپنی پریشانی کی وجہ بتائی۔

”یہ مطلب؟ کیا وہ خصوصی طور پر تمہیں دیکھتا ہے؟“ فوزیہ مسکراتے لہجے میں بولی۔

”شاید یہ میری غلط فہمی ہو لیکن اس کا مستقل دیکھنا مجھے بہت برا لگتا ہے اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اسے کس طرح روکوں۔ یہ کانٹا ہے یہاں ہم پڑھنے کے لیے آتے ہیں لیکن عجیب بات ہے سنو؟ میں نے کانٹا کو بھی میری ہال سمجھ لیا ہے۔“ مسرت جہاں کے ایک ایک لفظ سے سمجھلاہٹ ظاہر ہو رہی تھی۔ غالباً وہ فرجاء ملک کے اوٹ پٹا رنگ روپے سے تنگ آ چکی تھی۔

”ارے مسرت! کئی ہوتم۔ جانتی ہو فرجاء ملک کانٹا کی لڑکیوں کے لیے ہاٹ ٹیک ہے کتنی ہی لڑکیاں اس کی چاہت کا دم بھرتی ہیں۔ اس کی ایک نظریانے کو جانے کیا کیا جتن کرتی ہیں اور وہ شخص جو اپنا دامن بچاتا رہا ہے زندگی میں شاید پہلی بار کسی کی طرف جھکا ہے۔“

”یعنی تمہارا خیال ہے کہ میں اس کی حوصلہ افزائی کروں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کروں کہ وہ مجھے اس اسکینڈل لازکر کرنے پر عمل گیا ہے۔ شکرانے کے نفل ادا کروں اپنی متوقع بدنامی پر۔“ مسرت جہاں جملے ہوئے انداز میں گویا ہوئیں۔

”کیا بہت برا لگتا ہے تمہیں وہ۔۔۔؟“

”میرا اس سے ایسا کوئی رشتہ نہیں کہ وہ مجھے اچھا یا برے لگے۔ میرے لیے محض وہ ایکس۔وائی۔

زینے ہے۔ مجھے چڑھاتی ہے اس طرح کے لوگوں سے جنہیں اپنے سوا کسی کا خیال نہیں ہوتا۔“

”کیا اس نے کوئی بد تمیزی کی ہے؟“

”نہیں۔۔۔۔۔“

”کیا کبھی اس نے تمہارا راستہ روکا؟“

”ارے نہیں بھئی۔۔۔۔۔“

”کیا تمہاری ذات میں بے جا انوائسٹ کی کوشش کی؟“

”نہیں۔۔۔۔۔“

”تو پھر کس لیے تم اس کی اتنی مخالف ہو۔۔۔۔۔“

”میں نے پہلے بھی تمہیں بتایا ہے کہ بس مجھے اس کا دیکھنا اچھا نہیں لگتا۔“

”اس کے اس طرح دیکھنے سے تمہاری صحت پر کیا اثر پڑتا ہے۔“

”میں نے یہ کب کہا کہ میری صحت متاثر ہوتی ہے لیکن اس طرح میری پوزیشن آگورڈ ہو جائے گی اور مجھے اپنی عزت بہت عزیز ہے۔“ مسرت جہاں گھاس کی پتیاں تو پتے ہوئے پتے انداز میں بوئیں۔

”پتے نہیں مسرت! کیا وجہ ہے جو وہ تمہاری طرف متوجہ ہوا۔ وہ ایک مہذب اور شائستہ اطوار کا مالک لڑکا ہے۔ کم سے کم اس سے اوجھی حرکتوں کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ بہر حال تم اسے ایوانہ کرنے کی کوشش کرو۔“

”تمہارا کیا خیال ہے میرے ایوانہ کرنے سے کیا وہ اپنی حرکتوں سے باز آ جائے گا۔ نہیں فوزیہ اس کی آنکھوں کا جتنی اندازہ نہیں دیکھا تم نے۔ یوں دیکھتا ہے جیسے ساری کائنات کو مسخر کر چکا ہو۔۔۔۔۔ مسرت جہاں اپنی بات مکمل نہ کر سکیں اور اس کی وجہ وہ چیخ تھی جو چند قدم دور بیٹھی لڑکیوں کے گروپ میں سے بلند ہوئی تھی۔ وہ چاروں لڑکیاں سانپ سانپ چلائی ہوئی تیزی سے اٹھ کر ادھر ادھر کو بھاٹیں۔ مسرت جہاں اور فوزیہ یہ بھی اضطرابی انداز میں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ارد گرد کھڑے دوسرے نوٹ بھی اس طرح متوجہ ہو گئے۔ سیاہ کوبرا ریٹنگتے ہوئے لان کے بالکل وسط میں آ گیا تھا۔ اس کے ریٹنگتے میں ایک اضطراب پایا جاتا تھا۔ جیسے وہ کسی منصوبہ جگہ آ گیا ہو۔ جس طرف آگے بڑھتا وہاں موجوداں۔۔۔۔۔ لود کچھ کر اپنا رخ بدل لیتا۔ ابھی تک اس کی کسی حرکت سے یہ اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ کسی کو نقصان پہنچائے گا لیکن جب اسے کسی طرح جانے کا راستہ نہ ملا تو پھر وہ گھاس پر پھن کر بیٹھ گیا۔ وہاں موجود لڑکیوں کے چہروں پر خوف و ہراس کے سائے لرزاں تھے۔ ایک پلی کو ماحول پر سکوت سا طاری ہو گیا۔ پھر لڑکوں کی مردانگی جیسے جوش میں آ گئی۔ کوئی ڈنڈا پکڑنے دوڑا تو کوئی اینٹ اٹھا لایا لیکن کسی میں ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ ایک قدم بھی آگے بڑھاتا۔ سانپ کا نہ صیبت وجود دیکھ کر سب کے حوصلے پست ہو رہے تھے۔ فرجاء نے ایک نظر ان سب کی طرف دیکھا اور آگے بڑھا۔

”ارے فرجاد کو یار... کیا کر رہے ہو۔“ عامر اس کی طرف لپکا۔ فرجاد نے خاموشی سے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا لیکن خود جیسے قدموں سے آگے بڑھتا رہا۔

”فرجاد بغیر کوئی چیز ہاتھ میں لیے یوں آگے مت بڑھو انتہائی خطرناک سانپ ہے ڈس لے گا۔“ یہ روپینہ کی متکثر آواز تھی جو فرجاد کی صرف کلاس فیلو ہی نہیں تھی بلکہ اس کے لیے اپنے دل میں پسندیدگی کے جذبات بھی رکھتی تھی لیکن فرجاد کو جیسے ان سب کی آوازیں سنائی ہی نہیں دے رہی تھیں۔ اس کی ساری توجہ اس سیاہ تاگ پر مرکوز تھی جو اب اس سے محض چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ تاگ کو بھی شاید یہ احساس ہو گیا تھا کہ فرجاد اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس کا چوڑا پھن پھول اور پچک رہا تھا۔ چمکدار آنکھیں فرجاد پر جمی ہوئی تھیں اور اب آہستہ آہستہ اس کا وجود دائیں بائیں حرکت کرنے لگا۔ یوں جیسے وہ اپنے شکار پر جھپٹنے کے لیے خود کو تیار کر رہا ہو۔ سب کی نظریں فرجاد اور سانپ پر تھیں اور سانسیں سینے کے اندر سہم کر جیسے تھم گئی تھیں۔ سرست جہاں کی نظروں میں خوف تھا اور دھڑکنیں کچھ مضطرب سی ہو گئی تھیں۔ فرجاد رک گیا اس کی نظریں تاگ کے چوڑے پھن کو تک رہی تھیں۔ پھر اس نے اپنے دونوں بازو پھیلا لیے۔ پہلے دایاں ہاتھ متحرک ہوا تو سانپ کی پوری توجہ اس کے دائیں ہاتھ کی طرف ہو گئی اس کا پھن گھوم گیا تھا۔ فرجاد نے بہت دیر سے اپنے جسم کو حرکت دی اور اب بایاں ہاتھ سانپ کے قریب سے گزرا۔ سانپ کا رخ ایک بار پھر بدل گیا۔ فرجاد اس کی توجہ اپنے ہاتھوں کی جانب مبذول کرانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ کبھی دائیں اور کبھی بائیں ہاتھ کی حرکت کے ساتھ سانپ بھی تیزی سے رخ بدل رہا تھا۔ اور پھر یکدم ایک کوند سا لپکا تھا۔ ایک ٹانے کا کھیل تھا جو دیکھنے والے کے احاطہ بصارت میں بھی نہ آسکا۔ بجلی کی سی تیزی سے اس کا داہنا ہاتھ حرکت میں آیا اور سانپ کا پھن اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ سانپ کا بقیہ جسم تھلا تے مل کھاتے ہوئے کبھی اس کے بازو سے لپٹ رہا تھا اور کبھی نیچے کو ٹٹک جاتا تھا۔ فرجاد نے ایک نظر اپنے ارد گرد ساکت کھڑے افراد پر ڈالی۔ مسکراتے ہوئے اس نے سانپ کے سر کو ہلکا سا سہلایا اور پھر اسے اسی جگہ چھوڑ دیا جہاں سے پکڑا تھا۔ لڑکیوں کی کھٹی کھٹی جھپٹ سنائی دی تھیں لیکن یہ دیکھ کر سب حیران رہ گئے تھے کہ سانپ نے فرجاد کو ڈسنے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ رینگتا ہوا کالج کی باؤنڈری کی طرف بڑھ گیا تھا۔ سب کے چہروں پر اطمینان پھیل گیا۔ سینوں میں دبی سبھی ہوئی سانسیں سکون آور ہوا کے لمس سے آشنا ہوئیں۔ فرجاد مسکراتے ہوئے عامر کی جانب آ گیا۔

”یار فرجاد! تم نے تو آج حیران کر کے رکھ دیا لیکن یا اس قدر خوفناک قسم کا کوبرا تھا۔ اگر وہ تمہیں ڈس لیتا۔“ عامر کی بات سن کر فرجاد مسکراتے لگا۔ ایک تڑپ سی نظر سرست جہاں پر ڈالتے ہوئے گویا ہوا۔

”ڈسنا اس کی فطرت ہے اس سے مفر نہیں لیکن محبت میں اتنی طاقت ہے کہ اس کے آگے کبھی نہ کبھی کھٹنے پکٹنے پڑ جاتے ہیں۔ وہ مجھے کیوں ڈستا جبکہ میرے ہاتھ کے محبت بھرے لمس سے آشنا ہو چکا

تھا۔“ ایک معنی خیز مسکراہٹ اور اپنی طرف اس کا یوں دیکھنا سرست جہاں کو ایک بار پھر چڑا گیا۔

”یہ شخص مجھے سخت رویے پر مجبور کر کے رہے گا۔“ وہ بڑبڑاتی ہوئی فوزیہ کے ساتھ کلاس روم کی طرف چل دیں۔ باقی کا سارا دن فرجاد ملک انیس دو بارہ نہیں دکھائی دیا تھا غالباً وہ کالج میں تھا ہی نہیں۔ انہوں نے سکون کا سانس لیا۔

اگلے دن کالج میں آتے ہی غیر ارادی طور پر ان کی متلاشی نگاہوں نے وہاں کا جائزہ لیا تھا جہاں وہ ہر روز اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھتا تھا لیکن آج وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ وہ اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف بڑھ گئیں۔ پہلے دو پیریڈز کے بعد باقی کا سارا دن بیکار تھا۔ آج فوزیہ بھی نہیں آئی تھی وہ اکیلی تھیں اور شا کر بھائی نے اپنے ٹائم پر آنا تھا۔ سو بوریت سے بچنے کے لیے انہوں نے سوچا کہ لائبریری میں وقت گزار لیا جائے۔

اس وقت بیشتر سٹوڈنٹس کلاس روم میں تھے جو فوری تھے وہ لان میں جا بجا ٹولیاں بنائے تھیں ہانک رہے تھے۔ وہ نظریں جھکائے برآمدے کی سیر حیاں چڑھ کر لائبریری میں داخل ہو گئیں۔ وسیع و عریض لائبریری اس وقت بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ صرف لائبریرین سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھیں لیکن وہ کافی فاصلے پر تھیں۔ سرست جہاں ابھی ان کی طرف بڑھنے لگی تھیں کہ سامنے رکھے ایک ایک کے عقب سے وہ نکل کر ان کی راہ میں حائل ہو گیا۔ ایک لمبے کوتو وہ اسے اپنے سامنے پا کر بدحواس ہو گئیں۔ گھبرائی ہوئی نظروں سے انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی گہری خاموش نگاہیں ان کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ وہی بے باک نہ محبت آنکھیں جن سے سرست جہاں بچھا چھڑانا چاہتی تھیں۔ وہ کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہتی تھیں اور نہ ہی اسے کرنا چاہتی تھیں۔ وہ محبت جیسی گزری افورڈ نہیں کر سکتی تھیں اور یہ شخص اپنی آنکھوں سے جانے کیا کیا پیغام دینے لگا تھا۔ اور آج ان کی مسلسل خاموشی سے شہر پا کر وہ ان کا راستہ روکنے کی ہمت بھی کر چکا تھا۔ اگر وہ اسے روک نہ پائیں تو آنے والا کل کس قدر بھیانک حقیقتیں لے کر آنے والا تھا وہ اس سوچ سے بھی لرز اٹھی تھیں۔

”رستہ چھوڑیں ہمارا۔“ ایک سرسراتی ہوئی آواز ان کے حلق سے برآمد ہوئی۔ حقیقتاً فرجاد ملک انہیں بہت پریشان کر رہا تھا۔ ان کی بات کے جواب میں بھی فرجاد ملک لٹ سے مس نہیں ہوا۔

”ہم... ہمیں جانے دیں پلیز... آپ کیوں پریشان کر رہے ہیں۔“

”سرست جہاں میں... میں آپ کو پریشان کر رہا ہوں... میں آپ کو پریشان کیوں کروں گا۔ مجھے تو بس آپ کے قیمتی وقت میں سے چند لمحے درکار ہیں۔“

”کس لیے...؟“

”کچھ ڈسکس کرنا ہے آپ سے...“ فرجاد ملک ہنوز مطمئن لہجے میں بولا۔

”میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتی براہ کرم میرا راستہ چھوڑیں۔“ مسرت جہاں نے اپنی اندرونی کیفیت کو چھپاتے ہوئے حتی انداز میں کہا۔

”لیکن میں ضروری سمجھتا ہوں کہ جو احساس آپ سے متعلق میرے دل کے اندر پنپ رہا ہے اس سے آپ کو آگاہ کروں۔ میں نے آج تک کبھی کسی کے بارے میں اس انداز سے نہیں سوچا اور شاید اسی لیے خود داری اور ناتجربہ ہونے کے خیال سے میں نے اتنے دن خود کو روکا لیکن... جذباتوں پر تو کسی کا اختیار نہیں ہوتا ہاں۔“

”پلیز فرجاد صاحب! لفظوں کی حرمت کو ضائع مت کیجئے گا کوئی ایسا مطالبہ کوئی ایسی امید وابستہ مت کیجئے گا جس کا اختیار میرے پاس نہ ہو۔“ مسرت جہاں فرجاد ملک کے ردِ بول پڑیں۔ وہ کچھ کچھ جان گئی تھیں کہ فرجاد ملک کے اگلے جملے کیا ہوں گے۔ اسی لیے انہوں نے اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا لیکن شاید فرجاد ملک کے لیے اپنے محسوسات پر بند باندھنا اب ناممکن ہو گیا تھا۔

”میں مانتا ہوں کہ جذباتوں کو مستحکم کرنا انہیں بے وقعت کر دینے کے مترادف ہے لیکن محبت کے آگے انسان ایک مقام پر اتنا بے بس ہو جاتا ہے کہ اسے جذباتوں کو بھی اظہار کی زبان دینی پڑتی ہے۔ اور آج آپ کے سامنے میں نے اپنے جذباتوں کو بھی اظہار کی زبان دے دی ہے۔ اب یہ آپ کے اختیار میں ہے خواہ ان جذباتوں کو اپنے دل میں ہی رہا کر دیں۔ خواہ ٹھکرا کر بے توقیر کر دیں۔“ لفظ ساتھ چھوڑ گئے تھے یا پھر زبان فرجاد ملک خاموش ہو گیا۔ مسرت جہاں کی ساکت آنکھیں فرجاد ملک کے وجہ سے چہرے پر لگی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں معصوم التجائیں اور محبت کا بچا امید بن کر چمک اٹھا تھا۔ مسرت جہاں کے لیے یہ لمحے جیسے حیرت کا ایک بحر بیکراں تھے ان کے لبوں پر خاموشی کا قفل لگا ہوا تھا اور آنکھیں جھجھک آمیز حیا سے جھکنے لگیں۔

”مسرت جہاں! آج آپ کا کالج میں پہلا دن ہے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ کالج میں پڑھنے کے لیے جاتے ہیں۔ دیگر سرگرمیوں میں شمولیت ہمیں اچھی نہیں لگتی۔ اسے آپ ہماری پہلی اور آخری نصیحت، تنبیہ یا پھر ختم سمجھ لیں کہ اپنے خوابوں کی تکمیل میں ہماری عزت و حرمت کا خون مت شامل کیجئے گا۔ جس بے داغ پوشاک میں ملبوس ہیں آپ اس پر ہم ذلت کا کوئی چیمینٹا نہیں برداشت کر پائیں گے۔“ ایک کوندتا ہوا لہجہ ان کی سماعت کے نہاں گوشوں سے نکلا اور ایک پل کے اندر اندران کا سارا وجود کسی ان دیکھے حصار میں مقید ہو گیا۔ ان کی جھکی ہوئی پلکیں انھیں تو فرجاد ملک ان آنکھوں میں ایک لمحہ نہ جھانک سکا۔ ان کی نرم آنکھیں عجیب سی سختی لیے ہوئے تھیں کہ فرجاد ملک کو لگا ان سنگلاخ چٹانوں جیسی سختی والی آنکھوں کے آگے ان کی آنکھوں میں جتنے دالے خواب کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ بے وقعت ذروں کی طرح ہیں۔

”نہیں فرجاد صاحب! جو راستہ آپ نے منتخب کیا ہے۔ میں اس رستے پر چلتا تو کیا اس کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتی لیکن آپ سے استدعا ہے کہ میری راہ میں اس طرح حائل ہو کر بار بار میرے سامنے آ کر میری شخصیت کو مجروح مت کریں۔“ ان کا لہجہ سخت سی لیکن فرجاد ملک کو ان لفظوں کے پیچھے چھپا خوف نظر آ گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بظاہر پتھر کی طرح سخت نظر آنے والی لڑکیاں موسم سے بھی کہیں زیادہ نرم و نازک ہوتی ہیں۔ حالات کی ہلکی سی تمازت انہیں پگھلانے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ اور مسرت جہاں تو اس کے گلشن دل کا واحد گلاب تھیں۔ وہ یہ کیسے برداشت کر لیتا کہ یہ گلاب مرجھا جائے۔

”مسرت جہاں! آپ یہ سوچ کر خوفزدہ مت ہوں کہ آپ کے انکار کی صورت میں میں کسی قسم کے اوجھے ہتھکنڈوں پر اتر آؤں گا۔ آپ کی عزت و حرمت مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ آپ کو اختیار حاصل ہے اقرار کا بھی، انکار کا بھی لیکن انکار کی صورت میں بس اتنی اجازت مجھے دیجئے گا کہ میں آپ کو دیکھ سکوں۔ یہ یاد رکھیے گا کہ کبھی آپ سے سامنا ہوا تو دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر میری نظریں آپ کے چہرے کا طواف ضرور کریں گی۔ آپ مجھے اس سے مت روکنے گا۔ میں کبھی آپ کے رستے میں نہیں آؤں گا نہ ہی میرے کسی عمل سے آپ کو کسی قسم کی پریشانی ہوگی لیکن ایک بات کا خیال رکھیے گا کہ جب میں آپ کے سامنے آؤں تو ان خوبصورت آنکھوں میں حقارت اور اس صبح پریشانی پر ناگواری کی شکنیں نہ آنے دیجئے گا کہ محبت کرنے والوں کی خود داری مجروح ہوتی ہے۔“ فرجاد ملک اپنی بات کہہ کر رکا نہیں ہوا کہ جھوٹے کی طرح لاہریری کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ مسرت جہاں کی آنکھوں کے سامنے دروازے کا خالی فریم تھا۔ جہاں سے ابھی ابھی وہ گیا تھا۔ انہوں نے گلاس وال کے پیچھے بیٹھی لاہریری کی طرف دیکھا جو اپنے آفیشل کام میں مصروف تھیں وہ بے دم قدموں سے چلتی قرعہ گیری پر ڈھبے لگیں۔ کون سی کتاب اور کہاں کا مطالعہ دماغ کی ساری صلاحیتیں جیسے چوہا پت ہو کر رہ گئی تھیں۔ زندگی کا ایک انوکھا تجربہ ہوا تھا آج انہیں۔ ایک شخص ان سے شدید محبت کا دعویٰ کرتا تھا۔ کیا حقیقی رشتوں کے علاوہ کوئی اجنبی بھی آپ سے اس قدر محبت کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ فی الوقت وہ فرجاد ملک کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے کی ہمت خود میں نہیں پا رہی تھیں۔



”بھابی! اندر آ جاؤں۔“ ہینا بھابی نے کتاب پر سے نگاہ اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔
”سرتی! تمہیں اجازت کی ضرورت کب سے پیش آ گئی۔“ سرت جہاں مسکراتی ہوئی اندر آ گئیں۔

”کیا بات ہے آج نیند نہیں آ رہی۔ کل چھٹی کرنے کا پروگرام تو نہیں؟“ ہینا بھابی نے پوچھا۔
”نہیں چھٹی تو نہیں کر سکتی ایگزامز بالکل سر پر ہیں۔ بس دیسے ہی آپ کے پاس بیٹھنے کو جی چاہ رہا تھا۔“ سرت جہاں ان کے قریب چنگ پر بیٹھ گئیں۔
”یہ عارب بھائی کہاں ہیں؟“

”پتا نہیں سرتی! آج کل رات کو بہت دیر سے آنے لگے ہیں۔ کوئی پتا نہیں کہاں جاتے ہیں۔“
ہینا بھابی آزدہ لہجہ میں بولیں۔

”بھابی! عارب بھائی ایسے کیوں ہو گئے ہیں۔ پہلے تو نہیں تھے وہ اس طرح کے۔“
”ارے چھوڑو تم کیا موضوع لے کر بیٹھ گئیں۔ یہ بتاؤ اسٹڈیز کیسی جارہی ہیں تمہاری؟“
”بالکل ٹھیک۔۔۔۔۔“

”سرت! جانتی ہو تمہارے بھائی نے کتنی مخالفت کی ہے تمہارے کانٹ جانے کی۔ میں آج تک نہیں سمجھ سکی کہ ان کی ایسی سوچ کیوں ہے؟“

”بس بھابی! اپنی اپنی سوچ ہوتی ہے۔ ابا میاں نے بھی بہت مشکل سے اجازت دی ہے۔ اسی لیے تو میری یہی کوشش رہتی ہے کہ انہیں کبھی بھی شکایت کا موقع نہ ملے۔“

”بالکل ٹھیک! تمہارے اس قدم کے بعد اس خاندان کی ساری بیٹیوں کے لیے علم کے راستے کھل جائیں گے۔ تمہارا قابل فخر کردار ہی ان کے راستوں کے کانٹے پنے گا۔ اور سرتی! یقین کرو کہ میں سب سے زیادہ تمہارے حق میں تھی کہ مزید تعلیم حاصل کرنی چاہئے۔ عورت محض فرد واحد نہیں ہوتی نسلیں کی امین ہوتی ہے۔ عورت علم کی روشنی سے بہرہ ور ہوگی تو نسلیں سنور جائیں گی۔“ ہینا بھابی لبرل سوچ کی مالک تھیں۔ عارب بھائی سے یکسر مختلف اور کہیں زیادہ اچھی۔ سرت جہاں کو اپنے گھر میں اماں بی اور ابا میاں کے بعد ہینا بھابی ہی زیادہ لائق محبت و تکریم لگتی تھیں۔ ابھی سرت جہاں ان کی بات کے جواب میں کچھ کہنے لگی تھیں کہ بیرونی دروازہ کھول کر عارب بھائی اندر داخل ہوئے۔ سرت جہاں عارب بھائی کے سامنے زیادہ نہیں ہوتی تھیں کچھ ان کی غصیلی طبیعت اور سخت گیری کے باعث ان سے خائف رہتی تھیں۔ انہیں اندر آتے دیکھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ سلام کیا اور باہر کو قدم بڑھائے۔

”سرت بیٹا! بیٹھو ناں کدھر جا رہی ہو۔۔۔؟“ انہوں نے جیسے رسوا پوچھا تھا۔

”بس بھائی! میں اب جانے ہی والی تھی ایک شٹ کی تیاری کرتا ہے بھابی کے کمرے کی لائٹ

رات قدرے خنکی لیے ہوئے تھی سب ہی اپنے اپنے کمروں میں دیکے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک نظر اماں بی کے کمرے میں جھانکا وہ انہیں عشاء کی نماز میں مشغول دکھائی دیں۔ ابا میاں تین چار دنوں سے شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ ان کے مال بردار نرک کا ایکسٹنٹ ہو گیا تھا اور کافی نقصان بھی ہوا تھا۔ اس لیے وہ اور باہر بھائی دونوں گھر پر موجود نہیں تھے۔ وہ اپنے کمرے میں نہیں جانا چاہتی تھیں۔ تنہائی اس وقت انہیں کسی عفریت کی طرح لگ رہی تھی کہ اگر وہ اپنے کمرے میں چلی گئیں تو شاید وہ عفریت انہیں نکل ہی نہ جائے۔ انہوں نے چادر کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹا اور برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر وسیع و عریض محن میں آ گئیں۔ وہ محن جو دن بھر رونقوں سے بھرپور رہتا تھا اس وقت انتہائی خاموشی اور سنانے کے باعث ویران سا لگ رہا تھا۔ ان کی نظریں آسمان کی جانب اٹھ گئیں۔ اکا دکا بادلوں نے کہیں کہیں ستاروں کے چمکتے چہروں کو ڈھانپ رکھا تھا۔ چاند کی زردی مائل چاندنی کسی مریض کی پھیکی مسکراہٹ کی طرح آسمان پر پھیلی ہوئی تھی۔ خنک ہوائ نے انہیں زیادہ دیر تک محن میں رکھنے نہ دیا۔ بھابی مقسوم اور شفقت بھائی جلد سونے کے عادی تھے اس لیے ان کے پورشن میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ زائدہ بھابی گھر پر موجود نہیں تھیں اور رہیں ہینا بھابی تو ان کے معمولات ہی عجیب تھے۔ سارا دن سوائے اوقات نماز کے وہ کسی نہ کسی گھریلو کام میں مصروف رہتیں اور رات کو بھی دیر تک انہیں مطالعے کی عادت تھی حالانکہ عارب بھائی ان کی اس عادت کو بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ اللہ جانے کیلپات تھی عارب بھابی کی مرضی سے ان کی شادی ہوئی تھی لیکن شادی کے ابتدائی دو سال کے بعد ہینا بھابی کی طرف سے ان کی توجہ بالکل ہٹ گئی۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ بھابی مقسوم تو تھیں ہی بے اولاد اب ہینا بھابی کے ہاں بھی بھی تک کوئی امید کی کرن دکھائی نہیں دی تھی۔ اور کہتے ہیں کہ مرد کو باندھنے والی صرف ایک زنجیر ہوتی ہے اور وہ ہے اولاد۔ اولاد کی خاطر مرد دل سے اتر جانے والی عورت کو بھی برداشت کرتا رہتا ہے۔ سرت جہاں نے ایک نظر ہینا بھابی کے روشن کمرے کی طرف دیکھا اور پھر بلا ارادہ ان کے قدم ان کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ انہوں نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔

جلتی دیکھ کر ادھر آگئی۔" وہ جیسے وہاں اپنی موجودگی کا جواز بتا رہی تھیں۔

"ہاں تمہاری بھابی کو کتابوں، رسالوں کی دنیا زیادہ پسند ہے۔ زندہ انسانوں کی نسبت۔" طہر یہ سالیجہ بیک وقت مسرت جہاں اور ہینا بھابی کو چھٹا تھا لیکن ان میں سے کوئی بولا نہیں۔ ہینا بھابی بستر سے اٹھ گئی تھیں۔ غالباً عارب بھائی کے لیے کھانا لینے اور مسرت جہاں بھی کمرے سے باہر نکل گئی تھیں۔ اپنے کمرے میں داخل ہوئیں تو کافی دیر پہلے کی کیفیت ایک بار پھر وارد ہوگئی۔ کمرے کی ہر چیز اجنبی اجنبی سی لگ رہی تھی۔ اکیلا پن جیسے پوری شدتوں سے ان پر آن وارد ہوا۔ کوئی ہیپہ تھی جو ہولے ہولے پکوں کے درکھٹکنا رہی تھی۔ مسرت جہاں کی آنکھوں میں خیند نہیں تھی۔ صرف چھین تھی۔ نارسائی کی چھین۔ بے بسی کی چھین۔ انہوں نے بارہا اپنے ذہن کے گوشوں سے اسے جھٹکنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی پوری شان سے ان کے ذہن و دل میں براجمان ہو رہا تھا۔

کیا تم نہیں جانتے کبھی کبھی ڈوبنے والے کو سہارا دینے والے خود بھی ڈوب جایا کرتے ہیں۔ یہ محبت۔ یہ جذبہ جو کھلے ہوئے دلوں کو مر جھا دیتا ہے۔ جو سکون میں ڈوبی آنکھوں سے نیندیں غارت کر دیتا ہے۔ کیا نہیں جانتے کہ خواب جب تک آنکھوں کے اندر بچے رہیں سکھ دیتے ہیں لیکن جب ٹوٹتے ہیں تو ان کے بکھرے ہوئے ریزے آنکھوں میں نشتر کی طرح اتر کر بیٹائی چھین لیا کرتے ہیں۔ سکون اچھا نہیں لگتا تمہیں۔ کیوں خود بھی اس خازن میں الجھتے ہو اور میری روح کو بھی اس میں گھسیٹ کر زخمی کرنا چاہتا ہو۔

مسرت جہاں کی بند آنکھوں کے سامنے وہ چہرہ روز روشن کی طرح اپنی آب و تاب لیے ہوئے تھا۔ وہ جتنا اس تصور کو جھٹک رہی تھیں۔ وہ اسی قدر ان کی سوچوں پر مسلط ہوتا جا رہا تھا۔ محبت کے بحر بیکراں میں ان کی کشتی جاں ڈول رہی تھی۔ وہ ڈوبنا نہیں چاہتی تھیں لیکن یوں لگتا تھا جیسے ان کے پیروں کے ساتھ منوں وزنی پتھر بندھے ہوئے ہیں۔ جو انہیں نیچے ہی نیچے پاتال کی طرف لے جا رہے ہیں۔ وہ ہاتھ پاؤں مار رہی تھیں۔ شاید محبت کے اس نادیہ لمس نے انہیں نڈھال کر دیا تھا۔ جن محسوسات سے ان کا معصوم دل آج تک نا آشنا تھا۔ صرف چند لمحوں کی ملاقات میں فرجاد ملک نے انہیں ان محسوسات کی حدت سے روشناس کرا دیا تھا۔

"مسرت جہاں! جس اجلی پوشاک میں آپ ملبوس ہیں ہم اس پر ذلت کا چھینٹا برداشت نہیں کریں گے۔" پُر جلال و جنگ لب و لہجہ جیسے بازگشت بن کر ان کے چاروں طرف گونجا۔ سماعت ممکن الفاظ ان کی روح تک کو لرزائے۔

"لیکن..... لیکن اگر کوئی ہم سے خاموش محبت کرتا ہے تو اس سے ہماری ذلت کیسے ممکن ہے۔" انہوں نے کمزور سا دفاع کیا تھا پتا نہیں اپنا یا فرجاد ملک کا۔

کیا تم جانتی نہیں مسرت جہاں کہ محبت کی دھیمی دھیمی آج جو فرجاد ملک کے دل میں دھک رہی ہے اس کی بہت ہلکی سی حرارت تمہارے دل کو بھی تو چھو رہی ہے۔ کیا تم نہیں جانتی کہ جب چنگاری خشک جھاز یوں پر گرتی ہے تو کیسے بھانجر جلتے ہیں۔ ایسے کہ صرف جھاز یاں ہی نہیں ارد گرد موجود ہر سبز درخت اور گھاس بھی اس کی لپیٹ میں آ جایا کرتی ہے۔ پھر تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ محض فرجاد ملک کی محبت تمہارے لیے ذلت کا باعث نہیں بن سکتی۔ دماغ کے الفاظ کسی کوڑے کی طرح ان کی روح پر پڑے تھے۔ وہ تپ گئیں۔ پھر پھر اب میں کیا کروں۔ کیا فرجاد ملک کو سمجھاؤں۔ اسے روکوں کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے وہ ٹھیک نہیں۔ کیا وہ تمہاری مانے گا؟ تمہارے کہنے سے رک جائے گا؟ اسے پگلی یہ محبت ہے کوئی دو چار منٹ کا سفر نہیں تمام زندگی کی مسافت ہے۔ جب تم اس کی محبت پر ایمان لے آئی ہو تو پھر اقرار کیوں نہیں کرتی۔ کیوں نہیں کہتی کہ تم بھی اسے پسند کرتی ہو۔ دل کا اپنا ہی فیصلہ تھا۔ مسرت جہاں سنانے میں آ گئیں۔

نہیں یہ ٹھیک نہیں ہے یہ غلط ہے۔ وہ جیسے اپنے آپ سے لڑنے لگیں۔ دل اور دماغ کی مسلسل جنگ کا کوئی فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ ان کی آنکھیں بننے لگی تھیں۔ پونے دو دم آلودہ ہو چکے تھے لیکن خیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

کیا میں کانچ چھوڑ دوں.....؟ انہوں نے خود سے سوال کیا۔ لیکن درحقیقت وہ ایسا چاہتی نہیں تھیں۔ "کیوں؟ کانچ کیوں چھوڑ دوں اسے نظر انداز کرو۔ اس کی طرف دیکھنا بھی مت۔ اگر سامنا ہو تو کترا کر گزر جانا یہ سمجھ کر کہ وہ ایک اجنبی ہے محض اجنبی تم اسے جانتی ہی نہیں۔"

"لیکن کیا نظر انداز کر سکو گی تم اسے۔ کیا بھول سکو گی اس شخص کو جس نے پہلی بار زندگی میں پہلی بار تمہارے دروہ پر دستک دی ہے؟" مسرت جہاں کے دل نے ان سے سوال کیا۔

"نہیں۔ شاید شاید میں اسے بھول نہیں سکوں گی۔" ان کا کنوارا دل محبت کی تال پر رقصاں تھا۔ دھڑکنیں بے ترتیب مگر خوبصورت انداز میں رواں تھیں۔ دماغ جیسے ان کے دل کے ہاتھوں مجبور ہو گیا۔ ان کی نگاہوں کے سامنے باب عشق کھلا ہوا تھا۔ خود بخود ان کی نظریں اس دلیز پر جھک گئیں۔ فرجاد ملک کی بے پایاں محبت کے سامنے ان کے دل و دماغ نے ہتھیار ڈال دیئے تھے ہر سوچ، ہر مسئلہ پس پشت ڈال کر سوچوں سے خواب بننے لگیں۔

مسرت جہاں ساری رات سو نہیں سکی تھیں شاید یہی وجہ تھی کہ صبح جب وہ کانچ کے لیے تیار ہوئیں تو ان کی طبیعت میں عجیب سا جو جھل پن تھا۔ ہینا بھابی بھی ان کے چہرے کی طرف دیکھ کر ٹھنک گئیں۔ متورم آنکھیں، جن کے گوشے ہلکا گلابی پن لئے ہوئے تھے اور کچھ کچھ بھیکے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

"مسرتی کیا بات ہے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔" وہ تشویش بھرے انداز میں بولیں۔ "بس بھابی! سر کچھ بھاری بھاری سا ہو رہا تھا۔"

”خدا خواستہ بخار تو نہیں۔“

”نہیں۔“ انہوں نے مختصر سا جواب دیا۔

”سرتی! مجھے تو تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ بہتر تھا آج چھٹی کر لیتی۔“ مہینا بھابی ایسی ہی تھیں ہر ایک کے لیے ہر لمحہ شکر اور محبت بھر ادا رکھنے والی۔

”نہیں بھابی! آج ٹیسٹ ہے بہت ضروری۔ اس لیے جانا پڑے گا۔“ گھر میں بھی تو سکون نہیں ملے گا ناں۔ انہوں نے دل میں سوچا لیکن کہا نہیں۔ شاکر بھائی تیار ہو کر آئے تو ان کے ساتھ کالج آگئیں۔ آج کل فوزیہ بھی نہیں آ رہی تھی۔ کالج میں داخل ہوتے ہی تھوڑا سا میلے پر فرجاد ان کو نظر آ گیا۔ وہ ایک درخت سے ٹپک لگائے تھا کھڑا تھا اور اس کی نظریں بڑی بے قراری سے گیت پر جمی ہوئی تھیں۔ انہیں آتے دیکھ کر وہ جیسے بے سکون ہو گیا تھا۔ سرت جہاں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا تھا اور پھر حسب معمول سر جھکائے اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف بڑھنے لگیں۔

”سرت ایک منٹ بات سنئے۔“ بہت دھیمے انداز میں وہ بولا تھا۔ انہوں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا وہ ان کے بہت نزدیک کھڑا تھا۔ ایک نظر چاروں طرف ڈالی انہیں یہی لگا جیسے ارد گرد موجود سب لوگ ان کی طرف متوجہ ہیں سب لوگوں کی نگاہوں میں ان کے لیے تسخیر ہو چکا ہے۔ ذومعنی نظریں انہیں اپنے چہرے پر چھتی ہوئی محسوس ہوئیں لیکن کل کی طرح آج وہ اسے انکور نہ کر سکیں۔ شاید دل میں کوئی چور بیٹھا تھا۔ جو حکم چلا رہا تھا اور وہ اس کی بات مان کر کچھ نہ بولیں بس ایک لفظ ”جی“ ان کے حلق سے برآمد ہوا۔

”سرت! آپ۔ آپ پریشان دکھائی دے رہی ہیں۔ کیا بات ہے؟“

اس کے لہجے میں اپنے لیے پریشانی محسوس کر کے وہ پہلی بار اس کے سامنے مسکرائی تھیں۔ اور فرجاد ملک دھوپ چھاؤں کا یہ روپ دیکھ کر جیسے بالکل ہی دیوانہ ہوا اٹھا تھا۔ گیلی گیلی جھیل سی آنکھیں اور کلیوں جیسے نازک ہونٹ، آنسوؤں اور مسکراہٹ کا ملا جلا احتجاج۔

”نہیں کوئی پریشانی نہیں ہے۔“ انہوں نے مختصر سا جواب دے کر قدم آگے بڑھانے چاہے۔

”سرت جہاں! کیا آج۔ آپ میرے ساتھ ایک کپ کافی پیئیں گی۔“ ان کی مسکراہٹ اور جواب سے اس کی ہمت بڑھ گئی تھی۔

”کیا اس وقت۔۔۔؟“ وہ کچھ حیرانگی سے بولیں۔

”نہیں۔۔۔ آپ جس وقت کہیں۔“ فرجاد سر جھکا کر بولا۔ سرت جہاں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ بے ریا، نہ ظلوں، محبت بھرا یہ چہرہ، کیا اس کا باطن بھی اتنا ہی بے ریا اور محبت بھرا ہے۔ وہ سر جھکائے ان کے جواب کا منتظر تھا اور وہ اس کے متعلق سوچ رہی تھیں۔

”آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔“ اس نے استفسار کیا۔

”پہلے دوپہر یڈز کے بعد میرے پاس کچھ نام ہے۔ آف ٹائم کے بعد میں کہیں نہیں جاسکتی۔“

وہ کہہ کر آگے بڑھ گئیں۔ دوپہر یڈز گزرنے کے بعد جب وہ اپنے ڈیپارٹمنٹ سے باہر نکلیں تو فرجاد ملک انہیں اپنا منتظر ملا۔ سرت جہاں نے چادر سے اچھی طرح اپنا وجود چھپا رکھا تھا۔ اس کے پیچھے بائیک پر بیٹھتے ہوئے سرت جہاں کے دماغ نے ایک بار پھر احتجاج کیا تھا لیکن دل کے آگے اس کی ایک نہ چل سکی۔ فرجاد ملک بائیک چلا رہا تھا لیکن اسے یوں لگ رہا تھا جیسے آج وہ ہوائوں میں اڑ رہا ہے۔ جس چہرے کے خال و خد نے کچھلی بہت سی راتوں کو اسے فیندے محروم کر رکھا تھا وہ بول شام

ہم راتوں کو اٹھ اٹھ کر جن کے لیے روتے ہیں

وہ اپنے شبستان میں آرام سے سوتے ہیں

کی تفسیر بن گیا تھا۔ جس پیکر کو تراشتے تراشتے اس کی سوچیں اس کا تخیل لہو لہو ہو گیا تھا۔ اس کے بالکل قریب براجمان تھا۔ اس کے وجود کی جھمی جھمی آج فرجاد ملک کے وجود و روح میں سرتوں کی برف پگھلا رہی تھی۔ محبت کی حرارت مل رہی تھی اور اسے یوں لگ رہا تھا جیسے مسد یوں سے وہ نظرتوں کے سرد خانوں میں کراہتا رہا تھا لیکن محبت نے کبھی جھانک نہ دیکھا تھا اور آج۔ آج محبت خود چل کر اس کے پاس آگئی تھی۔ ساری ہنگاموں کا ساری ریاضتوں کا ثمر آج اسے مل گیا تھا پہلے جذبے اس کے من مندر میں جاگے تھے۔ ایک دیوی تھی جس کے چہنوں میں پیکاری کی طرح وہ محبت کے پھول دان کرتا رہا تھا۔ اسے لگا اس کی بھینٹ قبول ہوئی تھی۔ اس سوچ کے ساتھ ہی من میں طلب جاگ اٹھی تھی۔ جس سے محبت کی جاتی ہے اس کو پانے کی آرزو خود، خود دل میں جنم لے لیتی ہے۔ اور آج جب وہ حسین پیکر اس کے انتہائی قریب تھا اس کا دل چاہا یہ سنا ساری زندگی پر محیط ہو جائے۔ یہ مانوس خوشبو جو اس وجود سے اٹھ رہی ہے تمام عمر میں اسی خوشبو کے حصار میں رہوں۔ دھڑکنیں رگ جا میں وقت ختم جائے۔ کائنات ختم ہو جائے لیکن یہ خوشبو مجھ سے دور نہ ہو۔ اور سرت جہاں! ان کی سوچیں ایک الگ ہی منظر میں ابھی ہوئی تھیں۔ جس شخص کے سنگ ہم قدم، ہم سفر رہنے کا انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ ان کے خاندان کے لیے قابل قبول ہوگا۔ پہلے تو انہوں نے ہر طرح خود کو اس راہ پر چلنے سے روکا تھا۔ اور جب وہ اس راہ پر چل پڑی تھیں تو اب جو بھی ہو جانا انہوں نے ایک قدم پیچھے نہیں ہٹا تھا۔ بائیک۔ کئی تو وہ بھی جیسے سوچوں کے بھنور سے نکل آئیں۔ وہ دونوں ایک بہت بڑے ریسٹورانٹ کے سامنے کھڑے تھے۔

”آئیے سرت۔ میرا خیال ہے یہاں قدرے سکون کے ساتھ ایک کپ کافی پی جاسکتی ہے۔“ فرجاد ملک مسکراتے لہجے میں بولا۔ ہٹا نہیں کیا بات تھی آج اسے اپنی روح پر اذیت ہو رہی تھی۔ آزاد لگ رہی تھی۔ وہ سبک روی سے سرت جہاں کے قدم سے قدم ملائے ریسٹورانٹ میں داخل ہوا۔

محبت کا ہمسرا ہونا انسان کو کتنا معتبر اور خود اعتماد بناتا ہے یہ کوئی اس وقت فرجاد ملک کے حسرت آشنا دل سے پوچھتا۔

نسبتاً تاریک گوشے میں رکھے ٹیبل پر وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ فرجاد محبت پاش نظروں سے مسرت جہاں کے صبحی چہرے کو دیکھ رہا تھا اور مسرت جہاں کے رخسار شدت حیا سے تھما رہے تھے۔ ایک انوکھی کسک، انوکھی لذت خیالیں اپنے رگ و پے میں سرایت کرتی محسوس ہو رہی تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ انجانے خدشوں اور واہموں سے ان کا کمزور سادل گھبرا بھی رہا تھا۔

”مسرت کہنے کو تو بہت سی باتیں ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ میرے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں جن کی ادائیگی میرے جذباتوں کے اظہار کو طمانیت بخش سکے۔ تمام الفاظ محض عامیانہ اور سطحی سے لگ رہے ہیں۔ بہر حال میں نہ تو خود الجھنا چاہتا ہوں اور نہ ہی آپ کو الجھانا چاہتا ہوں۔ محبت کے رستوں پر سفر کرنے والوں کو زندگی کا سانچہ بن جانا چاہئے۔ یہ میرا خیال ہے کیا آپ اس سے اتفاق کرتی ہیں؟“

فرجاد مسرت جہاں کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا جو سرائے اس کی بات بہت توجہ سے سن رہی تھیں۔ محبت کو قبول کرنے کا فیصلہ تو سراسر ان کا ذاتی تھا لیکن شریہ۔۔۔ گی چنے کا اختیار ان کے والدین نے انہیں نہیں دیا تھا۔ یہ حق اماں بی اور بابا میاں کا تھا۔

”میں اس بات کا فیصلہ تنہا کیسے کر سکتی ہوں۔ میری زندگی کا فیصلہ اماں بی اور بابا میاں کریں گے۔“ وہ بے سوچ انداز میں بولیں۔

”مسرت جہاں! رشتے زندگی کی خوبصورتی ضرور ہیں لیکن انہیں کمزوری نہیں بنانا چاہئے۔ آپ کی زندگی صرف آپ کی ذاتی ہوتی ہے۔ دوسرے جس طرح اپنی اپنی زندگی جی رہے ہوتے ہیں۔ آپ کو بھی اس کا مکمل اختیار ہونا چاہئے۔ میرا نہیں خیال کہ اپنے بارے میں آپ سے بہتر کوئی آپ کے لیے سوچ سکتا ہے۔“

”لیکن ہمارے ماں باپ بھی تو ہمارے لیے برائیاں سوچتے۔ انہیں زندگی گزارنے کے بعد ایک مستند تجربہ حاصل ہوتا ہے۔ وہ جہاندیدہ ہوتے ہیں۔ پھر وہ ہمیں پال پوس کر بڑا کرتے ہیں محبت، توجہ، سہولتیں فراہم کرتے ہیں۔ کیا ان کا اتنا بھی حق نہیں ہوتا کہ وہ ہماری زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ خود کریں۔“

”مسرت جہاں! شاید اس مسئلے میں آپ سے بحث نہ کر سکوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان رشتوں کا مان، اعتبار، محبت میرے دامن میں نہیں ہے۔ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ میں یہ بات آپ کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے نہیں کہہ رہا۔ الحمد للہ مجھے اپنی زندگی میں کبھی ان کیوں کا احساس بھی نہیں ہوا۔ میں سیلف میڈ انسان ہوں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میری قوت فیصلہ آپ سے کہیں زیادہ ہے۔ رشتوں کی محبتیں انسان کو نہایت بزدل اور کمزور بنا دیتی ہیں۔ انسان ان محبتوں کے کھوجانے کے ذریعے

اپنے آپ کو اذیت میں مبتلا کیے رکھتا ہے لیکن ان رشتوں کی چھاؤں میں رہنا پسند کرتا ہے۔“ فرجاد ان رشتوں سے ناواقف ضرور تھا لیکن ان سے منسلک جذباتوں اور احساسات سے عاری نہیں تھا۔ مسرت جہاں کے سامنے اس نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا سچ بولا تھا کہ وہ سیلف میڈ ہے اس کی زندگی کا کوئی گوشہ کسی اپنے کے زیر بار نہیں ہے۔

”آپ اکیلے ہیں مان لیا لیکن کیا کبھی آپ کو احساس نہیں ہوا کہ اس دنیا میں آپ کے بھی چند اپنے ہوتے۔“ مسرت جہاں کے لہجے میں اس کے لیے عجیب سی نرمی اور منہاس درآئی تھی۔

”نہیں۔۔۔ یقیناً کبھی مسرت جہاں کہ میں نے زندگی کو سیکھ دیکھا ہے۔ ایک روٹی کی خاطر کتوں کی طرح جھڑکتے انسانیت کے علمبردار دیکھے ہیں۔ میرا بچپن فٹ پاتھ کو ماں کی گود سمجھ کر وہیں روتے سوتے جاگتے گزرا۔ پھر کی سل پر سر رکھ کر ماں کی نرم گرم آغوش کا تصور کرنا بھی ایک عیاشی ہے۔ لوگوں کے جوتے صاف کرتے ہوئے جھڑکیاں کھاتے ہوئے کبھی ذہن میں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ آخر میرا کوئی اپنا کیوں نہیں۔ ہاں ذہن میں یہ تصور ابھرتا تھا کہ مجھے بغیر سہارے کے زندگی سمجھ کر جینا ہے۔ اور آج دیکھ لیں۔ آپ کے سامنے ہوں۔ تین کمروں کا فلیٹ میرا ذاتی ہے۔ بہت اعلیٰ نہ کسی لیکن زندگی کی ہر سہولت سے آراستہ ہے۔ میں نے تعلیم بھی اپنے بل بوتے پر حاصل کی۔ اور آج اس قابل ہوں کہ پرنٹنگ مل الائف میں قدم رکھ سکوں۔“ فرجاد کا لہجہ بہت ٹھہرا ہوا اور کسی جھیل کی سطح کی طرح ہلکا سا سکون تھا۔ مسرت جہاں دم بخود اس کی داستان حیات سن رہی تھیں۔ کچھ دیر پہلے کی بوکھلاہٹ اور گھبراہٹ کہیں اڑ چھو ہو چکی تھی۔

”ہاں لیکن اب۔۔۔ اب احساس ہوتا ہے کسی بہت بڑی کمی کا۔ اب دل چاہتا ہے کہ اتنی بڑی دنیا میں ایک، صرف ایک میرا اپنا ہو۔ جسے پانے کے بعد کوئی درد کوئی محرومی میرے قریب نہ آ سکے۔“ فرجاد ملک کی لودیتی آنکھیں مسرت جہاں کو تک رہی تھیں اور پہلی بار انہوں نے اپنے اوپر ناز کیا تھا۔ فرجاد ملک جیسی شخصیت اس جیسا انسان ان کی ہمراہی کے خواب دیکھ رہا تھا۔ کیا تھا ان میں ایسا جو اس کی نظروں کو بھا گیا اور وہ اس کے دل میں اتر گئیں۔ محض کچھ عرصہ ہی تو ہوا تھا انہیں ایک دوسرے سے ملے اور اتنی جلدی محبت اور پھر محبت کے حصول کی خواہش۔

”مسرت جہاں! آپ بھی تو کچھ بولیں اتنی دیر سے میں ہی بولے جا رہا ہوں۔ آپ نے ابھی تک کسی قسم کی رائے نہیں دی۔ کوئی تفصیلی بات نہیں کی اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔“ فرجاد ملک کو جیسے احساس ہوا کہ اتنی دیر سے وہ بس خاموشی سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔

”میں اپنے بارے میں کیا بتاؤں۔ جس پتھر ملی راہ حیات سے نزر کر آپ یہاں اس مقام تک پہنچے ہیں میں اس راستے سے انجان ہوں۔ بچپن سے لے کر اب تک محض محبتیں ہی مجھ میں دیکھی ہیں میں

انہیں اور بھی حسین بنادیا تھا۔ فرجاد بڑی دلچسپی کے ساتھ ان کے چہرے کے خال و خد دیکھ رہا تھا۔

ہر سہرے کا ایک ساحل ہے
بھر کی رات کا کنارہ نہیں
ہو سکے تو نگاہ کر لینا
تم پر کچھ زور تو ہمارا نہیں

عجمیر لہجے میں خوبصورت لفظ ادا کرتا مسرت جہاں کو وہ بہت اپنا سا لگا۔

کیا یہ محبت۔۔۔ یہ ہماری محبت روایتوں کی بھیجٹ چڑھ جائے گی۔ یہ شخص جس کے دامن میں کچھ بھی نہیں سوائے ان الوہی جذبوں کے۔ کیا یہ جذبے بھی اس سے چھن جائیں گے۔؟ نہیں ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ ورنہ۔۔۔ ورنہ یہ کھڑ جائے گا۔ مسرت جہاں کچھ بھی ہو جائے اس شخص کو بکھرنا نہیں چاہئے۔

”مسرت! آپ جو کچھ سوچ رہی ہیں ایسا نہیں ہوگا۔ ہر خدشہ ذہن سے نکال دیں۔ فرجاد ملک اکیلا ضرور ہے لیکن کمزور نہیں۔ میرے جذبے بودے نہیں ہیں کہ صابن کی جھاگ کی طرح بیٹھ جائیں گے۔ میں نے آپ کو اپنا کہا ہے تو زندگی کی آخری سانسوں تک میری وفا میں میرے احساسات صرف آپ کے لیے ہی رہیں گے۔“ فرجاد ملک انہیں خاموش بیٹھے دیکھ کر جانے کیا سمجھا۔

”نہیں مجھے آپ کی محبت پر کوئی شک نہیں لیکن میں یہ سوچ رہی ہوں کہ اگر اس معاملے کی بھٹک بھی ابامیاں یا میرے بھائیوں کو پڑ گئی تو کس قدر خوفناک اور بھیانک صورتحال پیش آئے گی۔ ایک قیامت آجائے گی۔“ مسرت جہاں جیسے جبر جھری لے کر رک گئیں۔

”مسرت! کیا قیامت آجائے گی ایسی باتیں مت سوچیں۔ جب اس راہ پر چل پڑے ہیں تو ہر تکلیف ہر اذیت مل کر کہیں گے۔ ہر طوفان کا مقابلہ کریں گے اس یقین کے ساتھ کہ بالآخر جیت محبت کی ہوتی ہے۔“

”فرجاد مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ آج سے پہلے بھی ایسا نہیں ہوا کہ میں اماں بی اور ابامیاں سے اجازت لیے بغیر گھر سے باہر کہیں نکلی ہوں۔“

”اب گھبراہٹ بھول جائیں۔ کبھی کبھی یوں تنہائی میں ملا کریں گے۔ کالج میں تو وقت نہیں ملتا اور چہ گونیوں کا بھی نشانہ بننا پڑتا ہے۔“

”لیکن فرجاد میرے لیے روز روز آنا ممکن نہیں۔ ہماری فیملی شہر کی معروف فیملیز میں سے ہے۔ سینکڑوں جاننے والے ہیں اگر کسی نے دیکھ لیا تو بہت برا ہوگا۔“ مسرت جہاں کی سوئی ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

”مسرت! یہ سب ایک نہ ایک دن ہوتا ہی ہے۔ آپ کے گھر والوں کو علم نہیں ہوگا تو ہم ایک

نے۔ پانچ بھائیوں کی اکھوتی بہن ہونے کی وجہ سے گھر بھرنے لگا اٹھائے ہیں میرے۔ شاید اسی لیے محرومیوں سے ناواقف ہوں۔“ مسرت جہاں کی نرم نرم آواز فرجاد کی سماعت کو سہلاری تھی۔ یہ آواز کیا ساری زندگی اس کے ارد گرد مندر کی گھنٹیوں کی طرح بجے گی۔ کیا یہ حسن کی دیوی عشق کے حضور سجدہ ریز ہوگی۔ جس نے تمام عمر صرف محبتوں کی رفعت دیکھی ہو جس کے نرم پیچھیلیں قالینوں پر بھی چھل جاتے ہوں۔ جسے کبھی گرم ہوا اس خیال سے نہ چھو پائی ہو کہ کہیں یہ مہکتا پھول مرجھانہ جائے۔ اس کے سنگ پتھریلی زمین پر چل پائے گی۔ اتنی محبتوں کی محور و مرکز محض اس کی محبت پر قناعت کر پائے گی۔ کہیں اس کا اجلا و جولا نہ ہو جائے۔ اس کے میکتے نقوش عوارث زمانہ سے نہ بکڑ جائیں۔ وہ کھوسا گیا۔

”آپ کیا سوچ رہے ہیں۔“ مسرت جہاں بولیں تو جیسے وہ ہوش میں آ گیا۔

”کوئی خاص بات نہیں۔ بس یونہی ایک خیال آ گیا تھا کہ کیا اتنی سہل زندگی گزارنے والی لڑکی میرے ساتھ گزارا کر پائے گی۔ میں خود ترسی کا شکار نہیں ہوں۔ خود پر بھروسہ ہے مجھے کہ میں زندگی کا ہر لمحہ دے سکتا ہوں تمہیں۔ لیکن اس کے لیے کچھ انتظار کرنا پڑے گا۔“ فرجاد ملک اچانک آپ سے تم پر آ گیا اجنبیت کی ایک اور دیوار ریت کی طرح بھر بھری ہو کر ڈھس گئی۔

”میں نے بھی زندگی کو ان مادی چیزوں کی احتیاجات کے پس منظر میں نہیں دیکھا۔ نہ ہی یہ میری کمزوری ہیں۔ میں زندگی کو بہت سادگی سے گزارنے کی قائل ہوں۔“ مسرت جہاں کی بات سن کر فرجاد ملک مسکرا دیا۔ کس خوبصورتی سے انہوں نے اس کے ساتھ کا اقرار کیا تھا کہ انہیں زندگی میں بہت زیادہ کی طلب نہیں ہے۔ وہ مادیت پرست نہیں محبت پرست ہیں اور زندگی گزارنے کی ترجیحات ان کی اپنے ہمعصرین سے مختلف ہیں۔ دینے پھیلنے پر کافی رکھ کر جا چکا تھا۔

”مسرت کافی لے لیں۔“ فرجاد نے ایک۔ کپ ان کے آگے رکھا اور دوسرا اپنے ہاتھ میں تھا ملایا۔

”میرا خیال ہے بہت دیر ہوگئی ہے اب چلنا چاہئے۔“ مسرت جہاں نے گھڑی کی طرف دیکھا جو ساڑھے بارو بج رہی تھی۔ صرف ایک گھنٹہ رہ گیا تھا کالج آف ہونے میں۔ شا کر بھائی کا سوچ کر وہ گھبرا گئیں۔

”کیا بات ہے۔ یوں اچانک۔؟ ابھی کالج آف ہونے میں ایک گھنٹہ باقی ہے آپ فکر مند مت ہوں میں نام پر آپ کو ڈراپ کر دوں گا۔ سکون سے بیٹھ کر کافی پیئیں۔“ فرجاد اطمینان سے بولا۔

”فرجاد! آپ نہیں جانتے کہ۔“

”ایک منٹ۔“ فرجاد نے مسرت جہاں کی بات کاٹ دی۔ ”ایک بار پھر کہیں پہلی بار آپ کے ہونٹوں سے میرا نام لگا ہے۔ پلیز ایک بار پھر کہیں۔“

مسرت جہاں فرجاد کے اس طرح کہنے پر کچھ جھینپ سی گئیں۔ چہرے پر پھیلی شفقت کی سرخی نے

دوسرے کے کیسے ہو سکیں گے؟ بولیں۔۔۔ "فرجاد نے کہا۔ مسرت جہاں کی نظریں نجل کی صاف شفاف سطح پر جمی ہوئی تھیں اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے وہ ننھے کا شکار دکھائی دے رہی تھیں۔

"مسرت! بھروسہ کیا ہے تو اب یقین بھی رکھیں کہ یہ شخص جو آپ کے سامنے کھڑا ہے کم مایہ سہی کم حیثیت سہی لیکن کمتر نہیں ہے۔ اسے اپنے لفظوں کا پاس رکھنا آتا ہے اور اب میرا خیال ہے چلنا چاہئے۔ دیر ہوگئی تو کہیں آپ کے خدشات پہلے ہی دن حقیقت کا روپ نہ دھار لیں۔" آخری بات اس نے مسکراتے ہوئے کہی تھی۔ مسرت جہاں بھی مسکرا دیں وہ انہیں کانچ کے گیت پر ڈراپ کر کے چلا گیا تھا۔ کانچ میں داخل ہو کر وہ وزیٹرز لابی میں جا کر بیٹھ گئیں۔ چند منٹ ہی تو رہ گئے تھے کانچ آف ہونے میں۔ ان کا دل گھبرایا ہوا تھا۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ جب شا کر حسین آئے تو ان سے نگاہیں نہ ملا پائی تھیں۔ شا کر حسین نے کہا بھی کہ کیا بات ہے بی جی! لیکن وہ پھر بھی خاموش رہی تھیں۔ درحقیقت دل عجیب انداز سے دھڑک رہا تھا۔ خوف اور وحشت کے لئے جلتے احتزاج نے ان کے چہرے کو بہت پریشان حال سا بنا دیا تھا۔ اور وہ اپنی کیفیت پر چاہنے کے باوجود قابو نہیں پاسکتی تھیں۔ اور گھر آ کر بھی وہ سب سے یونہی کترائی کترائی پھرتی رہیں لیکن گھر میں کسی کی نظر میں آنا اس لیے بھی مشکل تھا کہ وہ پڑھائی کا بہانا کر کے اپنے کمرے میں پناہ گزین ہوگئی تھیں۔



ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ آسمان کے صاف و شفاف چہرے پر سورج کی الوداعی کرنوں نے ایک نظر نواز سرفی پھیلا دی تھی۔ پرندوں کے غول کے غول ادھر سے ادھر اڑتے پھر رہے تھے۔ دھوپ اب سادات نگر کی دیواروں پر پہنچ چکی تھی۔ حسب معمول لان میں کرسیاں بچھائے گھر کی تمام خواتین خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔ تمام دن میں یہ وقت ایسا ہوتا تھا جب وزراء خانہ داری وہ گھریلو امور بالکل فارغ ہوتی تھیں۔ اکثر ٹھینا پھینچو چائے کا اہتمام کر لیتی تھیں کیونکہ کوکنگ میں وہ گھر بھر کی استاد تھیں۔ مگر بڑی اماں کے بعد۔ یہ اور بات ہے کہ طویل عرصہ ہوا بڑی اماں نے اس عہدے سے ریٹائرمنٹ لے لی تھی۔

آج بھی ٹھینا پھینچو چائے کے ساتھ قہرے سمو سے بنا کر لائی ہوئی تھیں روہیہ اور ہیڈ بھی اپنی عادت کے خواتین کے مجمع میں بیٹھی ہوئی تھیں اور آریان کو بھی ساتھ ہی گھسیٹ لیا تھا۔ موضوع ذکر فواد کی بہن مہوش کی شادی کا تھا۔ جس کے لیے زاہدہ چچی کے بھائی مسعود علی کے لندن پلٹ جانے کا رشتہ آیا ہوا تھا۔ زاہدہ چچی تو بغیر کہے سے ہائی بھرتیس اگر باہر چچا کا ڈرنہ ہوتا۔ انہوں نے فی الحال چپ سادھی ہوئی تھی۔

"اری زاہدہ! وہ تمہارا بھتیجا بھلا لندن میں کیا کرتا ہے۔" بڑی اماں نے اپنے دائیں جانب بیٹھی زاہدہ چچی کو مخاطب کیا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ حدیثہ چچی اس گھر کے سب افراد کو ناپسند کرنے کے باوجود ان کے ساتھ مل بیٹھتیں تھیں اور اس وقت بھی وہ وہیں موجود تھیں۔

"اماں بی! خیر سے بہت بڑی ڈگری لے رکھی ہے اس نے۔ وہیں لندن میں ہی کسی اچھی نوکری پر لگا ہوا ہے۔ شادی کے بعد اپنی مہوش کو بھی ساتھ لے جانے کا خیال ہے اس کا۔" زاہدہ چچی کا جواب سن کر حدیثہ چچی کی آنکھوں میں مسخڑھٹ آیا۔

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے اللہ نصیب اچھے کرے۔" ٹھینا پھینچو خلوص لہجے میں بولیں۔ "بھابی! خیر سے ہمارے فواد میاں بھی تو جوان ہیں ان کے بارے میں کیا سوچا آپ نے؟" حدیثہ چچی نے عجیب سی نظروں سے آریان کی طرف دیکھ کر زاہدہ چچی سے سوال کیا۔

"اس کے بارے میں" میں نے نہیں سوچا اس نے خود سوچنا ہے۔ جب بہتر سمجھے گا کہ دے گا۔ مسئلہ بیٹیوں کا ہوتا ہے۔ خدا عزت پر دے کے ساتھ انہیں اپنے گھر کا کرے۔"

"بالکل! وگرنہ بیٹیاں جب منہ کو آتی ہیں تو خاندان کی عزت خاک میں مل جایا کرتی ہے۔" حدیثہ چچی کا یہ جملہ ایک لمحے کے لیے ساری محفل کو خاموش کر گیا۔ اماں بی کے ہاتھوں میں تھامی تسبیح کے دانے حرکت کرنا بھول گئے۔ ماحول میں یکدم کشیدگی درآئی تھی۔

"چچی یہ بھی عجیب کہا آپ نے منہ کو آنے سے عزت کیسے خاک میں مل جاتی ہے۔ ویسے روہیہ کہتے ہیں آدمی کے چہرے پر عزت صرف ناک ہوتی ہے۔ یعنی جب لڑکیوں کے منہ میں دانت آ جائیں اور وہ مقابل کو ناک پر کانٹے لگ جائیں تو عزت تو خاک میں مل ہی گئی ناں۔" انیڈہ کی بے توقع بات نے جیسے سب کی توجہ مبذول کر دادی تھی۔ چچی حدیثہ چچی کو تاب کھا کر رہ گئیں لیکن بولیں کچھ نہیں۔ "انیڈہ! بدتمیزی نہیں۔" ٹھینا پھینچو نے سرزنش کی۔

"اوہو ماماں میں بدتمیزی کی کیا بات بھلا۔ اماں بی دیکھیں ماما مجھے ڈانٹ رہی ہیں۔" انیڈہ اماں بی کی پشت سے ان کے گلے کے گرد بازو حائل کر کے اپنا چہرہ ان کے چہرے کے قریب لاکر لاڈ سے بولی۔ "ارے ٹھینا بیٹا! ایک ہی تو چہکتی بلبل ہے ہمارے گھر کی اس کو تو نہ روکا کرو۔ یہ بچیاں گھر میں موجود نہ ہوں تو گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔" اماں بی بھی سنبل گئی تھیں۔

"اماں آپ کے لاڈ پیار نے اس لڑکی کو تو شتر بے مہار کر کے رکھ دیا ہے۔ مجال ہے جو کوئی کل سیدھی ہو اس کی۔" ٹھینا پھینچو بظاہر اس کی شکایت کر رہی تھیں لیکن درحقیقت ان کے ایک ایک لفظ میں محبت کا رچاؤ محسوس کر کے ہیڈ مسکرائے گی۔ اسی پل گیت کھلنے کی آواز سنائی دی۔ سب کی نظریں اس سمت اٹھ گئیں۔ سیاہ کرولا بہت دھیمی رفتار سے پورچ میں آ کر رکھی تھی۔

”ہیں فواد اس وقت.....“ زاہدہ چچی نے بلند آواز میں خود کلامی کی۔ باقی سب بھی قدرے حیران ہوئے۔ ڈاکٹر فواد پچھلے تین چار سال سے کلینک چلا رہے تھے لیکن اس وقت وہ اس سے پہلے کبھی نہیں آئے تھے۔ گاڑی کا دروازہ کھلا اور فواد باہر نکلے۔ انہیں دیکھ کر ایک لمحے کو وہاں موجود سب ہی کے دل دھک سے رو گئے۔ پیشانی پر بینڈ تاج اور سفید براق شرٹ پر جابج خون کے دھبے۔ سب کو ان میں بیٹھا دیکھ کر وہ بھی ان کی طرف آنے لگے۔ زاہدہ چچی آگے بڑھ کر ان سے استفسار کرنا چاہتی تھیں لیکن ان کے چہرے پر پچھلے تاثرات نے انہیں قدم روکنے پر مجبور کر دیا۔ ان کے ہونٹوں پر ایک پتھریلی چپ جیسے گڑ کر روئی تھی۔ چٹانوں جیسی سختی اور بھیجنے ہوئے ہونٹوں نے ان کے چہرے کے جاذب نظر نقوش کو بگاڑ دیا تھا۔ ان کی نظروں کا مرکز آریان تھی۔ وہ ایک نلک اس کی طرف دیکھے جا رہے تھے یہ خیال کیے بغیر۔ ان کے ارد گرد بہت سے اور افراد بھی موجود ہیں۔ ان کا ناقابل فہم رویہ سب کو ہی کھٹک رہا تھا۔

”کیا بات ہے فہدی! یہ کیا ہوا؟“ زاہدہ چچی کی بے قرار متاخمہ نہ سکی۔ حالانکہ وہ جانتی تھیں کہ فواد جب اس درجہ شدید کیفیت میں ہوتا ہے تو پھر کسی کی ٹیمیں سنتا۔ عجیب و بھری شخصیت کے مالک تھے وہ انتہائی کول مائینڈڈ، محتاط، ریزرو اور سنجھی ہوئی شخصیت تھی ان کی۔ شاید وہ دور ہی انہیں غصہ آتا تھا اور جب انہیں غصہ آتا تھا تو اس کا رد عمل اس قدر شدید ہوتا تھا کہ گھر کے سب ہی افراد کو کیا اور وہ بے ارادہ لرز اٹھتے تھے اور ان کی اس وقت کی کبھی ہوئی بات کوئی ماننے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ اب بھی زاہدہ چچی کے پوچھنے کے باوجود وہ تو انہوں نے نظروں کا زاویہ بدلا تھا اور نہ ہی ان کے سوال کا جواب دیا تھا۔ الہیہ وہاں موجود سب ہی افراد نے ان کی نظروں کا محور دیکھ لیا تھا۔ آریان اس سچو پکیشن سے گھبرا گئی اور اضطرابی انداز میں کرسی سے اٹھ کھڑی ہو گئی۔

”آپ آپ ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟“ بہت کر کے اس نے پوچھ ہی لیا کہ اس وقت اسے اپنی پوزیشن انتہائی آکورو محسوس ہو رہی تھی۔ فواد کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت اور گرسنگی محسوس کر کے وہ اپنے اندر جیسے کٹ کر رہ گئی تھی، لیکن انہیں تو جیسے احساس تک نہیں تھا کہ اتنا سخت رویہ وہ کتنی بے ضروری ترکی کے ساتھ روا رکھے ہوئے ہیں۔ فواد نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سر جھکانے دونوں ہاتھوں کی اٹھیاں ایک دوسرے میں پھنسا لے یوں کھڑی تھی جیسے اس سے جانے کتنا بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہو۔ پھر اچانک ایک بھونچال سا آگیا تھا۔ کوئی سمجھ ہی نہ پایا کہ کیا ہوا۔ فواد نے آگے بڑھ کر آریان کو کلائی سے پکڑا اور تقریباً گھسیٹنے والے انداز میں پچھو ہینا کے پورشن کی طرف بڑھے۔

”ارے ارے فہدی ایک منٹ ٹھہر و کیا کر رہے ہو.....“ زاہدہ چچی تیزی سے اس کے پیچھے پلٹیں۔

”زاہدہ! رک جاؤ۔“ اماں بی واحد ایسی ہستی تھیں جو اس عجیب و غریب سچو پکیشن میں بھی حواس برقرار رکھے ہوئے تھیں۔ ہینا پچھو، تائی مقسوم، روبیہ، ایقہ حتی کہ حدیقہ چچی بھی بنی دن کھڑی کی کھڑی

روئی تھیں۔

”جانتی ہوتاں کہ غصے کی اس کیفیت اس دورے کے دوران اسے کسی کی تمیز نہیں رہتی۔ بھروسہ رکھو اپنے دودھ پر اور سادات کے خون پر۔ ضرور کچھ غیر معمولی ہوا ہے جو بچے اتنے سخت رویے سے پیش آیا۔ انتظار کرو ابھی پتا چل جائے گا۔“

”اماں بی..... اسے اتنا خیال نہیں آیا یوں سب کے درمیان سے ایک اجنبی لڑکی کو.....“ زاہدہ چچی بات مکمل نہ کر سکیں۔ ان کی آنکھوں میں تذلیل کے احساس سے آنسو آ گئے تھے کہ جس بیٹے کے کردار کی قسمیں کھاتی رہی تھیں آج اس نے بھری محفل میں انہیں شرمندہ کر دیا تھا۔

”نہیں زاہدہ! کوئی غلط اندازہ مت لگاتا۔ کردار کوئی اتنی معمولی چیز نہیں جسے یوں پل بھر میں پرکھ کر فیصلہ صادر کر دیا جائے۔ فہدی میرا خون ہے۔ میرا ایسا بچہ ہے۔ جو بھلا اور پرائق فخر ہے۔“ اماں بی کے چہرے پر اطمینان تھا لیکن وہاں موجود باقی سب خواتین اس غیر متوقع صورتحال سے کسی حد تک برافروختہ ہو رہی تھیں۔

فواد نے کمرے میں داخل ہو کر آریان کو ایک جھٹکے سے سامنے بند کی سمت دھکیلا اور دروازہ بند کر کے چٹنی چڑھا دی۔ آریان کے لیے ان کا یہ رویہ ناقابل فہم اور کسی حد تک ناقابل برداشت تھا۔ وہ بند پکڑی ان کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ وہ اس کے سامنے یوں تن کے کھڑے تھے جیسے وہ بچے کا ارادہ رکھتی ہو۔

”کون ہو تم؟“ کس خاندان سے تعلق ہے تمہارا؟“ بولو۔“ سچ بتاؤ مجھے! کون ہو تم؟“ ایک ایک لفظ چہا چہا کر ادا کرتے ہوئے ان کی وحشت بھری آنکھیں اس کے چہرے کے خال و خد کو منوں رہی تھیں۔

میں..... میں نے بتایا تو تھا کہ.....“ بولکھا ہٹ میں وہ بات مکمل نہ کر سکی۔

”دیکھو..... یہ کہانی انہی کے سامنے دہرائی جن کو پہلے تم یہ کہانی سنا چکی ہو اور جنہوں نے تمہاری اس احمقانہ منطق کو تسلیم کر لیا ہے۔ سچ کیا ہے؟ تمہاری اصلیت کیا ہے؟“ میں جان چکا ہوں لیکن تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں میرے سامنے اب جھوٹ مت بولنا۔“

”میرا..... یقین کریں کہ.....“

”تمہارا یقین کروں یا ان دونوں حرام کے جنوں کا یقین کروں جو آج میرے کلینک پر آئے تھے۔“ فواد نے اس کی بات کاٹتے ہوئے سخت ترش لہجے میں کہا۔

”کک..... کک..... کیا مطلب؟“ کون؟“ آریان بے جان لہجے میں بولی۔

”وہ تمہارے یار جو تمہیں اپنی ملکیت گردانتے ہیں۔ تم روبیہ کے ساتھ بازار گئی تھی وہاں سے وہ تمہارا پیچھا کرتے ہوئے یہاں..... ہمارے گھر تک آ پہنچے۔ اور یہاں سے میرے کلینک کا پتا کر کے آج

وہاں جا پہنچے۔ جانتی ہوان حرام زادوں نے کیا کہا۔ وہ کہتے ہیں کہ تمہیں خاموشی سے ان کے حوالے کر دیا جائے نہیں تو بہت سے مسائل کھڑے ہو جائیں گے ہمارے لیے۔ وہمکیاں دی ہیں انہوں نے مجھے۔ یہ دیکھ رہی ہو۔“ فواد نے اپنی پیشانی کی طرف اشارہ کیا۔

”کلینک میں توڑ پھوڑ کی ہے انہوں نے۔ میرے شاف کے سامنے میری عزت و کوڑی کی کر کے رکھ دی۔ انہوں نے تمہاری قیمت ادا کی ہوئی ہے۔ تو کیسے چھوڑ دیں تمہیں؟ اب بتاؤ کس کا یقین کروں۔ تم نے آج تک اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا لیکن آج تمہیں بتانا ہوگا۔ کون ہو تم؟ کیا اصلیت ہے تمہاری؟ کیا؟ کیا حقیقت کیا ہے تمہاری۔ کوئی بکاؤ چیز ہو تم کہ کوئی بھی تمہاری بولی لگا تا پھرے۔ جیسے ان دونوں نے تمہاری قیمت دی ہوئی ہے۔ کیا؟ کیا قیمت ہے تمہاری بولو؟“

آریان کسی بت کی طرح ساکت بیٹھی ان کے لہجے کی سنگ بازی اپنی جان ناتواں پر سہ رہی تھی اس کے حلق میں آنسوؤں کا گولہ پھنسا ہوا تھا اور آنکھیں یکدم شہر خموشاں کی طرح دیران اور بے صدا نظر آنے لگی تھیں۔

”اب خاموش کیوں بیٹھی ہو۔ کیا صفائی نہیں دوگی؟ کیا رشتہ ہے تمہارا ان دونوں سے۔ کس قسم کے تعلقات رہے ہیں تمہارے ماضی میں ان سے؟“ انہوں نے ایک لمحے کا توقف کیا۔ زہر خند نظروں سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

”اب یوں سر جھکا کر کیا سوچ رہی ہو۔ کیا اس طرح تم اپنی پاک دامنی کا اپنی پارسائی کا یقین دلانا چاہتی ہو؟ کیا اس طرح یقین آجائے گا مجھے؟ دیکھو مجھے سب کچھ سچ بتا دو۔“ فواد کے اصرار کے باوجود جواب میں خاموشی ہی رہی۔

”میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں۔ کیا حقیقت ہے تمہاری؟ کون ہیں وہ؟ کس لیے قیمت ادا کی ہے انہوں نے تمہاری؟“ جواب میں پھر خاموشی۔ فواد اس کی مسلسل خاموشی سے بری طرح جھنجھلا گئے۔

”دیکھو۔ میں پھر کہہ رہا ہوں کہ بتاؤ مجھے۔ اپنی اصلیت بتا دو۔ ایسا نہ ہو کہ میں بھول جاؤں کہ تم عورت ہو۔ اس سے پہلے کہ تم پر میرا ہاتھ اٹھ جائے۔ سب کچھ بتا دو مجھے۔ میں عورت پر ہاتھ اٹھانا اپنی مردانگی کی تذلیل سمجھتا ہوں۔“ اس بار بھی اس نے نہ سراٹھا کر دیکھا تھا اور نہ ہی کوئی جواب دیا تھا۔ فواد کا پارہ انتہا درجے کو چھوٹنے لگا۔

”بھوکو۔“ بکواس کرو اگر اب بھی تم نہ بولیں تو پھر میں ہر لحاظ بھول جاؤں گا۔ میں اپنے گھر میں تمہارا غیظ وجود برداشت نہیں کر سکتا۔ اس سے پہلے کہ تمہارے وجود کی سیاہی میرے خاندان کے اچلے دامن کو اندر کر دے میں تمہارا گلا گھونٹ کر تمہیں یہیں دفن کر دوں گا۔“ ڈاکٹر فواد غصے کی انتہائی کیفیت میں تھے ان کی اس بات کے اختتام پر آریان نے سراٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ اف خدا یا اس وقت اس

کی آنکھوں کا لہو بھر گیا، اس کی بھینچی ہوئی منھیاں اور شدت ضبط سے سرخ پڑتا چہرہ۔ وہ تقریباً چیخ پڑی۔

”آؤ۔۔۔ آگے بڑھو۔۔۔ گلا گھونٹو میرا۔۔۔ دیر کس بات کی ہے؟ کس چیز کا انتظار ہے؟ میں بھی تو دیکھوں ایک مرد کے ہاتھوں میں کتنی طاقت ہوتی ہے۔ میری اصلیت پوچھتے ہو۔ اپنی اصلیت تو جان لو۔ کتنے چہرے ہیں تم مردوں کے، کتنے روپ ہیں، کتنے پرت ہیں تم مردوں کی ذات کے۔ ایک وہ مرد تھا وہ شریف زادہ جس کا گندا خون میری رگوں میں زندگی بن کر دوڑ رہا ہے۔ اور وہ بھی مرد ہیں جو کسی بکاؤ چیز کی طرح میری قیمت لگا رہے ہیں مجھے خریدنا چاہتے ہیں۔ اور اور تم بھی تو مرد ہو جو میرا گلا گھونٹنے کو تیار کھڑے ہو۔ آؤ گھونٹو میرا گلا۔ ختم کر دو مجھے۔ میں تو خود اس زندگی سے تنگ ہوں۔ کب جینا چاہتی ہوں میں تمہارے اس معاشرے میں۔ اس گندے معاشرے میں۔ غلامت کے ذمہ پر زندگی گزارنا گوارا نہیں ہے مجھے۔ خودکشی حرام نہ ہوتی تو میں کب کی زندگی کے اس ناگوار بوجھ سے چھٹکارا پا چکی ہوتی۔ مجبور ہوں زندہ رہنے پر۔ میرے ساتھ ساتھ میری اس مجبوری کا بھی خاتمہ کر دو۔ نجات دلادو مجھے اس عذاب خانے سے۔“ وہ ہڈیانی انداز میں چیخ رہی تھی۔ اس کے چہرے سے وحشت فک رہی تھی۔ اس کے منہ سے الفاظ نہیں آگے کے انکارے جھڑپے تھے۔

”کیا سمجھتے ہو تم مرد لوگ۔ کیا عزت، غیرت، انا، خودداری صرف تمہاری ہی میراث ہے؟ کیا سمجھتے ہو عورت کو کیا صرف نفسانی جذبات کی تسکین کے لیے بنایا گیا ایک کھلونا بھی تم ایک شریف زادے کے روپ میں آتے ہو ایک معصوم اور کچے ذہن کی لڑکی کو اور غلاتے ہو پھر اسے چھوڑ کر جاتے ہو تو پلٹ کر نہیں دیکھتے کہ جسے اکیلا چھوڑ آئے ہو وہ کس حال میں ہے۔ تمہارے ان چند لکھوں کی تسکین کے نتیجے میں مجھ جیسی سیاہ اور بکاؤ چیزیں دنیا میں آتی ہیں۔ پھر تم ایک نقاب اوڑھ کر آتے ہو۔ ایک ناجرا ایک خریدار کے روپ میں اور ہماری بولی لگاتے ہو۔ پھر ایک نئے روپ میں آتے ہو ایک سلجھے ہوئے باشعور انسان کے روپ میں پھر کسی بھڑوے کی دو ہاتھیں بن کر پل بھر میں کسی گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہو اور ہمارا گلا گھونٹنے آ جاتے ہو۔ بتاؤ۔۔۔ پہلے اپنی اصلیت بتاؤ۔ ان میں سے تمہارا اصل روپ کون سا ہے؟ سن لو سید فواد علی شاہ کان کھول کر سن لو۔ میں کوئی بکاؤ چیز نہیں ہوں میری عزت اتنی سستی نہیں جس کی تم لوگ بولیاں لگاتے پھر دو۔ بہت بڑا نام بہت بڑے آدمی ہو تم۔ بہت پیسے ہے تمہارے پاس مگر یہ اپنے ذہن میں بٹھا لو کہ تم جیسے بیسیوں دولت کے شہنشاہ میری عزت کی بولی لگانے اٹھ کھڑے ہوں تو تمہاری سات پشیش تک نیلام ہو جائیں گی مگر میری عزت کی بولی نہیں لگا پاؤ گے۔ اپنی اصلیت تو تم جانتے نہیں۔ میں اپنی اصلیت جانتی ہوں تم بتاؤ تم کیا مننا چاہتے ہو۔ کیا بتاؤں تمہیں؟ یہ کہ میری ماں کو محبت کی کیا سزا ملی؟ یا وہ کوٹھے کی زینت کیسے بنی؟ یا یہ کہ میں ایک طوائف زادی ہوں۔ ہاں! میں کوٹھے

پہ پیدا ہوئی ہوں۔ میں ہوں طوائف زادی۔ میں طوائف زادی ہوں۔ اپنی عزت بچانے کے لیے وہاں سے بھاگ کر آئی ہوں اور دو کوڑی کی ہو کر رہ گئی ہوں۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ اپنی عزت کو محفوظ رکھنا چاہتی ہوں۔ اگر خود کو نیلام ہو جانے دیا ہوتا۔ خود کو بدمعوس کے حوالے کر دیتی تو آؤ مجھے نو چو کھو نو تو تم جیسے غیر مند اور عزت بردار میرے کمرے چاٹ رہے ہوتے۔ بات کرتے ہو عزت اور غیرت کی۔ ان لفظوں کے تقدس اور عظمت سے آشنائی بھی ہے تمہیں۔ نواب علی شاہ! تم ایک مرد ہو مگر زمانے کو میں نے تم سے زیادہ دیکھا ہے۔ حالات کے تھینے اور وقت کی ٹھوکریں تم سے زیادہ کھائی ہیں۔ تم ان لوگوں میں سے ہو جو آنکھوں پر بنیاد پرستی کا چشمہ لگا کر دنیا کو دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ جن کے نزدیک حقیقت اور اصلیت اچھا اور برا ویسی کچھ ہے۔ جو ماں باپ نے گھٹی کی طرح تمہارے دماغ میں ڈالا ہے۔ یا اخلاق کی کتابوں میں پڑھا۔ مگر میں نے میں نے دنیا کو ورق ورق پڑھا ہے۔ وقت کو استودانا ہے۔ اچھے برے اور صحیح غلط کی تمیز مجھے تم سے زیادہ ہے۔ تم مرد لوگ جو شہروں میں اپنے گلی کوچوں میں شرافت اور عزت کا ڈھنڈورا پیٹتے ہو، کوٹھے اور طوائف کے نام پر تو بہ کرتے ہوئے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہو۔ کبھی یہ جاننے یہ سوچنے کی کوشش کی ہے کہ آج تک کوٹھے کیوں آباد ہیں۔ صرف تم لوگوں کی وجہ سے۔ کوٹھوں کے دروازے پر اتر کر مردوں کو دعائیں دیتے ہیں جن کے دم قدم سے ان میں رونق رہتی ہے۔ کوٹھوں اور طوائفوں سے اتنی ہی نفرت ہے تو یہ سب کچھ کر دینے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ بتاؤ مجھے۔ بتاؤ مجھے کسی ایک ایسے مرد کا۔ جس نے بھی اس نیت سے کسی طوائف کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے بہن کہا ہو کہ میں اسے اس خلافت کی دلدل سے نکال کر اسے عزت بخشوں۔ کسی کو جینی کہا ہو یا بیوی بنا کر عزت کا ساٹھا بخشا ہو۔ جب ایسا نہیں ہوگا۔ تمام مرد اپنی ہوس کی بھوک منانے کے لیے کوٹھوں پر جائیں گے تو کوٹھے تو سودا آباد رہیں گے۔ کوئی اور مخلوق تو نہیں اترے گی۔ بتاؤ۔ سید نواب علی۔ دنیا کی کوئی عورت ہے جو شوق سے کوٹھے پر بیٹھنا پسند کرے گی۔ دنیا میں ایسی بے شمار عورتیں ہیں جن کے سر پر باپ کا سایہ نہیں ہوتا جنہیں بھائی کا مان نہیں نصیب ہوتا۔ پیٹ کا ایندھن بھرنے کو انہیں گھر کی چار دیواری سے نکلنا پڑتا ہے۔ ان کی قابلیت کو بعد میں دیکھا جاتا ہے پہلے ان کے جسموں کو۔ دو ہزار کی نوکری دیتے ہوئے جان جاتی ہے مگر ایک رات کے میں ہزار بھی دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ ایسی مجبور اور لاچار عورتوں کو تم جیسے عزت دار اور غیرت مند کوٹھوں کا رستہ دکھاتے ہیں۔ آریاں بولی تو جیسے صدیوں کے غبار کو باہر نکلنے کا راستہ مل گیا۔ لفظوں کی صورت جیسے زہر اگل رہی تھی۔ اسے خود احساس نہیں تھا کہ وحشت اور جنون کی اس کیفیت میں وہ کیا بولے جا رہی ہے۔ اور ڈاکٹر نواز تو جیسے من ہو کر رہ گئے تھے۔ انہیں احساس ہو رہا تھا کہ بلا سوچے سمجھے بغیر تصدیق کے محض دوسروں کے منہ سے چند باتیں سن کر کس قدر ناروا رویہ انہوں نے آریاں کے ساتھ اپنایا۔ اور کیسے سخت

ترش الفاظ کہہ دیئے تھے۔ وہ اپنی جگہ ساکت و مبہوت کھڑے سن رہے تھے اور آریاں بے تکان بولے چلی جا رہی تھی۔

”کوٹھے نہ بولے گردانے جاتے ہیں شاہ صاحب! کوٹھے والوں کو بھی کوئی اچھا نہیں سمجھتا۔ مگر ایسے اچھوں سے کوٹھے والے بہت اچھے بہت باعظمت ہوتے ہیں۔ آپ کی دنیا میں اخلاقیات اور آداب کے پیکر چلتے ہیں مگر ان کی گردان کرنے والوں کو اخلاق و آداب کی تمیز نہیں ہوتی۔ یہ تو کب کب توڑ چکے ہیں اخلاق و آداب کی روایات کو صرف کوٹھے زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ کبھی کسی کوٹھے پر جا کر بے عزت بے غیرت بے حیا اور ان اخلاق باختہ لوگوں سے مل کر دیکھئے گا آپ کو پتا چلے گا کہ اخلاق کیا ہوتے ہیں؟ آداب کیا ہوتے ہیں؟ آپ کی دنیا میں بے شمار سفید پوشوں کے ایسے گھرانے ہیں جو کوٹھوں سے بدتر ہیں۔ کوٹھے والوں کے تو پھر بھی کچھ اصول کچھ ضابطے ہوتے ہیں۔ مگر ایسے لوگوں نے تو انسانیت کو نسخ کر کے رکھ دیا ہے۔ رشتوں کے تقدس کو پامال کر کے رکھ دیا ہے۔ آریاں خاموش ہو گئی۔ اس کی خوبصورت آنکھوں سے آنسو آتش کی مانند رواں تھے۔ اسے احساس تک نہیں تھا کہ وہ اتنی دیر میں کیا کچھ بول گئی تھی۔ بے ربط لفظ اس کے اندر سے کیا نکلے تھے جیسے اس کے سینے پر دھرا ہوا جوہر کم ہو گیا تھا۔ وہ حواسوں میں آ گئی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا ڈاکٹر نواز بالکل ساکت کھڑے خاموش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے اس نے محسوس کیا کہ پچھلے کئی لمحوں سے وہ اسی طرح اس کی بے لگئی باتیں خاموشی اور توجہ سے سن رہے تھے۔ ایک دوپل وہ خاموش رہی کہ شاید وہ کچھ بولیں لیکن وہ یونہی چپ رہے۔ اس نے سر جھکا کر اپنی گود میں دھرے ہاتھوں پر نظریں مرکوز کر دیں اور پھر سلسلہ کلام وہیں سے جواز جہاں سے ٹوٹا تھا۔

”میں نے جب آنکھ کھولی تو ہر بچے کی طرح میرے کانوں میں اللہ اکبر کی صدا کہیں نہیں گونجی تھیں میری سماعت طبیلے کی تھاپ اور گھٹنگھڑوں کی جھنکار سے مانوس ہوئی۔ مجھے آپ کی طرح پالنے میں لیٹ کر ماں کی لوری سن کر سونا نصیب نہیں ہوا۔ طبیلے کی آوازیں میرے لیے لوری کا کام کرتی رہیں۔ میں بچپن میں کھلونوں سے نہیں کھیلی۔ کبھی کھلونے نصیب ہی نہیں ہوئے نوٹے ہوئے گھٹنگھڑوں کے ساتھ کھیلتی تھی میں۔ پھر امی نے مجھے واجبی سی تعلیم خود دی اور پھر کوٹھا قبیلے سے ہارائشی مول لے کر مجھے اسکول میں داخل کروا دیا۔ اس لیے کہ میری ماں کوئی طوائف نہیں تھیں وہ بھی پڑھی لکھی ہوئی خاندانی عورت تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ میں اس ماحول میں بس جاؤں سوانہوں نے مجھے پڑھایا لکھایا۔ گھٹنگھڑا بابا نے ہمارا بہت ساتھ دیا۔ ماں مجھ سے مل نہیں سکتی تھی لیکن میرا خیال پھر بھی رکھا جاتا تھا۔ گھٹنگھڑا بابا ہر دس پندرہ دن بعد آتے تو ماں کا خط بھی ان کے ہمراہ ہوتا۔ میری تمام ضرورتوں کا خیال رکھا جاتا تھا۔ ماں کے خط میں میرے لیے تسلی و تشفی ہوتی وہ مجھے ہمیشہ اپنی طرف سے مطمئن کرتی

تھیں کہ وہ بالکل ٹھیک ہیں میں ان کی فکر نہ کروں اور خوب توجہ سے دل لگا کر پڑھوں لیکن میں جانتی تھی کہ امی دینی طور پر بہت پریشان رہتی ہوں گی۔ پھر بی۔ اے کے ہیچر دینے کے بعد ماں کی یاد شدت سے دل میں جاگی تو میں خود کو روک نہ پائی اور ان سے ملنے چلی گئی لیکن اس کے بعد مجھے کالج جانا نصیب نہیں ہوا۔ بڑی نائیکہ نے جو جانے کب سے مجھ پر نگاہ رکھے بیٹھی تھی۔ مجھے کوٹھے کے ماحول اور اس کے رنگ میں رنگنا چاہا۔ مجھے مجبور کیا جانے لگا اس غلیظ دھندے پر جس سے بچانے کی خاطر ماں نے میری جدائی کا بن باس کاٹا تھا۔ ہم دونوں کے انکار نے انہیں مشتعل کر دیا۔ مجھ سے زیادہ تشدد میری ماں نے خود پر سہا۔ کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ لیکن نائیکہ نے چھپ کر میرا سودا کر دیا۔ میرے ساتھ دو اور لڑکیاں تھیں۔ ہمیں وہاں چھوڑنے کے لیے ان دو آدمیوں کے علاوہ جو آپ سے ملے تھے گھر واپس بھی ہمارے ساتھ جا رہے تھے اور موقع دیکھ کر انہوں نے مجھے بھگا دیا۔ اس دن میں انہی کے چنگل سے نکل کر بھاگی تھی اور آپ کی گاڑی کے سامنے آ گئی۔ میری بد قسمتی کہ میں بچ گئی کاش سر چکی ہوتی کم سے کم آپ کے لیے تو ذلت کا باعث نہ بنتی اور پھر میرے تھکے واپس۔ میں ان کی طرف سے بھی بہت فکر مند ہوں اگر یہ راز کھل گیا کہ مجھے انہوں نے فرار میں مدد دی ہے تو خدا جانے وہ بھیڑیے ان کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔

”آریان دھیمے لہجے میں بولی۔ آنسو اب بھی اس کی چلوں کی حدیں عبور کر کے اس کے رخساروں کو بھٹو رہے تھے۔ کمرے کی فضا میں ایک بوجھل سی خاموشی در آئی۔ ایسی بوجھل خاموشی ایسا سکوت جس کے نیچے دھڑکنیں بھی دبی دبی سہمی سہمی محسوس ہونے لگیں۔ وہ گھنٹوں میں سردیے بیٹھی تھی۔ منتظر ڈاکٹر فواد کی طرف سے کسی بات کی منتظر۔

”آریان..... آئی ایم سوری مجھے معاف کر دیں کہ میں نے بنا سوچے سمجھے آپ کے ساتھ اس قدر رنج روئے رکھا۔ آئی ایم ایکسٹریملی دیری سوری۔ بہت دیر بعد خاموش فضا میں ڈاکٹر فواد کی جھجکتی ہوئی آواز نے ارتعاش پیدا کیا۔ آریان نے گھنٹوں پر سے سرائی کر ان کی طرف دیکھا۔ کیا کچھ تھا اس کی بے خواب نظروں میں رنج، ملال، شکوے، مان کے ٹوٹ جانے پر کرچی کرچی ہوتا یقین، توقعات کی ناکامی کا کرب۔ بس ایک نظر کے بعد اس نے پھر سر جھکا لیا تھا۔ لیکن وہ ایک نظر ڈاکٹر فواد کو ان کی اپنی نظروں میں شرمندہ کر گئی۔ ان کا دل اپنے زشتہ روئے پر انہیں بری طرح ملامت کرنے لگا اور آریان! کوئی اس سے پوچھتا کہ کیا محض رگی سا ایک معذرتی لفظ ان زخموں کا مداوا کر سکتا ہے جو فواد کے کبے لختوں سے اس کی روح پر نقش ہو گئے تھے۔

”میں جانتا ہوں کہ معذرت اور معافی کا یہ لفظ بہت رگی اور چھوٹا محسوس ہوتا ہے لیکن میں واقعی شرمندہ ہوں۔ آج تک میں نے جانے انجانے میں کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا لیکن آج اس گناہ کا مرتکب ہو گیا ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جس بات سے دل کو دکھ پہنچنے انسان اسے کبھی نہیں بھول سکتا لیکن

میں آپ سے یہی کہوں گا کہ آپ کی اعلیٰ ظرفی ہوگی اگر میرے کہے الفاظ پر مجھے معاف کر دیں۔“ ڈاکٹر فواد سخت شرمندہ تھے کہ بنا سوچے بنا تصدیق کیے انہوں نے اس کو اس حد تک ملامت کیا۔ اس کی نسوانیت کی توہین کر دی۔ ان کی باتوں کے جواب میں بھی اس نے سرائی کر نہ دیکھا تھا اور نہ ہی کوئی بات کی تھی کمرے میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی تھی بس آریان کی دھیمی دھیمی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر اسے اپنے پیروں پر نرم گرم لمس محسوس ہوا۔ اس نے سرائی کر دیکھا تو ایک پل کو جیسے اسے زوردار جھٹکا لگا اسے لگا جیسے بجلی کی ٹنگی تاریں اس کے پیروں سے چھو گئی ہوں۔ ڈاکٹر فواد کے ہاتھ اپنے پیروں پر دیکھ کر ایک جھٹکے سے وہ پیچھے و سرک گئی تھی۔ آنکھوں میں حیرت تھی اور روئے میں ہچکچاہٹ۔

”یہ..... یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟“

”میں جانتا ہوں آریان کہ میرا جرم بہت بڑا ہے ایک باہمیست اور مریم جیسی پاک دامن یا کردار لڑکی کے لیے کس قدر اذیت کا باعث ہے کہ اس کی کردار کشی کی جائے لیکن پھر بھی میں معافی مانگتا ہوں۔ اگر ہو سکے تو میرا یہ جرم معاف کر دیں۔“

”نہیں فواد صاحب! آپ نے جو چھوہا۔ ٹھیک ہی کہا۔ مجھے جیسی لڑکی کو بھلا عزت دار گھر اسے میں رہنا کہاں زیب دیتا ہے۔ میں تو بہت پہلے ہی یہاں سے جانا چاہتی تھی لیکن سب کے محبت بھرے روئے میرے زخمی پیروں کی زنجیر بن گئے۔ حرماں نصیب ہوں ناں۔ تری ہوئی ہوں محبت کو۔ سو چا چلو زندگی کے چاروں محبت کے گھونٹ مل رہے ہیں تو پانی لو۔ کچھ تشنگی تو دور ہوگی۔ کچھ پیاس تو کم ہوگی۔ لیکن اب میرا خیال ہے کہ اس سے پہلے میرا وجود یہاں رہنے والوں کے لیے توہین کا باعث بنے۔ مگر یہاں سے چلی جاؤں گی۔“ آریان ٹوٹے ہوئے لہجے میں گویا ہوئی۔

”دیکھیے آریان! میں پہلے ہی بہت شرمندہ ہوں۔ آپ سے معافی کا خواستگار ہوں۔ پلیز مجھے اور شرمندہ مت کریں۔“ ڈاکٹر فواد کے چہرے پر پشیمانی کی تحریر واضح لکھی نظر آ رہی تھی۔

”نہیں ڈاکٹر صاحب! مجھ جیسی لڑکی کے لیے آپ شرمندہ نہ ہوں آپ نے سوری کیا میں نے مان لیا لیکن میں اب یہاں رک نہیں سکتی۔“

”کیوں؟“ وہ اتنا ہی کہہ پائے۔

”اس لیے کہ میں مزید اپنی بے عزتی نہیں کرنا سکتی۔ اس سے بہتر یہی سمجھتی ہوں کہ چلی جاؤں۔“

”آریان! اس کا مطلب یہ ہے آپ نے دل سے مجھے معاف نہیں کیا۔“

”نہیں ایسی بات نہیں۔“

”تو پھر کیا ہے جو آپ یہاں سے جانا چاہتی ہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ آپ یہاں سے مت جائیں۔“

”کیا کوئی اور بات رہ گئی ہے۔ کچھ باقی ہے ابھی۔“ آریان کی بھیگی آنکھوں کا سوال ڈاکٹر فواد کو

لا جواب کر گیا۔

"میں یہاں رگ کر سب کی نظروں سے گرنے نہیں چاہتی۔ جن آنکھوں میں کل تک میرے لیے چار تھا احترام تھا ان آنکھوں میں اپنے لیے نفرت نہیں دیکھ پاؤں گی میں۔ میں اب مزید کسی عدالت کے آگے جواب دو ہونا نہیں چاہتی۔"

"نہیں آریان! اگر میں یہ کہوں کہ آپ کو کسی سوال کا کسی تحقیق بھری نگاہ کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا تو تو کیا تب بھی آپ کا یہی فیصلہ ہوگا جواب ہے؟"

"جتنے افراد کے درمیان سے آپ مجھے گھسیٹ کر لائے ہیں آپ کیا سمجھتے ہیں آپ کی اس حرکت کو وہ شخص مذاق سمجھ کر نظر انداز کر دیں گے۔ نہیں فواد صاحب! ایسا نہیں ہوگا ان سب کے ذہنوں میں میرے لیے شکوک و شبہات آپ نے خود پیدا کر دیے ہیں۔"

"آریان! یہ میرا ہینڈک ہے۔ میں نے معافے کو ابھرایا ہے تو سلجھاؤں گا بھی میں خود ہی اور یہ میرا وعدہ ہے کہ آپ سے نہ تو کوئی چھ پوچھے گا اور نہ ہی کسی کی نظروں میں آپ کے لیے حقارت یا ناپسندیدگی کا تاثر اچھے گا لیکن آپ وعدہ کریں کہ آپ یہاں سے نہیں جائیں گی۔ اس لیے کہ جب میں آپ کو اپنے گھر لے کر آیا تھا تو اسی وقت آپ کو ایک خرمیو فرو کی سی حیثیت اور اہمیت حاصل ہو چکی تھی۔ اس گھر سے منسلک ہونے کی وجہ سے آپ اب نہ لگی ہیں۔ بس یہی وجہ تھی کہ سب ان دونوں نے آپ کے بارے میں سستی باتیں کیں تو مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور میں آپ سے استفسار کرنے چلا آیا۔" ڈاکٹر فواد بہت اچھے سلجھے ہوئے انداز میں گویا تھے۔ کچھ دیر پہلے کی وحشت اور کڑھکی کا اب نام و نشان بھی نہ تھا۔ آریان کی چٹکوں پر اس وقت بھی آنسو ٹپکے ہوئے تھے۔

"آپ کی خاموشی تو میں کیا سمجھوں۔ اقرار یا انکار؟"

"فی الحال مجھے سوچنے سمجھنے کا موقع دیں۔ یہ سب گھر کے افراد کے رویوں پر منحصر ہے ممکن ہے میں یہاں رہ جاؤں۔" اس کے سچے میں ملکی ہی خود اعتمادی اور فیصلے میں کچھ چلک پیدا ہوئی تھی۔ ڈاکٹر فواد مسکرا دیے۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے دو ہیڈ کے قریب چلے آئے۔

"آریان! ایک بات کہوں۔"

"ہی۔" آریان نے ان کی طرف نگاہ اٹھائی۔

"اس قدر خوبصورت آنکھوں پر اتنا ظلم اچھا نہیں لگتا۔ یہ آنکھیں تو قدرت نے خواب بننے کو بنائی ہیں۔" یہ کہہ کر وہ کئی تیزی سے کمرے سے نکل گئے۔

آریان کا دل دھک سے رہ گیا۔ "کیا یہ الفاظ ڈاکٹر فواد جیسے ریزرو بندے کے منہ سے نکلے تھے۔ وہ غیر یقینی سے سوچتی اپنے دل کی بے شکم تال پر رقصاں دھڑکنوں کو شمار کرنے لگی۔

لان میں موجود جسمی جسمی سرگوشیاں کرتی خواتین نے سر جھکائے اپنی طرف آتے فواد کو بڑے غور سے دیکھا تھا، ان کے چہرے پر موجود گہری شرمندگی کا تاثر بھی سب کی نظروں سے اوجھل نہ رہ سکا۔ بڑی اماں نے گہری سنجیدہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا تھا۔ وہ ان کے قریب آ کر خاموشی سے سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ سبھی خواتین ان کے اس ناقابل فہم رویے کے متعلق جاننا چاہتی تھیں خاص طور پر انیقہ اور روبیہ کو انتہائی تجسس ہو رہا تھا کہ آخر مسئلہ کیا ہے۔

"فواد! یہ سب کیا تھا؟ کیا ضرورت تھی یہ؟ آج سے پہلے تم نے جو کچھ کیا کبھی تمہیں روکا تو کا نہیں گیا۔ سبھی جانتے ہیں کہ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ تم غصے میں یوں بے قابو ہو جاتے ہو لیکن آج جو کچھ تم نے کیا ہے اس کا کیا جواز ہے؟" بڑی اماں کے لہجے میں محسوس کی جانے والی سختی تھی۔

"بڑی اماں میں سخت شرمندہ ہوں کہ آج ضرورت سے زیادہ ایجاز است ہو گیا یقیناً میرے اس رویے کی وجہ سے آپ سب کو بھی وقتی طور پر ٹینشن ہوئی ہوگی لیکن میں نے بلا جواز ایسا نہیں کیا۔ دوستوں نے آریان کے ماضی کے بارے میں کچھ باتیں ایسی کیں کہ میں برداشت نہ کر پایا، ان سے بھی میرا جھگڑا ہوا اور یہ چوٹ بھی اسی وجہ سے لگی۔" فواد نے اپنی پیشانی کی طرف اشارہ کیا۔

"کیسی باتیں کیا کہا انہوں نے آریان کے متعلق؟" بڑی اماں نے پوچھا۔

"میں وہ باتیں دہراتا نہیں چاہتا بس آپ سب کے اطمینان کے لیے اتنا کافی ہے کہ وہ سب بے بنیاد باتیں تھیں، جھوٹ پر مبنی۔ میرے رویے نے اسے سخت کبیدہ خاطر کر دیا ہے۔ اس کے سامنے مجھے بے حد شرمندگی محسوس ہوئی۔ اس لیے آپ سب سے کہہ رہا ہوں کہ اس سے کسی قسم کی باز پرس مت کیجئے گا۔ میری اس حرکت کی وجہ سے وہ آپ سب کا سامنا کرنے سے کترائے گی اگر دوستانہ ماحول ملے گا تو شاید وہ سہل ہو جائے۔"

"ڈاکٹر فواد جیسے سوچ سوچ کر ایک ایک لفظ ادا کر رہے تھے پھر انہوں نے سب خواتین پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی سبھی کی آنکھوں میں یقین روشن تھا۔ فطری سادگی کے باعث سب نے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں ٹھیک ہے سوائے حدیقہ چچی کے۔ ان کی آنکھوں میں پھیلتے شلوک و شبہات کے سائے ڈاکٹر فواد کی عمیق نظروں کی گرفت میں آ گئے۔

میں ایک بار پھر بہت پیار سے بہت نرمی سے کہہ رہا ہوں کہ آپ کے کسی رویے سے یہ تاثر نہیں ملنا چاہئے کہ اس گھر کا کوئی ایک فرد بھی اسے حقیر سمجھتا ہے۔ اسے پہلے کی طرح فریٹس ماحول ملنا چاہئے اور اگر اس کے برعکس ہوا تو یقیناً آپ سب بھی جانتے ہیں کہ جب میرے کئے کا الٹ ہوتا ہے تو اس کا رد عمل کیسا ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے آپ سبھی چکے ہوں گے جو میں کہنا چاہتا ہوں۔" یہ باتیں بس پردہ صرف حدیقہ چچی کے لیے تھیں اور حدیقہ چچی فواد کے سامنے بس دانت چسکتی تھیں اور کچھ نہیں کر سکتی

تھیں۔ اس وقت بھی ان کے بظاہر نرم لیکن دھمکی آمیز الفاظ پر وہ دانت کچکچا کر رہ گئیں۔

”اگر اپنی بہن کی خوشی عزیز نہ ہوتی تو میں دیکھتی کیسے بڑھ بڑھ کر بوتے ہوتی۔“ وہ دل ہی دل میں خود سے مخاطب تھیں۔ ان کی بہن ایک طویل عرصے سے ڈاکٹر فواد کے خواب دیکھ رہی تھی اور حدیقہ چچی بھی لاکھ زائد چچی کی مخالف کسی لیکن ڈاکٹر فواد کے روشن اور تابناک مستقبل کو دیکھتے ہوئے انہیں بھی ایقہ کی پسند پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ڈاکٹر فواد اپنی بات کہہ کر اپنے پورشن کی طرف بڑھ گئے۔ روپیہ اور ایقہ دینا پچھو کے ہمراہ اس کمرے کی طرف بڑھ گئیں جہاں آریان موجود تھی یقیناً اس وقت ان تینوں کا مطمح نظر بس یہی تھا کہ کسی طرح آریان کے ذہن پر چھایا ہوا اداسی کا کبر اور کر سکیں کہ وہ جانتی تھیں اس جیسی حساس لڑکی کو ڈاکٹر فواد کے آج کے رویے نے تو زڈالا ہوگا۔



کالج کی فضاء ان دنوں ان دونوں کے لیے ہی بہت خوشگوار تھی شاید ہر محبت کرنے والا جوڑا ابتدا میں اسی خود فراموشی کی کیفیت سے گزرتا ہے کہ اسے خبر تک نہیں ہوتی کہ گرد و پیش میں کیا کیا ہو رہا ہے۔ مسرت جہاں نے چوٹی میں بل ڈالتے ہوئے سامنے آئینے میں دیکھا۔ صبح رخساروں کی چمک میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں ستارے سے جل اٹھے تھے۔ ہونٹ آپ ہی آپ مسکراتا، گنگنا سیکھ گئے تھے۔ یہ گزرے تین ماہ گویا ان کی ساری زندگی پر محیط تھے۔ زندگی بھر خوشیاں ان کے در کی باندی رہی تھیں لیکن جو سر خوشی انہیں اس محبت نے عطا کی تھی اس کے آگے وہ تمام خوشیاں پچھ لگتی تھیں۔ وہ بہت بدل گئی تھیں، سینے کی اٹھانوں پر دھراؤ پڑا کثیر بے خیالی میں کندھوں پر جھولنے لگا تھا۔ موقع بے موقع کلکھلا کر ہنسا جیسے ان کی عادت بن گیا تھا اور سب سے عجیب بات یہ تھی کہ وقت بے وقت آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر وہ خود کو جس ذوق و شوق سے دیکھتی تھیں اگر اس نوعیت کو کوئی اور محسوس کر لیتا تو انہیں پہلی فرصت میں پاگل قرار دے دیتا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اتنی بڑی تبدیلی کسی کو محسوس نہیں ہوئی تھی۔ بس چند بار انہیں ہنادوپے کے گھن میں گھومتے، گنگنا تے دیکھ کر اماں بی نے انہیں نوکا تھا کہ وہ یوں سر جھانڈ منہ پہاڑ پھر نے کو بہت برا سمجھتی تھیں۔ مسرت جہاں نے الوداعی نظر آئینے پر ڈالی اور کتابیں ہاتھ میں تھامے باہر آ گئیں۔

”اماں بی! دعا کیجئے گا آج بڑا مشکل ٹیسٹ ہے۔“

”ارے چند بیٹا اماں کی دعائیں بھلا اولاد کے سوا کس کے لیے ہوتی ہیں، اپنی تو زندگی گزر گئی اولاد کے لیے سکھ اور شانتی مانگتے، پروردگار تمہیں کامیاب کرے۔“

اماں بی تخت پر بیٹھی قرآن مجید پڑھنے میں مصروف تھیں، انہیں خدا حافظ کہہ کر مسرت جہاں شاہر حسین کے ہمراہ کالج روانہ ہو گئیں۔

اماں بی آج کل مسرت جہاں کے لیے متکبر رہنے لگی تھیں۔ لاڈلی ہونے کے سبب ان کی اٹھان بھی ماشاء اللہ قابل رشک تھی، اپنی عمر سے دو چار سال بڑی ہی لگتی تھیں گو عمر اتنی نہیں تھی پھر کچھ اور بھی بہت تھیں۔ خاندان بھر میں ان کے جیسی لڑکی کوئی نہیں تھی۔ اماں بی کو تو بھرے خاندان، بھری برادری میں ان کے جوڑ کا کوئی لڑکا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ سادات کا یہ بھی مسئلہ ہوتا ہے کہ لڑکیاں خاندان برادری سے باہر بیٹھی نہیں جاتیں۔ اسی لیے اماں بی کا نظر اپنی جگہ بجا تھا۔ یوں بھی ان کا خیال تھا کہ جب لڑکی آئینہ دیکھنے لگ جائے، پھولوں، خوشبوؤں سے پیار کرنے لگے، خود کو جاتے سناتے ہوئے ہونٹوں کی ہونٹوں میں گنگنائے تو یہ علامتیں ٹھیک نہیں ہیں۔ لڑکی کو فوراً اس کے گھر کا کر دینا چاہئے۔

مسرت جہاں کو کالج کے گیٹ پر اتار کر شاہر حسین آگے بڑھ گئے۔ فرجاد روزانہ کی طرح انہیں اپنا منتظر ملا۔ اب ان کے قدم ٹھککتے نہیں تھے بلکہ عجیب غلبت میں اٹھتے تھے۔

آنکھوں میں شوق کا ایک جہان آباد ہو جاتا تھا۔ انہوں نے دل سے اٹھنے والے ہر سوال کو رد کر دیا تھا۔ دماغ میں بننے والی ہر سوچ پر پھرتے بٹھا دیے تھے اب ان کی آنکھیں خواب دیکھتی تھیں تو فرجاد کے، کان اس کی آواز سننے کو ترستے تھے اور دل اس کے قدموں کی آہٹ سننے کو بے چین رہتا تھا۔ دو سچ کج قدم اٹھاتی اس کے قریب چلی آئیں۔

”آج پورے تین منٹ لیٹ ہوتی۔“ اضطرابی انداز میں فرجاد نے کہا۔

”فرجاد! تھوڑی بہت دیر سویر تو ہوئی جاتی ہے۔“

”نہیں ہونا چاہئے ایسا۔ تم نہیں جانتیں انتظار کی اذیت دنیا کی ہر اذیت سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ امید اور ناامیدی کے درمیان چکراتا انسان کس قدر کرب سے گزرتا ہے تم نہیں جانتیں۔“

”چلیں ٹھیک ہے آئندہ خیال رکھوں گی اور اب کیا کہیں کھڑے رہنے کا ارادہ ہے۔“

”نہیں کینٹین چلتے ہیں، کچھ دیر بیٹھیں گے چائے پیئیں گے پھر اپنے اپنے ڈیپارٹمنٹ

سیدھا ریں گے۔“ فرجاد نے کہا پھر وہ دونوں ساتھ ساتھ کینٹین کی طرف چل پڑے، دونوں کے کلاس فیلوز آج کل ان دونوں کی محبت کے برنگ اشو پڑ سکس کرتے پھر رہے تھے۔ یہ بات بہت سے لوگوں کے علم میں آچکی تھی لیکن انہیں تو جیسے کوئی خاص پرواہ ہی نہیں تھی، کینٹین میں فیل پڑ آنے سامنے بیٹھے وہ راز و نیاز میں لگے ہوئے تھے۔

”فرجاد! انتہائی احتیاط کے باوجود لوگ ہمارے متعلق جاننے لگے ہیں۔“

”تو اچھا ہے بقول شاعر ”بدنام جو ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔“ فرجاد نے ان کی بات فنی میں ازادی۔

”کیا یہ کوئی فکر والی بات نہیں۔“ مسرت جہاں نے پوچھا تو فرجاد مسکراتے ہوئے ان کی

طرف دیکھنے لگا۔

”نہیں یہ فکر والی بات ہرگز نہیں۔ خوش آمد بات ہے۔ دیکھو وہ جو شاعر نے کہا ہے ناں کہ
مجھ سے پہلے اس گلی تک میرے انسانے گئے۔“

”تو ٹھیک ہے ہماری شہرت اور اس محبت کے چہ چہ جب تمہارے گھر تک پہنچیں گے تو ہمارا ملنا
مشکل نہیں رہے گا وہ خود ہی تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیں گے۔“

”اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے، وہ بدنامی کے باعث ہمیں قابلِ فخرین سمجھ کر گولیوں سے اڑا بھی
سکتے ہیں۔“ مسرت جہاں خوفزدہ لہجے میں بولیں حقیقتاً انہیں اب احساس ہو رہا تھا کہ آگے چل کر کتنی
مشکلات ان کے لیے کھڑی ہونے والی تھیں۔

”مسرت! یہ دن، رفاقتوں کے یہ خوبصورت لمحے یوں خوف کی نذر مت کرو۔ دیکھو پہلی بار
زندگی میں پہلی بار مجھے یہ احساس ہوا ہے کہ زندگی میں میرے لیے بھی کوئی خوبصورتی، کوئی ایٹرکشن
ہے۔ میرا فلیٹ تمہاری یادوں، تمہاری خوشبوؤں سے آباد ہو گیا ہے۔ مجھے اب تنہائی بری نہیں لگتی، اکیلے
پن سے وحشت نہیں ہوتی مجھے۔ نیند میری آنکھوں سے دور نہیں بھاگتی۔ پلیز میرے ان محسوسات کو امر
ہونے دو۔ میری زیست کے ویران رستوں میں میری ہم سفر بن جاؤ۔“ فرجاد کا ایک ایک لفظ محبت کے
لہس میں گندھا ہوا تھا۔ اور مسرت جہاں کو لگا جیسے وہ ہواؤں میں اڑنے لگی ہوں۔ وہ سمندر سے جھوم
کراٹھنے والی گھٹائیں کر رہا تھا اور مسرت جہاں اس کے لہجے سے بھیگ بھیگ گئی تھیں۔

”تم مسرت! تمہیں میں نے خود سے بھی بڑھ کر چاہا ہے مجھے تم پر اپنی ذات سے بھی بڑھ کر یقین
ہے اتنا کہ مجھے گمان ہونے لگا ہے اگر کبھی ساری دنیا بھی مل کر مجھے رد کرنے کی کوشش کرے تو تب بھی تم
میری پشت پر ہوگی۔ میرے ہونے کی جنگ مجھ سے بھی زیادہ دل سے لڑو گی، تم مجھ سے بھی زیادہ مجھے
چاہو گی، بولو؟ چاہو گی ناں!“

اس کا لہجہ شوخ ہو گیا تھا اور وہ شرمیلیں احساس تلے مسکرائے جارہی تھیں۔ یہ اونچا لمبا خوبصورت شخص
تین چار ماہ میں انہیں کتنا عزیز ہو گیا تھا حالانکہ کبھی کسی کے ساتھ بہت سارا جیون گزار کر بھی ہم نہیں کہہ
سکتے کہ ہم اسے جانتے ہیں لیکن شاید مسرت جہاں اسے اتنا جاننے لگی تھیں جتنا اپنے آپ کو بھی نہیں۔
بہار کی اولین صبح کی طرح وہ ان کے دل میں اتر اٹھا، ان کا آگن دل اس کی محبت کی سرمئی دھوپ سے بھر
گیا تھا، سائبان جیسا وجود ان پر تن گیا تھا اور محبت جب لفظوں میں سمجھ آنے کا روپ اختیار کرتی تو وہ
روپ میں پورا کا پورا آن بستا۔ محبت کیا ہے؟ صرف وہ!!!

”محبت کو دیکھو تو کیسی لگتی ہے بالکل اس کے چہرے، اس کی آنکھوں جیسی۔ محبت اگر مسکراہٹ
ہے تو وہ مسکان صرف اس کے ہونٹوں پر بھتی ہے کہیں محبت روپ رکھتی ہے تو صرف اس کا بھیج ہے،
صرف وہ ہے۔“ مسرت جہاں کے لیے وجہ سرخوشی، محبت، اعتماد اور یقین کا سبب تھا وہ زندگی انہیں بہت

نواصورت لکھنے لگی تھی۔

”مسرت۔۔۔ تم۔۔۔ تم بھی تو کچھ کہو کوئی ایسا لفظ یا چند ایسے حروف جو محبت کا سکون بن کر میرے
اندر اتر جائیں۔“ فرجاد کے لہجے میں تشنگی اتر آئی۔ مسرت جہاں نے ایک نظر اس کے چہرے اور خنجر
آنکھوں کو دیکھا پھر سر جھکا کر بولیں۔

”مجھ کو اتنا کہنا ہے

پھول، بارش، خوشبو، چندا

مجھ کو اچھے لگتے تھے

اب تم اچھے لگتے ہو!!“

”شکر یہ مسرت! تمہارے یہ لفظ کسی قیمتی متاع کی طرح میرے دل کے نہاں خانوں میں رہیں
گے۔ جانتی ہو میں تمہاری آنکھوں کو کیا کہتا ہوں؟“

”کیا۔۔۔؟“

”سمندر۔۔۔۔۔۔ گہرا چپ سمندر اور میں تمہارے اندر سے ایک جذبے ایک پُر شور جذبے کی طرح
اٹھ کر اس سمندر کی خاموش لہروں میں مٹا طم ہو کر نکھر جانا چاہتا ہوں، میں تمہارے دل میں ایک روم کی
طرح رہنا چاہتا ہوں۔ تمہاری محبت کے خوش گمان احساس کو سانسوں میں بھر لینا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا
ہوں دنیا میں جب میرا وجود نہ بھی ہو تب بھی لوگوں کو تم میں۔۔۔۔۔ میں دکھائی دوں۔“

”فرجاد! ایسی بات تو مت کریں۔۔۔۔۔ یہ سفر، یہ مسافت آپ کے سنگ کٹ پائے گی ورنہ
میرے حوصلے میری ہمت اتنی مضبوط نہیں ہے۔“

”مسرت! محبت کا وجود اپنی جگہ مسلم کسی لیکن دنیا کی روایات ہمیں یوں ایک ساتھ کبھی نہیں دیکھ
پائیں گی۔ اس نازک سی ذور کو ہمیں کسی مضبوط رشتے کی گرہ سے باندھنا ہوگا۔ مسرت! میں تمہارے
بزدوں سے تمہارا ہاتھ مانگنا چاہتا ہوں۔“

”لیکن فرجاد! میرے گھر کا کوئی فرد بھی اس رشتے پر راضی نہیں ہوگا۔“

”کیوں۔۔۔۔۔ کیوں راضی نہیں ہوں گے؟ کیا ہمارے جذبے اتنے بے وقعت ہیں۔ کیا ہماری
رائے کی کوئی اہمیت نہیں؟“

”فرجاد! میرا تعلق نجیب الطرفین سادات گھرانے سے ہے۔ ہمارے ہاں صرف نیدوں میں
نئی رشتہ دیا جاتا ہے پھر آپ اکیلے ہیں۔“

”ان سب باتوں میں سے میرے اختیار میں کون سی بات ہے کیا بتا سکتی ہو؟“ فرجاد قدرے تلخ
لہجے میں بولا۔ ”جو کچھ میرے ہاتھ میں ہے اس میں کسی قسم کی خرابی ہو تو مجھے رد کیے جانے کا افسوس نہ ہوگا

لیکن جس چیز پر میرا اختیار ہی نہیں اس کی وجہ سے مجھے ریجیکٹ کرنے کا اختیار نہیں ہوگا۔“ اس کے حتیٰ لحد میں کہے گئے ایک ایک لفظ نے مسرت جہاں کے سامنے اندیشوں کا پنڈورا کھول دیا تھا۔ ان کی آنکھوں کے سامنے اماں بی، ابامیاں، بھائیوں، بھائیوں کے چہرے گھوم رہے تھے، شکوہ، اعتماد اور بھروسے کا خون کرنے کا لگہ۔ وہ لرز اٹھیں۔

یہ کون سی طلب جاگ اٹھی تھی ان کے دل میں۔ کس راہ پر چل پڑی تھیں وہ؟ عجب دور ہے پر آن کیگی تھیں نہ آگے جانے کا راستہ مل رہا تھا اور نہ پیچھے پلٹنے کا۔ شوریہ قدموں نے اتنا غبار اڑا دیا تھا کہ واپسی کا راستہ لگا ہوں سے اوجھل ہو گیا تھا آگے جانے کے لیے پھر بھی فرجاد کا سہارا تو تھا اور انہوں نے اس کا کندھا تھام لیا۔

”لیکن فرجاد! یہ روایت ایسی ہے جو آج تک نہیں ٹوٹی، سید گھرانوں میں غیر سید لڑکیاں بیاہ کر آ سکتی ہیں لیکن سید لڑکیاں بیاہ کر باہر نہیں جاسکتیں۔“

”کیوں؟“ کیوں نہیں جاسکتیں۔ یہ سب ہم لوگوں کے اپنے بنائے ہوئے اصول ہیں، پروردگار نے تمام انسانوں کو برابری کی بنیاد پر تخلیق کیا ہے کسی کو کسی پر فوقیت نہیں دی گئی سوائے تقویٰ کے۔ پھر وہ دن ہوتے ہیں، ہر گھر کسی وجہ کے بغیر مجھے ٹھکرا دیں۔“

”فرجاد! ان سب باتوں کے باوجود وہ نہیں مانیں گے میں انہیں جانتی ہوں۔ خاص طور پر اپا میاں کے خیمے کا سوچ کر تو ابھی سے میری جان جا رہی ہے۔“

”مسرت! اس طرح میرے حوصلے پست کرنے کی کوشش مت کر، تم سب کچھ جانتی تھی ناں۔ میرے بارے میں بھی اور اپنے گھرانے کی اقدار کے بارے میں بھی۔“

”ہاں۔۔۔ جانتی تھی۔“

”میرے جذبات کو پذیرائی بخشتے وقت تمہارے دماغ نے یہ باریکیاں نہیں سوچیں۔ اس وقت ایک ایسے کو مجھ، جس میں خیال نہیں آیا کہ انجام کار کیا ہونا ہے۔“

”میں باریکی تھی آپ کے جذبات کے سامنے۔ دل و دماغ کی ہر سوچ، ہر خیال پر پابندی لگا دی تھی میں نے جو میرے قدم روکنے کو بڑھا۔“

”پھر۔۔۔ پھر مجھے یہ بتاؤ کہ کیا تم نے میرے جذبات کی پذیرائی کر کے ٹھیک نہیں کیا؟“

”یہ میں نے کب کہا؟“

”کیا میرے کردار، میری شخصیت میں کسی قسم کی کمی یا جھول دکھائی دیا تمہیں اتنے دنوں میں۔“

”یہ آپ کیسی باتیں کرنے لگے ہیں۔“

”مسرت، میں جو پوچھ رہا ہوں، پلیز اس کا جواب دو۔“

”نہیں۔۔۔ میں نے کوئی برائی نہیں دیکھی۔“ مسرت جہاں نے جواب دیا۔

مجھے یہ بتاؤ کہ کیا صرف سادات ہی بلند کردار اور اعلیٰ اخلاق کی وارث ہے۔ کیا اچھائی صرف سیدوں تک محدود ہے؟ اگر ایسا ہے تو دنیا میں رہنے والے باقی سب لوگ تو گھٹیا اور حقیر ہوئے۔“ فرجاد کے لہجے میں تلخی آگئی۔

”فرجاد! آپ کی خوبیاں، آپ کی شخصیت کی اچھائیاں کیا ہیں یہ تو میں جانتی ہوں ناں، انہیں تو اس بات کا علم نہیں اور میں نے دل میں آپ کو کیا مقام دیا ہے اسے لفظوں میں واضح کرنا ممکن نہیں۔“

”تو پھر مسرت! ایک بار مجھے اپنا ہاتھ ماتھن دے دو، میں تمہارے امی ابا سے خود بات کروں گا، یہ سید ہمارا ست ہے اور اسے اختیار کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔“

”فرجاد! میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ ان کا جواب انکا۔ میں ہوگا۔ آپ کی کوئی دلیل انہیں قائل نہیں کر سکے گی۔ میرے ابامیاں انتخابی بنیاد پرست انسان ہیں۔ ایک تنہا شخص جس کے پاس کوئی رشتہ نہیں یوں ان کے سامنے جا کر ان کی جہی کا ہاتھ ماتھن دے وہ اس بات کو اپنی توہین سمجھیں گے۔“ مسرت اماں نے کہا تو فرجاد ایک لمحے کو خاموش ہو گیا۔

”ہوں۔۔۔۔۔“ فرجاد نے ہنکارا بھرا۔ ”پھر کیا ہوگا؟“

”کیا مطلب؟“ اس کے بے موقع سوال پر مسرت جہاں اچنبھے سے بولیں۔

”مطلب یہ کہ ہر طرح سے ان کا جواب انکار میں ہوگا؟“

”ہاں۔۔۔“

”تو پھر۔۔۔ پھر کیا ہوگا؟“ اس کے سوال کے پیچھے چھپے ہوئے معنی مسرت جہاں کو ایک لمحے کے لیے لا جواب کر گئے۔

”پھر۔۔۔ پھر یہ ہوگا کہ میری پڑھائی چھڑا دی جائے گی، میرے گھر سے نکلنے پر پابندی لگا دی جائے گی۔۔۔۔۔“

”پھر۔۔۔۔۔“

”پھر جلد سے جلد میری شادی کرنے کی کوشش شروع ہو جائے گی۔“

”ہوں۔۔۔۔۔ اور آپ کسی دوسرے کی ڈولی میں بیٹھ کر رخصت ہو جائیں گی، ستر فیصد قلمی بیرونیوں کی طرح مجبور ہو کر۔“

”آپ طنز کر رہے ہیں۔۔۔۔۔؟“ مسرت جہاں اس کے لہجہ کی کرختگی سے گھائل ہو کر بولیں۔

”نہیں۔۔۔۔۔ میں حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ تقدیر شروع سے میرے ساتھ یہی کھیل کھیتی آئی ہے جس چیز کی طلب میں نے کی وہ مجھ سے چھن گئی، رشتوں کا خلوص اور مان تو مجھے شروع سے حاصل ہی

نہیں رہا۔ اب۔۔۔ اب تمہاری طرف قدم بڑھائے تو یہ سوچ کر کہ شاید یہاں میری خرابیاں نصیبی کا اختتام ہو جائے، چند خوشیاں اور سکون بھرے سانس مجھے بھی نصیب ہو جائیں لیکن یہاں تم مجبور ہو گئیں۔ تمہاری بے بسی تمہارے بڑوں کو ان کے فیصلے سے باز نہیں رکھ سکے گی اور یہ چاند کسی دوسرے آئینے میں روشنی بکھیرے گا۔ میرے آئینے میں کیا رہا، وہی اندھیرے جوازل سے میرا نصیب ہیں۔“ فرجاد کا لہجہ بکھرا ہوا تھا۔

”نہیں۔۔۔ ایسا نہیں ہوگا۔۔۔ میں، میں کسی اور کے نام کی مہندی ان ہاتھوں پر نہیں لگا سکتی۔“

”پھر۔۔۔ پھر کیا کرو گی تم۔۔۔ کیا عبادت کرو گی۔“

”نہیں۔۔۔ میں نہ ہر کھالوں گی؟“

”واہ۔۔۔ خوب رہی۔ زہر کھا لو گی۔ وہن مسماہ مسرت جہاں کے دروازے پر باراتی کھڑے ہیں اور وہن صلیب نے زہر کھا لیا۔ پھر جانتی ہو کتنی جگہ ہنسائی ہو گی تمہاری اور تمہارے خاندان والوں کی۔ تمہارا عزت دار گھر انہ لوگوں کی اٹھتی انگلیوں کا نشانہ بن جائے گا۔“

”تو پھر۔۔۔ اس سے کیا فرق پڑے گا، میں تو نہیں ہوں گی ناں یہ سب کچھ دیکھنے اور سننے کو جب ان سب کو میری خوشی کی پروا نہیں تو پھر مجھے ان کا خیال کرنے کی کیا ضرورت ہے۔“ مسرت جہاں کے لہجے میں فیصلہ کن سختی محسوس کر کے فرجاد کے لیوں پر ایک دلغریب مسکراہٹ پھیل گئی۔

”یہی تو میں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اول تو سیدھا راستہ اختیار کریں گے، ہر ممکن کوشش کروں گا کہ وہ مان جائیں لیکن اگر پھر بھی ان کا جواب نفی میں ہو تو پھر سب کچھ ٹھکرا کر دنیا کے کسی ایسے گوشے میں چلے جائیں گے جہاں ہماری محبت کو گناہ نہ سمجھا جائے۔ جہاں ہماری خوشیاں صرف ہماری ذاتی ہوں گی۔ ایک دوسرے کی مکمل رفاقت کا احساس ہم دونوں کو ایک الوہی سکھ سے ہمکنار کر دے گا۔“ فرجاد کی آنکھیں کل کے روشن خوابوں کی چمک سے خمار آلود ہو گئیں۔ مسرت جہاں خاموش بیٹھی اس کی کہانی ان کہی سن رہی تھیں۔ فرجاد جس سر زمین کا ذکر کر رہا تھا وہ تو خوابوں کی خیالوں کی سر زمین تھی، اس کی خوبصورت اس کے حسن سے مسرت جہاں کی آنکھیں چکا چوند ہونے لگیں۔

”آؤ مسرت چلیں۔۔۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔ ہاں ایک بات یاد رکھنا یہاں سے اپنے ساتھ اس یقین کو ہمراہ لے کر چلنا کہ جذبے صادق ہوں تو منزل ضرور مل جائیگی۔“ وہ دونوں کینٹین سے نکل کر اپنے اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف بڑھ گئے تھے۔ وقتی طور پر الگ الگ راہ پر گامزن تھے لیکن دونوں کے دل اس یقین کے ساتھ دھڑک رہے تھے کہ بہت جلد وہ کبھی نہ جدا ہونے والے بندھن میں بندھ جائیں گے۔



ایک اینڈ والے دن اس گھر کے افراد کی پھرتیاں دیکھنے والی ہوتی تھیں۔ دوسرے لوگوں کی طرح یہ سب دن چڑھے بستروں پر اٹھنے کی بجائے صبح سویرے ہی اٹھ جاتے تھے، سب سے اچھی عادت ان میں یہ تھی کہ نوجوان نسل ساری کی ساری بڑی اماں کے اندر ہونے کی وجہ سے نمازی تھی۔ ہاں تو ذکر ہو رہا تھا ایک اینڈ کا تو ایک اینڈ پر گھر کے بھی افراد کہیں نہ کہیں سدھار جاتے تھے۔ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا کہ کسی ایک اینڈ پر فواد بھی گھر پر دکھائی دے جائیں اور جب ایسا ہو جاتا تھا تو پھر پروگرام بھی بدل جاتا یعنی پھر سب گھر کے افراد نہیں بلکہ صرف ایک پارٹی کہیں نہ کہیں سیر کو نکل جاتی۔ آج فواد گھر پر ہی تھے لیکن دو تین دن پہلے آریان اور گھر والوں کے ساتھ ان کی جس قسم کی ڈسکشن ہوئی تھی اس کی وجہ سے بہت ریزہ ریزہ ہو گئے تھے۔ روپیہ اور بیقہ نے آریان کو بتا کر یہ اس کے ساتھ دہلی دوستانہ روپیہ رکھا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ آریان ایک آدھ دن شرمندگی کے احساس کے باعث سب سے کڑائی کڑائی سی رہی لیکن جب کسی نے کچھ ظاہری نہ کیا تو پھر وہ بھی دھیرے دھیرے سیٹ ہو گئی۔ صبح نماز پڑھنے کے بعد فواد کے کمرے میں بنگامی میٹنگ بلائی گئی۔ ہر کارہ خصوصی سیونٹھ کلاس کے سنوڈنٹ اعلیٰ پچا کے برخوردار طاہر تھے جنہوں نے بیقہ صاحبہ کے حکم کے بموجب سب کے دروازے کھٹکنا کر انہیں مطلع کیا اور ٹھیک آٹھ بجے میٹنگ کے تمام اراکین فواد کے بندر میں موجود تھے۔ فواد تو اس ہنگامہ خیز جلوس کو دیکھ کر بے چارے حیران و ششدر رہ گئے۔ کوئی رائٹنگ ٹیبل پر چڑھا بیٹھا تو کوئی طور کشن پر۔ باصر صاحب جنہیں سب سے چھوٹے ہونے کا اعزاز حاصل تھا کچھ زیادہ فریٹک نہیں کا مظاہرہ کرتے ہوئے دروازے کے پردے کے ساتھ جمبول رہے تھے۔ فواد نے بیڈ پر بڑھتے ہی جوم کو دیکھتے ہوئے گھبرا کر اپنی ٹانگیں سیٹ لیں۔

”یار یہ سب کیا ہے؟ میں رات کو بہت دیر سے سویا تھا اور ابھی میرا موڈ نہیں تھا اٹھنے کا۔“ وہ جیسے صخبلائے۔

”دیکھئے جناب! خیند سے زیادہ ضروری بات ہے جو ہم ڈسکس کرنے آئے ہیں۔“ شاذ ان بکیہ

گود میں رکھتے ہوئے بڑے اسٹائل سے بولا۔

”کیوں؟“ کیا کشمیر کی آزادی کے لیے کوئی مجرب نسخہ ہاتھ لگ گیا ہے۔“ فواد نے ان سب کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔

”بھائی شکر پڑیاں چلیں۔“ انا کو شکر پڑیاں بہت پسند تھی۔

”کیوں کیا شوگر کروانی ہے۔“ طاہر نے مضحکہ اڑایا۔

”سب فیصلہ کر لیں کہ کہاں جاتا ہے۔“

”چھتر پارک چلیں۔“ ہیڈ نے اپنی ٹیم میں دی۔

”بھئی ہزار بار کی دیکھی ہوئی جگہوں کو پھر دیکھنے کو دل نہیں چاہتا۔ ایک تو ہم لوگ بھی بس کیر کے فقیر ہی ہیں۔“ مہوش بیزاردی سے بولی۔ وہ فطرتاً کچھ تک چڑھی اور مغرور سی تھی۔

”اگر میں ایک جگہ ڈیپانڈ کروں تو میرا خیال ہے وہ آپ سب کو ہی پسند آئے گی۔“ فواد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کون سی؟“ سبھی بیک وقت بولے۔

”مارگلہ ہلز۔“

”واہ۔۔۔۔۔ یہ ہوئی ناں بات۔“ شاذان چٹکی بجاتے ہوئے بولا۔

”اصل میں کچھ سانس پر بے اعتدال ہوتا ہے جس سے اکتاہٹ ہونے لگتی ہے۔ اس لیے میرا خیال ہے سیر و تفریح کا مزہ وہیں آتا ہے جہاں سکون ہو، خاموشی ہو۔“ فواد نے مارگلہ ہلز کو پسند کرنے کی وجہ بھی بتا دی۔

”بس ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ ایگزیکٹ نو بجے ہم یہاں سے نکل چلیں گے۔ اس وقت آنکھ بج کر میں منت ہیں، صنف نازک آپ کے پاس چالیس منٹ ہیں اس دوران تیار ہو جائیں لیکن ایک اہم بات بتانا میں بھول گیا۔“

”کیا بات؟“ وہ سب جو بیرونی دروازے سے نکلنے لگے تھے رک کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔

”کہ میں آپ کے ساتھ نہیں جا رہا؟“

”اوہ۔۔۔۔۔ سب کے چہرے لٹک گئے۔

”لیکن کیوں؟“ طاہر نے احتجاجاً کہا۔

”اس لیے بیٹا جی! کہ کلینک پر دو انتہائی اہم کیسز ہیں جو میں نے ذیل کرنے ہیں۔“

”تو بھائی کاشف کیا کلینک نہیں آ رہے؟“ حسنین نے فواد کے کو لیگ اور بہت اچھے دوست کا نام لیا جو اکثر ان کی غیر موجودگی میں کلینک کے سارے معاملات کو ہینڈل کرتا تھا۔

”آتا ہے لیکن ان کیسز پر میں کام کر رہا ہوں۔“

”بھائی یہ فاول ہے! ہم نے آپ کی ڈیپانڈ کی ہوئی جگہ ایکسپٹ کر لی پھر۔۔۔۔۔ پھر آپ کیوں نہیں جا رہے۔ اتنے دنوں بعد آریان آپنی بھی ہمارے ساتھ جا رہی تھیں اور آپ نے سارا پروگرام ہی چھوٹ کر رکھ دیا۔“ ہیڈ منہ پھلائے کہہ رہی تھی۔

فواد نے ایک ہل کو خاموش کھڑی آریان پر ایک نگاہ ڈالی اس کی نظریں انہی کو دیکھ رہی تھیں۔ پتہ نہیں انہیں کیوں ایسا لگا جیسے آریان کو ان کے نہ جانے کا سن کر غم ہو ا تھا۔

”چلو زیادہ منہ مت بسور کہیں یہ سب ڈری نہ جائیں۔ اتنا اصرار کرتی ہو تو چلے چلتے ہیں۔“ فواد بدستور آریان کی طرف دیکھتے ہوئے ہیڈ سے مخاطب ہوئے۔ آریان کے لمبوں پر غیر محسوس سا تبسم مچلا تھا جو فواد کے سوا ہر کسی کی نگاہ سے پوشیدہ رہا۔ کبھی ایک بار پھر چپکنے لگے اور جلدی جلدی اپنے اپنے لچ کا مینو بتا کر رویہ اور ہیڈ آریان کے ہمراہ اپنے پورشن میں آگئیں اور پھر جب وہ سب تیار ہو کر گاڑیوں میں بیٹھ کر سفر پر نکلے تو موسم بھی کچھ شرارتی سا ہونے لگا۔ بادلوں کے ننھے ننھے ٹکڑوں کی اٹھکیاں دیکھتے وہ مارگلہ ہلز پہنچ چکے تھے۔

”اوہ بی بی۔۔۔۔۔ یہ بھی کوئی جگہ ہے بھلا پہاڑی پہاڑ، نہ رونق نہ مزہ۔“ صابرہ ان کے ساتھ ہی آئی تھی تاکہ کھانا دانا گرم کرنے، چائے بنانے میں انہیں پریشانی نہ ہو۔

”ارے بد ذوق! غور سے دیکھو قدرت کی صنائی، فطرت کے شاہکار، ایسا قدرتی حسن کبھی پہلے دیکھا ہے۔“ ہیڈ صابرہ سے مخاطب تھی۔

”رہنے دو بی بی! ہم تو جانیں زندگی رونقوں میں ہے ایسے ویرانوں میں نہیں۔“

”کتوں کے مینڈک کو کتوں ہی اچھا لگے گا۔“ ہیڈ برا سامنے بنا کر بولی۔ رویہ اور مہوش نے اپنے ساتھ لائی ہوئی درمی ہلز کے فرش پر بچھائی۔ انہوں نے اپنے لیے نسبتاً خاموش سا گوشہ چنا تھا اور گرد کسی قسم کی چہل پہل نہیں تھی۔ آریان، مہوش، فواد اور رویہ درمی پر براجلن ہو گئے، شاذان اور ہیڈ بچہ پارٹی کو لے کر پارک کی سمت چلے گئے۔

”کتنی عجیب بات ہے آریان کو ہمارے ہاں رہتے ہوئے تقریباً ایک ماہ ہو گیا ہے لیکن میرا اس سے ابھی تک تفصیلی تعارف نہیں ہوا۔“ مہوش نے کہا۔ درحقیقت آریان کو مہوش کچھ تک چڑھی سی لگی تھی اس لیے اس نے خود کو اس کے معاملے میں ریزرو کر لیا تھا جبکہ رویہ اور ہیڈ اس کے ساتھ بہت فریگ تھیں۔

”اصل میں تم اپنی دنیا میں اتنا گمن رہتی ہو کہ گرد و پیش کی چیزیں ذرا کم ہی خبر ہوتی ہے۔“ فواد نے اسے احساس دلایا کہ وہ اپنے ارد گرد کو خاطر میں ہی کب لاتی ہے کہ اسے کچھ علم ہو کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے۔

نواد، مہوش، آریان اور روبہ بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

”جی ہاں! تو تھکیل ہے قرعہ اندازی، ان پرچیوں پر چند باتیں لکھی ہیں جس کے پاس جو پرچی آئے گی اسے وہ کر کے دکھانا ہوگا۔“ شاذان نے جیکٹ کی جیب سے کاغذ کی تہہ شدہ پرچیاں نکال کر سامنے درمی پڑھ کر دیں۔

”آپ جیسی سزیل بہن سے اور توقع بھی کیا کی جاسکتی ہے۔ ان میں کوئی ایسا ممکن کام بھی نہیں لکھا جو آپ کر نہ سکیں۔ بہر حال ہم چار افراد ہیں سب سے پہلے بسم اللہ کون کرے گا۔“ شاذا ان نے کہا۔

”میرا خیال ہے ایتھ سب سے پہلے پرچی اٹھائے گی۔“ روبیہ نے ایتھ کو آگے کر دیا۔

”کیوں مجھے کیا قربانی کا بکرا سمجھ رکھا ہے۔“ ایتھ بدک کر پیچھے ہٹی۔

"ہمت کرو سے کیا مراد ہے تمہاری... میں سمجھتی یقیناً اس میں کچھ ایسا ہے جو ٹھیک نہیں۔"

”میں خیراب بزدل کہہ کر مابدولت کے جلال کو آواز مت دو۔ ہم اٹھائے لیتے ہیں۔“ بیٹہ نے ہاتھ بڑھا کر ایک پرچی اٹھائی اور بغیر کھولے شاذان کی طرف بڑھا دی۔ حاضرین مجلس مکمل طور پر ان دونوں کی طرف متوجہ تھے۔ شاذان نے پرچی کھولی، پڑھی، ایک معنی خیز مسکراہٹ اس کی مونچھوں تلے پھیلی۔ مسکراتی نگاہوں سے اس نے بیٹہ کی طرف دیکھا۔

”یعنی.....؟“ روبیہ نے ایک بار پھر یقین دہانی چاہی۔

”ہاں تو روبیہ بتاؤ ان جانوروں کے نام۔“ روبیہ نے ایک نظر ایقہ کے چہرے کی طرف دیکھا جہاں کچھ ہونق پن اور بے بسی نے عجیب سے نقش و نگار بنارکھے تھے۔

”اب ایسا بھی نہیں، میں ملی تو تھی آریان سے لیکن زیادہ مپ شپ نہیں لگائی۔ ویسے فواد بھائی آپ مجھ پر زیادہ طنز مت کیا کریں، میں اتنی بری بھی نہیں۔“ مہوش ہنسیں چڑھا کر بولی۔

”ارے میری بہنا میں طنز کب کر رہا ہوں۔ چلو اس ٹاپک کو چھوڑو، کوئی اچھی سی بات کرو۔“

فواد کو لگ رہا تھا کہ مہوش حسب عادت ماحول کو کشیدہ کرنے کی کوشش کر رہی ہے سو موضوع بدل دیا۔ ابھی انہیں تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ ایتھ و غیرہ واپس آ گئے۔

”میں اچھی طرح جانتی تھی کہ پور لوگ خاموش بیٹھے ایک دوسرے کے منہ دیکھ رہے ہوں گے۔ ویسے شاذان یہ جو ہمارے بڑے ہیں انہوں نے کیا سنجیدگی کے سارے ریکارڈ توڑنے کی قسم کھا رکھی ہے۔“

”ہاں لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے، دیکھو ناں ایک طرف تم ڈاکٹر کو بٹھا کر چلی گئیں اور دوسری طرف دو عدد نیچرز جبکہ تیسری طرف ایل ایل بی کی اسٹوڈنٹ براجمان ہیں، اب خود سوچو جن پر پوری قوم، پورے ملک کی سلامتی و ترقی کا دار و مدار ہودہ کیا میری تمہاری طرح ہستے پھریں گے۔ نہیں بھئی حکومت پاکستان نے ان جیسے سنجیدہ لوگوں کے لیے ایک قومی چھٹی کا اعلان کیا ہے جس دن ان سب لوگوں کو دیوار قبچہہ کے سائے میں لے جایا جائے گا۔ پورے سال کی ہنسی کسی ڈیوٹی کی طرح یہ اسی دن منس لیا کریں گے تاکہ باقی کا پورا سال انہیں ہنسنے کی زحمت گوارا نہ کرنی پڑے۔“ شاذان ناان اسٹاپ ہو لے جا رہا تھا۔

روبیہ اور مہوش کے ساتھ ساتھ فواد اور آریان بھی ہنس دیے تھے۔ آریان نے بہت دلچسپی سے اس چلبلی سے لڑکے کو دیکھا تھا جو عمر میں ایسے سے کچھ بڑا ہو گا اور عادت میں اسی کی طرح کا ہنس کھلا اور بذلہ رنج۔

”بھائی لوگو! میں تو یہ کہتا چاہتا ہوں کہ یار چھٹی ہے اسے انجوائے کرو، ہنسو بولو.....“

”جی ہاں بالکل..... اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے اراکین کی طرح سنگین سی بنجیدگی چہروں پر

طاری کیے آپ فحشی تو انجوائے کر رہے ہیں۔“

”تو پھر کیا کرنا چاہئے.....؟“ فواد اس کی بجواس سے تنگ آ کر بولے۔

”تو پھر یہ کہ کوئی کھیل کھیلا جائے۔ بچے تو پارک میں مصروف ہیں اور میں اظہر میاں کو ان کا پاس بنا کر ان کی نگرانی پر جھوڑ آیا ہوں۔ پیچھے رو گئے ہم تو ہم بھی تو بچے ہی ہیں اس لیے کھیل ہمارا حق ہے۔“

”ہوں..... تو تمہارا کیا خیال ہے آنکھ مجھ کو کھیل جائے یا.....“

”اؤں ہوں..... میں گھر سے ایک کھیل کی تیاری کر کے آیا ہوں اگر اجازت ہو تو مابعد ملت اسے شو

کے

”جلدی کرو..... خواہ مخواہ اتنی دیر سے بوریت پھیلا رکھی ہے۔“ حقیقہ نے بے صبری سے کہا۔

”پرفیکٹ۔۔۔ بالکل ایسے نہیں لگ رہا، بھائی جیسے کوئی جنگلی بلی، جھپڑے دیکھ کر خوشی سے میاؤں میاؤں کر رہی ہو؟“ شاذان شرارتی لہجے میں بولا۔

فواد ہنس دیئے۔

”اب دوسری فرمائش۔“ شاذان نے سلسلہ آگے بڑھایا۔

”اب بکری کی آواز نکالو۔“

”بھئی یہ فاول ہے کوئی مشکل آواز بتاؤ۔ بلی اور بکری کی آواز تو بچے بھی نکال سکتے ہیں، اپنی بہن ہے اس لیے ایسی رعایت برتی جا رہی ہے۔“ شاذان احتجاج کرنے لگا۔

”اچھا اگلی بار سہی، اس وقت تو میں نے کہہ دیا ہے اور کھیل کی رو سے اب ایقہ کو ماننا ہوگا۔“ بکری کی آواز نکالنے کے بعد ایقہ کو پیاس لگنے لگ گئی۔

”تم اب فرار حاصل کرنا چاہتی ہو۔ آنجناب تیسری فرمائش پوری کرنے سے پہلے کسی طور اپنی جگہ نہیں چھوڑ سکتیں۔“

”جلدی کہو۔۔۔؟“ ایقہ نے کہا۔

”چونکہ مس ایقہ بد تیزی کی مرکب ہوئی ہیں اس لیے سزا کے طور پر تیسری آواز گدھے کی نکالیں گی۔“ رو بہ ایقہ کے کوفت بھرے تاثرات دیکھ کر مسکراتے ہوئی بولی۔

”یہ کیا بات ہوئی، یہ کوئی کھیل ہے۔ میں نہیں، کھیلتی ایسا فضول سا کھیل۔“ ایقہ ناراضگی سے بولی۔

”نہیں بھئی! اب گیم میں شامل ہونے کے بعد کوئی قدم پیچھے نہیں ہٹائے گا۔“ فواد کے کہنے پر ایقہ نے غصے سے ان کی طرف دیکھا۔

”تو ٹھیک ہے آپ نکالتے پھریں یہ عجیب و غریب آوازیں، میں تو نہیں نکالوں گی گدھے کی آواز۔“

”ارے ایقہ مذاق ہی تو ہے جسٹ فار انجوائے منٹ۔ چلو شاباش جلدی سے تیسری فرمائش پوری کر دو تاکہ ہم دوسرے قربانی کے کمروں کی درگت بنا سکیں۔“ شاذان کے اصرار کرنے پر اس کو ڈھینچوں ڈھینچوں کی ناپسندیدہ آواز نکالتے ہی بنی اور بعد میں وہ منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔

”میرا خیال ہے حاضرین کچھ خوفزدہ دکھائی دے رہے ہیں تو آپ سب کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ صرف یہی پرچی قابل اعتراض تھی باقی سب بہت زبردست ہیں۔ اب یہ مس ایقہ کی قسمت کہ یہ پرچی ان کے ہاتھ میں آگئی حالانکہ فہد بھائی کے پاس جانی چاہئے تھی۔“ شاذان نے کہا۔

”اب آپ میں سے کون پرچی اٹھائے گا۔“

”اب فہدی بھائی آگے آئیں۔“ مہوش نے کہا۔ خلاف توقع خلاف عادت آج وہ اپنے کزنز اور بھائیوں کی رفاقت کو انجوائے کر رہی تھی۔ فواد نے ڈرنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے ایک پرچی اٹھا

کر شاذان کے ہاتھ میں تھادی اور اس کی طرف یوں دیکھنے لگے جیسے اس کے ہاتھ میں ان کا نامہ اعمال ہو۔

”واہ۔۔۔۔۔“ شاذان پرچی پڑھ کر جھوم اٹھا۔ ”کہاں غریب مریضوں کی چیر پھاڑ اور کہاں عشق کی واردات۔ واہ۔۔۔۔۔ کیا کبھی نیشن ہے۔ ڈاکٹر فواد علی شاہ اظہار عشق کر کے دکھائیں۔“

”کیا مطلب۔۔۔؟“

”یار بھائی! اپنی خیالی محبوبہ سے عشقیہ مکالمے بولیں ہمارے سامنے۔“

”نہیں بھئی یہ اپنے بس کی بات نہیں۔“

”ارے بھائی پر ٹینس کر لیں شاید عنقریب ایسا کوئی موقع آجائے اور آپ بغلیں جھانکنے لگ جائیں ہماری ہونے والی بھابی کے سامنے۔“

”شاذان یار مشکل کام ہے۔“

”کیا محبت کرنا یا محبت بھرے جملے بولنا۔“ فواد کو چڑا کر شاذان کو مزہ آرہا تھا۔

”دونوں ہی۔۔۔۔۔“

”چلیں وقت ضائع مت کریں۔ جلدی سے خیالی محبوبہ سے اظہار عشق کریں۔ یہ یاد رکھئے گا کہ پہلی بار عشق کا اظہار کرنا ہے۔“

”یعنی سیدھے سیدھے کہہ دوں کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔“ فواد مسکراتے ہوئے بولے۔

”اوہ نہ وہی ٹیڈیکل سڑک چھاپ، فٹ پاتھی عاشقوں والا جملہ۔ او بھائی میرے، کوئی جدت آئیں کوئی نیا پن۔ ہر انسان کے ذہن میں ایک خیالی پیکر ہوتا ہے اور جب وہ پیکر مجسم ہو کر سامنے آ جاتا ہے تو اس وقت اس کے کیا محسوسات ہوں گے۔ ان محسوسات کو زبان دینی ہے، کیا آپ کے ذہن میں کوئی خیالی پیکر نہیں ہے۔“

”اوں۔۔۔۔۔ ہے تو سہی۔“ تنکھیںوں سے آریان کی سمت دیکھ کر وہ شرارت سے بولے۔

”برے۔۔۔۔۔ تو پھر دیر کس بات کی۔ جلدی سے اس خیالی پیکر کو نگاہوں کے سامنے لائیں اور جلدی سے اظہار عشق کر ڈالیں۔ یہ نہ ہو وقت گزر جائے اور آپ پچھتاتے رہ جائیں۔“ شاذان اپنی ہی ہانکے جا رہا تھا۔ فواد نے نظر اٹھا کر آریان کی طرف دیکھا، وہ انہی کی جانب متوجہ تھی۔ ان کی آنکھوں کا عجیب گہرا سائہ دیکھ کر اس نے نگاہیں جھکا لیں، فواد بولنے لگے تو شاذان نے ٹوک دیا۔

”یوں نہیں کھڑے ہو کر۔“ وہ انھہ کھڑے ہوئے پھر دو تین قدم پر سے ہٹ کر سامنے کی سمت رخ کر کے کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے ایک نظر سامنے یوں دیکھا جیسے ان کا خیال کسی پیکر کے سانچے میں داخل کران کی نگاہوں کے سامنے آ گیا ہو۔ ان سے بہت قریب۔ دھڑکنیں ایک روحم سے دھڑکنے لگیں۔ ایک پل کی خاموشی کے بعد وہ گویا ہونے ہی والے تھے کہ شاذان بول اٹھا۔

”ویسے اس خیالی محبوبہ کا کوئی نام بھی تو ہونا چاہئے۔“ روبیہ اور ایقہ نے بھی تائید کی۔
”ربیعہ کیسار ہے گا فواد بھائی.....“

”انتہائی بومس.....“ فواد شرارت سے آریان کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ ”دیکھو بھی چاند کو جس نام سے بھی پکارا جائے، چاند ہی رہے گا، پھول کو کسی نام سے پکاریں تب بھی اس کی خوشبو پر کوئی اثر نہیں پڑتا تو پھر محبوبہ کو بھی جو مرضی نام دیا جائے۔“ فواد نے کہا
”چلیں ٹھیک ہے اب جلدی کریں بے چاری محبوبہ انتظار میں سوکھ رہی ہے۔“ شاذان نے کہا تو فواد نے چہرے پر سنجیدگی طاری کر کے پہلے حاضرین کی طرف دیکھا۔ پھر ان کی آنکھیں ایک مقام پر رک گئیں۔

”ہم کسی کو اپنی مرضی سے چاہ تو سکتے ہیں رباب! لیکن کسی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ تم بھی مجھ سے محبت کرو، محبت نے میرے درد دل پر بہت دیر سے دستک دی لیکن تمہارا کہنا ٹھیک نہیں کہ یہ یکطرفہ محبت ہے۔ کسی دل سے کسی دوسرے دل کے لیے محبت کی شعاعیں حصار چھینتی ہیں تو دل کسی کی طرف مڑتا ہے۔ اس کا ہوتا ہے، محبت بے سمت ہوتی ہے نہ رائیگاں ایک نظم سنو۔“ فواد ایک پل کور کے۔ سب کے سب بہت غور سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے حتیٰ کہ ظاہر جو کسی کام کے لیے ان کی طرف آیا تھا وہ بھی چپ کھڑا سن رہا تھا۔

اتنی بڑی ان دنیاؤں میں

اپنے نام کی تختی والی ایک عمارت

کتنے دکھوں کی اینٹیں چن کر گھر بنتی ہے

پتھر پتھر جوڑ کے دیکھو

میں نے بھی اک گھر بنایا

رنگوں، پھولوں، تصویروں سے اس کو سجایا

دروازے کی لوح پر اپنا نام لکھوایا

لیکن اس کے ہر کمرے میں تم رہتے ہو!

”رباب! تمہیں پتہ ہے دکھوں کی ان اینٹوں کے درمیان تمہاری محبت..... تمہاری محبت کرنے کی نلگن سکون اور تسکین ہے، تم انتہائی پُرسرت خوشی جیسی ہو۔ میں..... اس خوشی سے اپنا دامن بھر لینا چاہتا ہوں۔“ فواد خاموش ہو گئے۔ تالیوں کی آواز پر انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا شاید وہ بہت سنجیدہ اور خود فراموشی کی کیفیت میں چلے گئے تھے۔ آریان کی نظریں ان پر لگی ہوئی تھیں۔

”یہ لفظ..... یہ دھڑکتے لفظ تو تمہاری میراث تھے اور میں نے انہیں تقسیم کر دیا، تشہیر کر دی، ان

پاکیزہ ان چھوئے جذبوں کی..... جن سے تم خود بھی آگاہ نہیں ہو۔“ فواد کا دل یکدم ماحول سے اچاٹ سا ہو گیا۔

بھائی..... آپ تو ڈاکٹر کم شاعر زیادہ لگ رہے تھے۔“ شاذان ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔
”یہ لوگ، یہ جو میرے ارد گرد بیٹھے ہیں شاید ان لفظوں کو سمجھ نہیں پائے۔ مجھے اپنے رویے سے انہیں کسی قسم کے شک میں مبتلا نہیں کرنا چاہئے۔“ وہ سنبھل گئے۔

”جی ہاں..... ابھی ابھی آپ نے پرانی پاکستانی فلم کا ایک ٹریلر دیکھا۔ نادیہ مصیبہ کے سامنے سنٹوش صاحب کا اظہار عشق۔ تو اب باری ہے مس روبیہ کی کہ وہ بھی اس کار خیر میں شریک ہو جائیں۔“ شاذان نے پرچیاں روبیہ کے آگے ڈھیر کر دیں۔ اس نے پہلے سب پر ایک نگاہ ڈالی۔

”میری بھی تو کوئی سن لے..... انا اور باصر لڑ رہے تھے آپس میں۔ اتنی دیر سے کہنے کی کوشش کر رہا تھا کوئی سننے کو تیار ہی نہیں۔“ ظاہر تنگ آ کر چیخ پڑا۔

”کمال ہے..... اب بتا رہے ہو۔ شاذان جا کر بلالہ ڈانٹیں یہیں۔“ فواد نے شاذان کو اس کے ساتھ بھیج دیا۔ روبیہ نے پرچی اٹھا کر خود ہی پڑھی۔

”اپنے دائیں طرف بیٹھے شخص کو منہ چڑائیں۔“ روبیہ نے فرمائش پڑھ کر دائیں طرف دیکھا۔ دائیں طرف بیٹھا ہوا تو کوئی نہیں تھا البتہ اس طرف سے شاذان ادھر کو آ رہا تھا بعد بچوں کی ننھی فوج لیے۔ روبیہ نے اس کو منہ چڑایا تو وہ وہیں سے مصنوعی غصے سے بولا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے.....“

”تمہاری فرمائش پوری کی جا رہی ہے۔“ روبیہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔

”میں نے کب کہا کہ میرا منہ چڑاؤ۔“ شاذان قریب آتے ہوئے بولا۔

”پرچی میں یہی لکھا ہوا تھا۔“ روبیہ نے کہا۔

”اچھا خیر! اب کون رہ گیا ہے؟“ شاذان نے پوچھا۔

”تم اور آریان.....“

”چلیں آریان۔ اٹھائیں پرچی.....“

”نہیں، میں تو نہیں کھیل رہی۔“ اس نے پہلو بچانا چاہا۔

”لیکن یہ آپ کو کھیل شروع کرنے سے پہلے بتانا چاہئے تھا، اب آپ کھیل میں شریک ہیں لہذا اصولاً آپ کو ہماری فرمائش پوری کرنی پڑے گی۔“

”پھر پہلے تم نکالو.....“ آریان نے اسے آگے کیا۔

”ٹھیک ہے، میں اٹھانے لگا ہوں لیکن آپ بھی مکرئیے گا مت۔“ شاذان نے پرچی اٹھا کر

با آواز بلند پڑھی۔

”مینڈک کی طرح کود کر دکھائیں۔“ ہر سامنہ بنا کر اس نے سب کی طرف دیکھا۔ سب بچوں نے مل کر تالیاں بجانیں۔

”تم لوگوں کو کس بات کی خوشی ہو رہی ہے۔“

”شانی بھائی! ہم سوچ رہے ہیں آپ مینڈک کی طرح اچھلتے کیسے لگیں گے۔“

”کیوں تمہیں سوچنے کی کیا ضرورت..... کبھی آئینہ نہیں دیکھا تم نے مینڈک کہیں کے۔“

شاذان نے اظہر کو جھاڑا لیکن غصہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا آخر اسے فرمائش پوری کرتے ہی بنی۔ ایتھہ اٹھ کر صابروہ کے ساتھ برتن وغیرہ سیٹ کروانے میں لگ گئی۔ لٹچ کا ٹائم ہو گیا تھا سو صابروہ نے اسٹوڈ گاڑی سے نکال کر باہر رکھا اور لٹچ والا ہاٹ پاٹ نکال کر کھانا گرم کرنے میں لگ گئی۔

”اب اس کھیل کے آخری کھلاڑی کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ پرچی اٹھائیں اور فرمائش پوری کر کے اس کھیل کو خوشگوار اینڈ سے ہمکنار کریں۔“ شاذان نے خالصتا کنفیشروں والے انداز میں کہا۔

آریان نے بے بسی سے فواد کی طرف دیکھا انہوں نے کندھے اچکا کر خود کو غیر جانبدار ظاہر کیا پھر اس کی نظریں روبیہ اور ایتھہ کی طرف انھیں۔

”یہ کیا آپ جماعتیوں کی تلاش میں ادھر ادھر رنگا ہیں دوڑا رہی ہیں۔ اس وقت ان میں سے کوئی آپ کی ہیلپ نہیں کرے گا۔“ شاذان نے اس کی چوری پکڑ لی۔

”بالکل آریان آپنی..... آپ کو بھی اب کچھ نہ کچھ کرتب دکھانا پڑے گا۔“ ایتھہ نے شاذان کا ساتھ دیا۔

”میں کیا سرکس سے بھاگی ہوئی لگتی ہوں کچھ نہ کچھ کرتب دکھاؤں۔“ آریان مصنوعی ناراضگی سے بولی۔

”اونہوں..... کوئی عذر نہیں جلدی سے پرچی اٹھائیں۔“ شاذان کسی طور نلنے کو تیار نہ تھا آخر مرتے کیا نہ کرتے کے مصداق اس نے پرچی اٹھا کر شاذان کے ہاتھ میں تھما دی۔ شاذان نے کھول کر پڑھی اور پھر سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

”تم کیوں مراقبے میں پڑ گئے۔ کیا بہت مشکل فرمائش ہے۔“ آریان گھبرا کر بولی۔

”حاضرین و سامعین..... اب آپ کے سامنے تشریف لارہی ہیں مس آریان ننی ابھرتی ہوئی گلوکارہ جو آپ کو بے حد خوبصورت گیت سنائیں گی۔“ شاذان نے جیسے کوئی اہم فریضہ سرانجام دیا۔

”مُزے..... اب مزہ آئے گا۔“ طاہر اور دیگر بچے خوشی سے تالیاں بجانے لگے۔

”تم سب کس خوشی میں اچھل رہے ہو، وہ کیا تمہیں لوری سنانے لگی ہے۔“ روبیہ نے بچوں کو

لتاڑا تو وہ بے چارے خاموش ہو گئے۔

”لیکن میں نے کبھی گانا نہیں گایا۔“ آریان نے ڈھکے چھپے لفظوں میں انکار کیا۔

”یہ کہاں لکھا ہے کہ جو کام زندگی میں نہ کیا وہ کبھی کرنا بھی نہیں چاہئے۔“ ایتھہ نے اس کا یہ عذر رد کر دیا۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں مجھے شاعری سے تھوڑا بہت لگاؤ ہے لیکن میوزک سے بالکل نہیں ہے۔“

”جسے شاعری پسند ہو وہ کبھی میوزک کو ناپسند کر ہی نہیں سکتا۔ آپ کو ہمیں گیت سنانا پڑے گا۔“

شاذان نے اصرار کیا تو آریان نے بے بسی سے سر جھکا لیا۔

”آریان..... پلیز جلدی سے ہماری سماعت کو سکون بخشنے تاکہ ہم پھر پیٹ پوجا کی تیاری کریں۔ بھوک سے چوے لگن مٹی کھیلنے لگ گئے ہیں پیٹ میں۔“ شاذان نے باقاعدہ پیٹ پکڑ کر دہرا ہوتے ہوئے کہا۔

”چلیں گیت نہ سنی کوئی غزل ہی سنا دو۔“ مہوش بھی جیسے اصرار کرنے والوں میں شامل ہو گئی۔

”یقین کیجئے آپ سب کی خواہش کو رد کرنا مجھے اچھا نہیں لگ رہا لیکن حقیقت یہی ہے کہ میں نے اپنی ساری عمر میں کبھی کوئی گیت نہیں گایا نہ ہی سنا۔“ آریان بولی۔

”چلیں گیت اور غزل نہ سنی..... بچپن میں آپ کی امی نے آپ کو لوری تو سنائی ہوگی۔ وہ لوری ہی سنا دیں۔“ چمن..... چمن..... چمن..... وقت کی جھیل میں بڑا بے رحم پتھر گر ا تھا۔

اندر کہیں بہت پر شور طوفان اٹھا تھا، کہیں دور گھنگھریلوں کی جھنکار بلند ہوئی۔ طبلے پر تھاپ پڑی اور..... اکی سسکیاں روہم کے ساتھ درد بھری لے پر گنگنا نے لگیں۔

اور کچھ دیر میں لٹ جائے گا ہر پام پہ چاند

عکس کھو جائیں گے آئینے ترس جائیں گے

عرش کے دیدہ نمناک سے باری باری

سب ستارے سر خاشاک برس جائیں گے

آس کے مارے تھکے ہارے شبستانوں میں

اپنی تہائی سیٹے گا بچھائے گا کوئی

بے وفا کی گھڑی ترک مدارات کا وقت

اس گھڑی اپنے سوا یاد نہ آئے گا کوئی

ترک دنیا کا سماں، ختم ملاقات کا وقت
اس گھڑی اے دل آوارہ کہاں جاؤ گے
اس گھڑی کوئی کسی کا بھی نہیں، رہنے دو
کوئی اس وقت ملے گا ہی نہیں، رہنے دو
اور ملے گا بھی تو اس طور کے پچھتاؤ گے
اس گھڑی اے دل آوارہ کہاں جاؤ گے؟

ہوا کی سسکیاں تھم چکی تھیں، گھٹکھروں کی صدا اپنے ہونے کا احساس کھو چکی تھی لیکن اس کے اندر مسلسل کوئی بین کر رہا تھا۔ سمندر جیسی گہری آنکھوں کے ساحل بھینکنے لگے۔ وہ سب تالیاں بجا رہے تھے۔ بکرا مسکرا کر داد دے رہے تھے لیکن اس کی بھیگی آنکھیں اور ان بھینکنے آنکھوں کے پس پردہ اٹھتے سماں صرف فواد کی نگاہیں دیکھ پائی تھیں۔ وہ سنجل گئی، ہونٹ بھیج کر سسکیوں کا گھاگھونٹ کر مسکرانے کی کوشش کرتی آریاں فواد کی مسند دل پر انتہائی تمکنت سے جلوہ افروز ہو گئی۔

ان نہ بننے والے آنسوؤں کی پاکیزگی نے فواد کے دل میں اگر کوئی ہلکا سا شک تھا بھی تو دھو ڈالا تھا۔ وہ بھی سب کے ساتھ شامل ہو گئے۔ لٹچ کرنے کے بعد بھی وہ کافی دیر وہاں ٹھہرے تھے لیکن آریاں کہیں کھو گئی تھی اس کا وجود ان سب کے درمیان تھا وہ جس بھی رہی تھی باتیں بھی کر رہی تھی لیکن ذہن کے گمنام گوشوں میں ماضی کے نشتر چمکے لگا رہے تھے اور اس کی یہ کیفیت محسوس کر کے فواد نے واپسی کا اعلان کر دیا۔ اس نے تشکر بھری نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔ حقیقتاً وہ اس وقت صرف تنہائی چاہتی تھی، اس کے وجود کے اندر دھواں سا بھر رہا تھا۔ آخر یہ غبار اسے اکیلے تنہائی میں بیٹھ کر ہی نکالنا تھا۔ سب گاڑی میں بیٹھ کر واپسی کی راہ پر غارم سفر ہو گئے لیکن ان سب میں دورانی ایسے تھے جنہوں نے آگے کا سفر شروع کر دیا تھا باقی سب نے تو چند لمحوں میں منزل پر پہنچ جانا تھا لیکن ان دور راہیوں کی مسافت تو اب شروع ہوئی تھی۔



”میں نے پچھلے دنوں بھی آپ کو بتایا تھا کہ سعود بھائی زین کے لیے اپنی مہوش کا رشتہ مانگ رہے ہیں۔ آپ نے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔“ اس وقت رات کا کھانا کھا کر سب اپنے اپنے کمروں میں تھے۔ باہر چچا کا موڈ بھی آج بہتر ہی تھا سوزا بہ چچی کو یہی وقت مناسب لگا کہ وہ بات چھیز دیں جو پچھلے کئی دنوں سے باہر چچا کے ساتھ ڈسکس نہ کرنے کی وجہ سے التواء میں پڑی ہوئی تھی۔

”کیا جواب دوں۔۔۔۔۔“ باہر چچا ہنوز اپنے سامنے موجود کتاب کی طرف متوجہ رہے۔

”یہ بھی اچھی رہی۔۔۔۔۔ بھیجی جینی کا معاملہ ہے کوئی رائے تو دیں۔۔۔۔۔“
”کیسی رائے؟“ انہوں نے اب بھی کوئی خصوصی توجہ نہ دی۔

”یہ موٹی کتاب ایک طرف رکھ دیں اور میری بات توجہ سے سنیں تو پتا چلے۔“ دوزخ ہو کر بولیں۔
”یہ لور کھدی کتاب۔۔۔۔۔ بولو۔۔۔۔۔“ انہوں نے کتاب بند کر کے بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھی اور ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”میں کہہ رہی تھی کہ زین اچھا لڑکا ہے۔ پڑھا لکھا اچھی نوکری پر لگا ہوا ہے۔ ہماری بچی کو خوش رکھے گا۔“ زاہدہ چچی کے لہجے میں بھینچے کی محبت محسوس کر کے باہر بھائی مسکرا دیئے۔
”تمہیں بھتیجا زیادہ پیارا ہے یا بچی۔“
”ہیں۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی۔۔۔۔۔؟“

”میں نے جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔“
”ظاہری بات ہے اپنی بیٹی ہی پیاری ہے۔ پر بھتیجا بھی تو بھیمیں کالا ڈالا ہوتا ہے۔“
”لیکن تمہیں کس نے بتا دیا کہ تمہارا وہ لاڈلا اچھا لڑکا ہے۔“ باہر چچا بولے تو چچی کو تو جیسے مر چیں لگ گئیں۔

”ناں مطلب کیا ہے اس بات کا۔۔۔۔۔ کیا برائی دیکھ لی اس میں؟“
”دیکھو زاہدہ! تم اس کی جس چیز سے متاثر ہو۔ کم سے کم متاثر ہونے کے لیے میرے نزدیک دو کوئی خاص چیز نہیں ہے۔ تم نے اس کی دولت دیکھی ہے یا پھر اس کے اکلوتے ہونے کا خیال ہو گا تمہیں۔“
”ہاں تو اور کیا ہونا چاہئے، ماشاء اللہ تین تین گاڑیاں کھڑی ہیں ان کے گھر میں۔ گھر کو دیکھ کر کسی محل کا گمان ہوتا ہے پھر مہوش کو لندن دیکھنے کا شوق بھی بہت ہے۔“
”زاہدہ تم فیصلہ کر چکی ہو یا مجھ سے پوچھ کر کرنا چاہتی ہے۔“ باہر چچا ٹھنڈے لہجے میں بولے۔
”کمال ہے آپ کے بغیر تمہیں کیسے فیصلہ کر سکتی ہوں۔“

”تو پھر میری مان لو کہ مہوش کو اپنے اور اس کے شوق کی بھینٹ مت چڑھاؤ۔ خوشیوں کے لیے صرف دولت اور اسٹینس کافی نہیں ہوتا۔“

”لیکن آخر زین میں برائی کیا ہے۔۔۔۔۔“ زاہدہ چچی باہر چچا کے سرد لہجے پر جیسے کڑھ کر بولیں۔
”تم نے محض وہ سنایا دیکھا ہے جو تمہیں دکھایا اور سنایا گیا ہے جبکہ میں اس کے متعلق وہ کچھ جانتا ہوں جو شاید اس کے اپنے ماں باپ نہیں جانتے۔“
”مثلاً۔۔۔۔۔“

”وہاں لندن میں بہت سی انگریز عورتوں کے ساتھ فریڈ شپ ہے اس کی۔ دو شادیاں کر چکا ہے

وہ ان میں سے ایک عورت اس کے بچے کی ماں بھی ہے۔ پھر تم خود بتاؤ سب کچھ جانتے بوجھتے مہوش کو کنویں میں کیسے دھکیل دوں۔“

”یہ سب کس نے بتایا آپ کو..... کیا ثبوت ہے آپ کے پاس؟“ زاہدہ چچی تو آگ بگولا ہو گئیں اپنے بھتیجے کے کروت سن کر۔

”احسن میرے دوست کو شاید تم جانتی ہو اسی شہر اس انسٹیٹ میں رہائش پذیر ہے وہ جہاں تمہارا بھتیجا رہتا ہے۔ جب تم نے پہلی بار مہوش اور زین کے رشتے کی بات کی تھی میں نے تب ہی احسن سے اس کے بارے میں ساری معلومات لے لی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ پھر میں نے اس رشتے پر غور نہیں کیا۔“

باہر چچا رسان سے بولے۔

”تو اس کا کیا ہوا، کیا حدیث ہو گیا؟ وہ غلط بھڑکا بھی سکتا ہے۔“

”کیوں اس کی کیا دشمنی زین سے۔“ باہر چچا کا دل چچی کی عقل پر ماتم کرنے کو چاہا۔

”ہو سکتا ہے وہ اپنی بیٹی کا رشتہ دینا چاہتا ہو بہر حال یہ تو ماننے والی بات نہیں البتہ دوستی کی جہاں تک بات ہے تو وہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔“ چچی نے ان کا اعتراض سرے سے ہی مسترد کر دیا۔

”بھتیجے کی محبت کی پٹی آنکھوں سے اتار کر دیکھو۔ بالفرض محال ایسا ہے بھی جیسا تم کہہ رہی ہو تب بھی رنگ رنگ کی عورتوں سے دوستی کرنے والے شخص کا کیا اعتبار کل کو اسے کوئی زیادہ پسند آ جائے اور وہ اسے اپنے گھر لے آئے پھر مہوش کا کیا بنے گا؟“

”کوئی بھی نہیں ایسا، رنگ رنگ کی عورتوں کو مرد گھر سے باہر ہی رکھتا ہے، مگر والی کا رتبہ ہر ایک کو نہیں دیا جاتا۔“

”زاہدہ..... بحث مت کیا کرو۔ مہوش میری بیٹی ہے اور اس کی زندگی کا فیصلہ میں سوچ سمجھ کر کروں گا، میں کسی آوارہ، بد قماش شخص سے اپنی بیٹی کا رشتہ طے نہیں کروں گا۔“ باہر چچا چچی کی بحث سے تنگ آ کر ڈرا بلند آواز میں بولے۔

”باہر! آپ ناراض کیوں ہو رہے ہیں۔ مہوش آپ کی بیٹی ہے تو کیا میری کچھ نہیں لگتی۔ میں ماں ہوں اس کی، اس کے مستقبل کے بارے میں غلط فیصلہ کیسے کر سکتی ہوں۔“ چچی رسانیٹ سے بولیں۔

”لیکن یہاں تمہارا فیصلہ ٹھیک نہیں ہے اسی لیے میں بول پڑا ہوں..... آج تک اس گھر میں ہونے والے ہر فیصلے کی خود مختاری تمہیں دی ہوئی تھی کہ یقین تھا مگر اور گڑبستی کو بھننے والی عورت ہو لیکن یہاں مجھے مداخلت کرنی پڑے گی کیونکہ یہ مہوش کی ساری زندگی کا معاملہ ہے۔“ باہر چچا ضبط اور تحمل کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

”آخر خرابی کیا ہے زین میں.....؟“ زاہدہ چچی کی فطری بہت دھرمی وراثی تھی۔ جب وہ کوئی

فیصلہ کر کے اس پر قائم ہو جاتی تھیں تو پھر مد مقابل کو زیر کرنے کی خاطر بحث و تکرار تک بات پہنچتی ہی نہ تھی۔

”ابھی بتایا نہیں تمہیں..... طوائفوں جیسی عورتوں کے ساتھ دوستیاں ہیں اس کی جن لوگوں میں اس کا انصاف بٹھنا ہے وہ اچھے لوگ نہیں۔“

”تو یہ کوئی اتنی قابل اعتراض بات بھی نہیں..... جوانی میں سبھی ایسی حرکتیں کرتے ہیں بعد میں خود ہی سدھر جاتے ہیں۔“ چچی کی لاپرواہی دیدنی تھی۔ باہر چچا کا تو خون ہی کھول اٹھا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا..... یعنی اس میں کوئی قابل اعتراض بات ہی نہیں۔ زاہدہ بیگم ایک آوارہ مزاج شخص کو اپنی بیٹی کا رشتہ دے دینا تمہارے لیے لائق داد و تحسین ہو گا لیکن میرے لیے نہیں۔“

”لیکن میں مہوش کی شادی وہیں کرنے کا ارادہ کر چکی ہوں۔“

”جب تم فیصلہ کر چکی ہو تو میرا مشورہ میری رائے کس لیے مانگ رہی ہو۔ زاہدہ بیگم اولاد کوئی کھلونے نہیں ہوتے جنہیں جہاں جی چاہے اٹھا کر رکھ دو، ان کی زندگیوں کے فیصلے بہت سوچ سمجھ کر کرنے ہوتے ہیں جبکہ تم تو مجھے آنکھوں دیکھی کبھی لکھنے کو کہہ رہی ہو۔“

”باہر! میں نے کہہ دیا مہوش کی شادی وہیں ہوگی۔“ چچی کے حتمی لہجے کو محسوس کر کے باہر چچا بھڑک اٹھے۔

”تمہاری عقل پر تو پتھر پڑ گئے ہیں زاہدہ بیگم..... بھتیجے کی محبت میں بیٹی کی زندگی تباہ کرنے پر عمل گئی ہو تم..... لیکن میرے حواس ابھی سلامت ہیں۔ میں یہ رشتہ ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔“ وہ دونوں ایک دوسرے کے مخالف ڈٹے ہوئے تھے۔ لہجوں کی تلخی آواز کے مد و جز کو بلند کرتی گئی۔ فواد مہوش اور شاذان ان کی آوازیں سن کر اپنے کمروں سے نکل آئے۔ ان کے کمرے کے دروازے میں کھڑے وہ

ان دونوں کو دیکھ رہے تھے لیکن ماحول کی کشیدگی کے باعث ان میں سے کسی نے بھی آگے بڑھ کر مداخلت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ باہر چچا کا مسلسل انکار چچی کو مزید اشتعال دکا رہا تھا۔

”میں سمجھ سکتی ہوں کہ مہوش وہاں خوش رہے گی۔“

”بالکل..... تم صحیح کہہ رہی ہو جب تمہارا بھتیجا رنگ رنگ کی عورتوں کے پاس جائے گا تو مہوش کی زندگی واقعی بہت خوشگوار ہو جائے گی، اس سے بہتر نہیں کہ اسے کسی اندھے کنویں میں پھینک دو۔“

باہر چچا طعنے لہجے میں بولے۔

”آپ..... آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں مہوش کی دشمن ہوں..... میں اس کی زندگی تباہ کرنا چاہتی ہوں۔“ چچی کھر دے لہجے میں بولیں۔

”میں مزید کچھ نہیں کہنا چاہتا سوائے اس کے کہ میں مہوش کی شادی ہرگز زین جیسے بے کردار شخص سے نہیں ہونے دوں گا۔“

”جن دنوں آپ رنگ برنگی عورتوں کے پاس جاتے تھے ان دنوں کردار کا یہ معیار کہاں تھا۔ وقت کتنا گزرا ہے آپ کو وہ سب چھوڑے ہوئے، کبھی میرا یا ان بچوں کا خیال نہیں کیا آپ نے۔ لاکھوں روپیہ لٹا دیا اس کل موسمی پر۔ وہ طوائف جو آپ کو اپنی بیوی اپنے بچوں سے زیادہ عزیز ہو گئی، ایک بار بھی شکوہ نہیں کیا۔ میں نے کبھی ان لکھوں کا حساب نہیں مانگا مگر نہ شوق تو آپ کے بھی ایسے ہی تھے۔“ غصہ اور اشتعال انسان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب کر لیتا ہے۔ وہ بھی غصے کے عالم میں کہتے ہوئے بالکل فراموش کر بیٹھیں کہ ان کے منہ سے نکلنے والا ایک ایک لفظ صرف باہر چچا کی ہی نہیں ان کی اولاد کی سماعت میں بھی محفوظ ہو رہا تھا۔ وہ یکدم چپ ہو گئیں۔ باہر چچا کی آنکھیں کسی نکتے پر مرکوز جیسے ساکت تھیں اور چہرے کا رنگ متغیر تھا۔ چچی نے ان کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو جیسے سن ہو کر رہ گئیں، دروازے کے فریم میں سجے تینوں چہرے نوزائیدگی سے لے کر جوانی تک ان کے وجود سے ایک ایک قطرہ خوشی کشید کرتے رہے تھے لیکن اس وقت ان کی نظروں میں ایسی بے یقینی اور بے اعتباری تھی کہ ایک ہل کو زائد چچی جیسے اپنے اندر کٹ کر رہ گئیں۔

”یہ کیا ہو گیا..... جس راز کو برہا برہا اپنے سینے میں چھپانے کیلئے سسرال کے دورا ہوں پر میں آبلہ پا چلتی رہی لیکن کسی کو کانوں کا خبر تک نہ ہوئی کہ کون سا درد سینے میں سنبھالے پھرتی ہوں۔ آج وہ راز بے دھیانی میں لیوں پر کس وقت آگیا، جو ان اولاد کے سامنے کتنا نامعتبر کر دیا میں نے اپنے شریک زندگی کو۔“

یہ ایک حقیقت تھی کہ شادی کے دو تین سال بعد وہ زمر کے عشق میں گرفتار ہو گئے تھے لیکن ان کا یہ عشق چھ سات سال سے زیادہ نہ چلا۔ وجہ وہ بھول تھے جو ان کے آگن میں کھل چکے تھے۔ ان پھولوں کی آبیاری ان کی ساری توجہ اور محبت کی طلبگار تھی اور انہوں نے ان پھولوں کو حوادث زمانہ کی خزاں سے بچانے کے لیے اپنی جان لڑا دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ آج ان کے تینوں بچے تعلیمی قابلیت، کردار، اخلاق کسی چیز میں بھی کسی سے کم نہ تھے لیکن زائدہ چچی نے ان کی ریاضت ضائع کر دی تھی۔

وہ تو اسی لمبے ٹوٹ گئے جب انہوں نے اپنے بچوں کی آنکھوں میں اپنے لیے بے یقینی اور اعتماد کے مجروح آئینے کی کرچیاں دیکھیں۔ کمرے میں پانچ نفوس تھے لیکن ہر ایک اپنی اپنی سوچ میں گم، فواد، مہوش اور شاذ ان کے قدم جہاں تھے وہیں رکے ہوئے تھے۔ زائدہ چچی پچھتاوؤں کے بوجھ تلے دبی سہی دھڑکنیں شمار کر رہی تھیں اور باہر چچا کفایتیں باکس کے اندر اعتراف گناہ کر چکنے والے مجرم کی طرح سر جھکائے بیٹھے تھے۔ کچھ دیر کی جان لیوا خاموشی کے بعد باہر چچا اپنی جگہ سے اٹھے اور کمرے سے باہر نکل گئے۔ انہوں نے کسی کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا شاید وہ خود میں اتنی ہمت نہیں پارہے تھے کہ اپنے ماضی کا وہ تاریک گوشہ جو انہوں نے ہر ایک سے چھپا کر رکھا، یوں ان کی اولاد کے سامنے بے

نقاب ہوا کہ لکھوں میں وہ اپنے مقام سے بہت نیچے آ گئے۔ نظروں سے گرنے انہیں برداشت نہیں ہو رہا تھا، وہ اندر کے شور سے گھبرا کر گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ ماحول میں قدرے خشکی سی تھی، وہ پیدل چلتے گئے، باہر کے سنانے نے اندر موجود شور کو جیسے اور شوریدہ سر بنا دیا تھا۔ جانے ان کے قدموں نے کتنی مسافت طے کی، گھر کہیں بہت پیچھے رہ گیا جو کبھی ان کے لیے جائے پناہ، جائے اماں تھا لیکن آج عدالت کے کٹہرے کی طرح بے حس واقعہ ہوا تھا۔ وہ گھر اور اس گھر کے کہیں بہت دور رہ گئے تھے۔ چلتے چلتے انہیں محسوس ہوا جیسے پیروں میں سکت نہ رہی ہو شاید آبلے بن چکے تھے یا پیروں کے ٹکڑے چھل گئے تھے۔

ناگلوں میں جان نہ رہی تھی۔ انہوں نے سراٹھا کر ارد گرد دیکھا، بالکل خاموش فضا۔ وہ شہر سے غالباً باہر نکل آئے تھے، دور تک جاتی خاموش سڑک اور اس کے ارد گرد لگے بلند و بالا درخت۔ اندھیرا بہت گہرا ہو چکا تھا شاید رات کا پہلا پہر اختتام پزیر تھا۔ وہ جیسے تھکن کے آگے ہتھیرا ڈالتے ہوئے سڑک کے کنارے لگے درخت سے ٹیک لگا کر نیچے گھاس پھیر بیٹھ گئے۔ جیب سے سگریٹ کی ڈبی نکالی ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبائی اور سلا کر گہرے گہرے کھینک کش لیے۔

”کیا محض چند جملوں سے زندگی کی تمام محنت رائیگاں جاسکتی ہے۔ کیا لفظوں میں اتنی طاقت ہوتی ہے جو یوں ریاضت کو بے ثمر کر کے رکھ دے؟ زمر..... تمہاری محبت کو ٹھکرانے کی سزا مجھے اور کس کس صورت میں ملے گی؟“ باہر چچا اپنے دل کے نہاں گوشوں میں جھانکنے لگے جہاں ایک چہرہ وقت کی دھول سے دھندلایا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اپنے ہونے کا ماتم کرتا ہوا۔

”یہ گرد تو باہر شاہ تم نے خود اس معصوم چہرے کا مقدر کی ہے پھر اب کیوں شرمندہ ہو۔“ باہر چچا نے اس گد لے آئینے میں عکس کی طرح جھللاتے اس دھندلے لودیتے ہوئے چہرے کو دیکھتے ہوئے خود دکھائی کی۔ آنکھوں کے آگے سیاہ چادر حائل ہو گئی پھر اس چادر پر روشنی جھللاتے لگی اور اس روشنی میں کچھ سائے سے متحرک ہو گئے۔

”زمر..... محفل اپنے پورے جو بن پر ہے مگھر وہ باندھ لو۔“ بڑی آپا گاؤں کے سے ٹیک لگاتے ہوئے بولیں۔

”آپا چند منٹ ٹھہریے.....“ زمر کی بے چین نگاہیں بیرونی دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔

”ارے کا ہے چھمک چھلو..... کس کا اتجار ہے ری۔“ پان چباتا ہوا کوئی سینٹھ نشے میں ڈوبی آواز میں بولا۔

”کچھ نہیں سینٹھ صاحب! بس غفل شروع کیے دیتے ہیں۔“ آپا عاجزی سے بولیں۔ غالباً کوئی موٹی آسامی تھا وہ شخص۔

”زمر..... مجر شروع کرو..... طوائفوں کو انتظار اس نہیں آتا۔ کوٹھے میں رہتی ہو تو یہاں کے

اصول بھی سمجھو۔۔۔ بڑی آپا کے لہجے میں محسوس کی جانے والی سختی سے مجبور ہو کر زمر نے ہتھکڑیاں باندھ لیں۔

وہ آنکھیں بند کیے خود فراموشی کی کیفیت میں رقص کر رہی تھی۔ تماش بینوں پر جیسے سادھاری ہو گیا تھا۔ گیت کے بول تھے یا اس کے دل کی آواز۔ جذبوں کی تمام تر شدتیں ایک محور پر جمع ہو کر پکار اٹھی تھیں اور گوہر مقصود نے در پر قدم رکھا۔ بابر شاہ اپنی بھرپور شان و شوکت کے ساتھ دروازے سے اندر داخل ہوئے تھے۔ بڑی آپا خوشی سے ان کے استقبال کو اٹھنے لگیں لیکن انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں اٹھنے سے روک دیا۔ ان کے ہمراہ ان کا دوست فیاض بھی اکثر یہاں آتا تھا اس وقت بھی وہ ان کے ساتھ ہی تھا۔

انہوں نے اس کے ہاتھ سے بریف کیس لے کر کھولا۔ سو سو کے نوٹوں کی گڈیاں نکالیں اور زمر پر نچھاور کر دیں۔ کڑکڑاتے ہوئے نوٹوں کی چمک سے جہاں بڑی آپا کی آنکھوں میں مسرت لہرائی تھی وہیں زمر کی بند پٹلیں ایک جھٹکے سے کھلی تھیں۔ انتظار کا نتیجہ اس قدر سرد انگیز ہوتا ہے۔ طمانیت خمار بن کر اس کے پورے وجود پر چھا گئی۔ طبلے کی تھاپ نے لے بدلی۔ ہتھکڑیاں ایک ہل کور کے۔ زمر کی خمار آلود نگاہوں نے جھک کر بابر شاہ کی قدم بوسی کی اور پھر نئی تال پر رقص شروع ہو گیا۔

اپنے دردوں کا کٹ پہن کر
بے دردوں کے سامنے جائیں
جب رونا آئے مسکائیں
جب دل نوئے دیپ جلائیں
پریم کٹھا کا انت نہ کوئی
مکنتی بار اسے دہرائیں
پریت کی ریت انوکھی سا جن
کچھ نہ مانگیں، سب کچھ پائیں
فیض ان سے کیا بات چھپی ہے
ہم کچھ کہہ کر کیوں پچھتائیں

رقص ہوتا رہا، گیت گائے جاتے رہے، رات بھٹکتی رہی۔ سازوں کے تھمتے ہی تماش بین اٹھ اٹھ کر جانے لگے۔ کچھ روشن شبستانوں میں تارکیوں کی آغوش میں سینے چلے گئے۔ وسیع و عریض کمرے کے فرش پر پھول کی پتیوں اور نوٹوں کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا۔ سبے ترتیب گاؤں کیوں اور ممکن آلود چادروں نے کمرے کی ہیئت ہی بگاڑ دی تھی۔ زمر نے ہتھکڑیاں ایک طرف رکھے اور سچ کچھ قدم اٹھائی بابر

شاہ کے قریب آ گئی۔ اس کی آنکھوں کے لودیتے جذبوں کے آگے بابر شاہ نے ہمیشہ خود کو بے بس سمجھا تھا۔ فیاض کو بریف کیس تھا کر انہوں نے اسے باہر گاڑی میں بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ چلا گیا۔

”شاہ صاحب! آپ نے اس بیٹھنا ہے؟“ بڑی آپا نہیں ہنوز براجمان دیکھ کر بولیں۔

”جی نہیں۔۔۔۔۔ بس زمر سے چند باتیں کرنی ہیں۔“

”سو بار کریں۔۔۔۔۔ میں تو اس لیے پوچھ رہی تھی کہ اگر ابھی بیٹھتا ہے تو اندر کمرے میں چلے جائیجے۔۔۔۔۔ یہ کمرہ اس وقت آپ کے شایان شان نہیں ہے۔“ وہ ضرورت سے زیادہ کھنکھانے کی عادی معلوم ہو رہی تھیں۔

”آپا آپ کہاں جا رہی ہیں۔۔۔۔۔“ بڑی آپا کو اٹھتے دیکھ کر زمر نے پوچھا۔

”بھئی میں تو سونے جا رہی ہوں۔۔۔۔۔ آدھی سے زیادہ رات بیت چکی ہے تم شاہ صاحب کی کوئی خدمت کرو، کوئی مشروب چائے پانی پوچھو انہیں۔ اچھا شاہ صاحب مجھے تو آپ اجازت دیجئے، یہ زمر ہے آپ کے پاس جب تک آپ کا دل چاہے بیٹھیں اسے اپنا ہی دولت خانہ سمجھیں۔“

بابر شاہ ایک ایک لفظ میں چھپے معافی اور رخصت جاننے والوں میں سے تھے، نوٹوں کی چمک بہت غیر معمولی ہوتی ہے اور طوائف تو ہوتی ہی دولت کی رشتہ دار ہے۔ بابر شاہ زمر کو پسند کرتے تھے اسی لیے اہامیاں، زاہدہ بیگم اور گھر والوں کی پرواہ کیے بغیر اس سے ملنے چلے آتے تھے۔ یہ سوچے بغیر کہ جب گھر والوں کو علم ہوگا تو کیا نتیجہ نکلے گا؟

بڑی آپا بیرونی دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

”شاہ جی! آج آپ نے بہت دیر کر دی! آپ کیا جانیں انتظار کی کتنی اذیت سہی میں نے۔“

زمر داغلا کر بولی، جانتی تھی بابر شاہ کی دھڑکنوں پر اس کا نام لکھا ہے پھر وہ خود پر کیوں نہ تازہ کرتی۔

”زمر! ہماری زندگی تقسیم شدہ ہے، ہمارے وقت میں بہت سے سانچے دار ہیں اور تم اچھی طرح جانتی ہو کہ ہم خیانت کرنے والوں میں سے نہیں ہیں، تمہاری محبت جب بھی اپنا حق مانگتی ہے ہم تمہارے پاس چلے آتے ہیں۔“ بابر شاہ نے کہا۔

”شاہ جی! اس محبت کے آگے ہارنے لگی ہوں میں۔۔۔۔۔ میرا اب اس ماحول اس فضا میں دم ٹھٹھا ہے۔ خدا را مجھے یہاں سے لے چلیے۔“

”یہ ناممکن ہے زمر! تم جانتی ہو ہم شادی شدہ ہیں، ہماری بیوی ہے، بچے ہیں، وہ تمہیں قبول نہیں کریں گے۔“ بابر شاہ اپنی فطری سنجیدگی سے بولنے لگے۔

”شاہ جی! آپ ایک بار مجھے یہاں سے لے جائیں یقین کریں تمام عمر میں آپ کی بیوی اور بچوں کی کنیز بن کر رہوں گی۔۔۔۔۔ ساری زندگی آپ سے کوئی حق نہیں مانگوں گی، یہ تک نہیں کہوں گی کہ

اصول بھی سمجھو۔ "بڑی آپا کے لہجے میں محسوس کی جانے والی سختی سے مجبور ہو کر زمر نے گھٹکر دبانے لگے۔

وہ آنکھیں بند کیے خود فراموشی کی کیفیت میں رقص کر رہی تھی۔ تماش بینوں پر جیسے سکتے سا طاری ہو گیا تھا۔ گیت کے بول تھے یا اس کے دل کی آواز۔ جذبوں کی تمام تر شدتیں ایک محور پر جمع ہو کر پکار اٹھی تھیں اور گوہر مقصود نے در پر قدم رکھا۔ بابر شاہ اپنی بھرپور شان و شوکت کے ساتھ دروازے سے اندر داخل ہوئے تھے۔ بڑی آپا خوشی سے ان کے استقبال کو اٹھنے لگیں لیکن انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں اٹھنے سے روک دیا۔ ان کے ہمراہ ان کا دوست فیاض بھی اکثر یہاں آتا تھا اس وقت بھی وہ ان کے ساتھ ہی تھا۔

انہوں نے اس کے ہاتھ سے بریف کیس لے کر کھولا۔ سوسے نوٹوں کی گڈیاں نکالیں اور زمر پر پنچاؤر کر دیں۔ کڑکڑاتے ہوئے نوٹوں کی چمک سے جہاں بڑی آپا کی آنکھوں میں مسرت لہرائی تھی وہیں زمر کی بند پلکیں ایک جھٹکے سے کھلی تھیں۔ انتظار کا نتیجہ اس قدر سرور انگیز ہوتا ہے۔ طمانیت خمار بن کر اس کے پورے وجود پر چھا گئی۔ طبلے کی تھاپ نے لے بدلی۔ گھٹکر وایک پل کور کے۔ زمر کی خمار آلود نگاہوں نے جھک کر بابر شاہ کی قدم بوی کی اور پھر نئی تال پر رقص شروع ہو گیا۔

اپنے دردوں کا کٹ پہن کر
بے دردوں کے سامنے جائیں
جب رونا آئے مسکائیں
جب دل ٹوٹنے دیپ جلائیں
پریم کتھا کا انت نہ کوئی
گنتی بار اسے دہرائیں
پریت کی ریت انوکھی سا جن
کچھ نہ مانگیں، سب کچھ پائیں
فیض ان سے کیا بات چھپی ہے
ہم کچھ کہہ کر کیوں پچھتائیں

رقص ہوتا رہا، گیت گائے جاتے رہے، رات بھٹکتی رہی۔ سازوں کے تھمتے ہی تماش بین اٹھ اٹھ کر جانے لگے۔ کچھ روشن شبستانوں میں تارکیوں کی آغوش میں سینے چلے گئے۔ وسیع و عریض کمرے کے فرش پر پھول کی پتیوں اور نوٹوں کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا۔ بے ترتیب گاؤں کیوں اور شکن آلود چادروں نے کمرے کی ہیئت ہی بگاڑ دی تھی۔ زمر نے گھٹکر داتا کر ایک طرف رکھے اور سچ سج قدم اٹھاتی بابر

شاہ کے قریب آگئی۔ اس کی آنکھوں کے لودیتے جذبوں کے آگے بابر شاہ نے ہمیشہ خود کو بے بس سمجھا تھا۔ فیاض کو بریف کیس تھما کر انہوں نے اسے باہر گاڑی میں بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ چلا گیا۔ "شاہ صاحب! آپ نے اس بیٹھنا ہے؟" بڑی آپا انہیں ہنوز بدراجان دیکھ کر بولیں۔ "جی نہیں..... بس زمر سے چند باتیں کرنی ہیں۔"

"سو بار کریں..... میں تو اس لیے پوچھ رہی تھی کہ اگر ابھی بیٹھنا ہے تو اندر کمرے میں چلے جائیے..... یہ کمرہ اس وقت آپ کے شایان شان نہیں ہے۔" وہ ضرورت سے زیادہ مکھن لگانے کی عادی معلوم ہو رہی تھیں۔

"آپا آپ کہاں جا رہی ہیں....." بڑی آپا کو اٹھتے دیکھ کر زمر نے پوچھا۔ "بھئی میں تو سونے جا رہی ہوں..... آدمی سے زیادہ رات بیت چکی ہے تم شاہ صاحب کی کوئی خدمت کرو، کوئی شروب چائے پانی پوچھو انہیں۔ اچھا شاہ صاحب مجھے تو آپ اجازت دیجئے، یہ زمر ہے آپ کے پاس جب تک آپ کا دل چاہے بیٹھیں اسے اپنا ہی دولت خانہ سمجھیں۔"

بابر شاہ ایک ایک لفظ میں چھپے معافی اور رحیم جاننے والوں میں سے تھے، نوٹوں کی چمک بہت غیر معمولی ہوتی ہے اور طوائف تو ہوتی ہی دولت کی رشتہ دار ہے۔ بابر شاہ زمر کو پسند کرتے تھے اسی لیے ابامیساں، زاہدہ بیگم اور گھر والوں کی پرواہ کیے بغیر اس سے ملنے چلے آتے تھے۔ یہ سوچے بغیر کہ جب گھر والوں کو علم ہو گا تو کیا نتیجہ نکلے گا؟

بڑی آپا ہیر دنی دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

"شاہ جی! آج آپ نے بہت دیر کر دی! آپ کیا جانیں انتظار کی کتنی اذیت سہی میں نے۔" زمر داغلا کر بولی، جانتی تھی بابر شاہ کی دھڑکنوں پر اس کا نام لکھا ہے پھر وہ خود پر کیوں نہ تاز کرتی۔

"زمر! ہماری زندگی تقسیم شدہ ہے، ہمارے وقت میں بہت سے سانچے دار ہیں اور تم اچھی طرح جانتی ہو کہ ہم خیانت کرنے والوں میں سے نہیں ہیں، تمہاری محبت جب بھی اپنا حق مانگتی ہے ہم تمہارے پاس چلے آتے ہیں۔" بابر شاہ نے کہا۔

"شاہ جی! اس محبت کے آگے ہارنے لگی ہوں میں..... میرا اب اس ماحول اس فضا میں دم گھٹتا ہے۔ خدا ار مجھے یہاں سے لے چلیے۔"

"یہ ناممکن ہے زمر! تم جانتی ہو ہم شادی شدہ ہیں، ہماری بیوی ہے، بچے ہیں، وہ تمہیں قبول نہیں کریں گے۔" بابر شاہ اپنی فطری سنجیدگی سے بولے۔

"شاہ جی! آپ ایک بار مجھے یہاں سے لے جائیں یقین کریں تمام مر میں آپ کی بیوی اور بچوں کی کنیر بن کر رہوں گی..... ساری زندگی آپ سے کوئی حق نہیں مانگوں گی، یہ تک نہیں کہوں گی کہ

میری طرف نگاہ اٹھا کر دیکھیں۔ بس..... مجھے اپنا نام دے دیں۔ اپنی پہچان دے دیں۔ میں اس سے زیادہ کی طلبگار نہیں۔“ زمرہ کے لہجے میں درد تھا، سوز تھا..... تڑپ تھی۔ بابر شاہ کے دل میں اس کا دکھ بہت خاموشی سے درا آیا۔

”ہم جانتے ہیں زمرہ! تم بہت اچھی ہو..... بہت پاکیزہ۔ تمہاری محبت پا کر یقیناً ہمیں خود پر فخر محسوس ہو رہا ہے لیکن تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کریں یہ ہمارا ضمیر کبھی گوارا نہیں کرے گا، ہم صرف اپنی شریک زندگی کی وجہ سے انکار نہیں کر رہے بلکہ ہمارے بچے ہماری ساری محبت کے حقدار ہیں، ہم ان کی شخصیت میں کسی قسم کی کمی نہیں دیکھنا چاہتے۔ اسی لیے زمرہ آج ہم تم سے اجازت لیتے ہیں آج کے بعد ہم تمہارے پاس نہیں آئیں گے۔ گزشتہ سالوں کی رفاقت ایک حسین یاد بن کر ہمارے دل میں رہے گی، ہم تمہیں ٹھکرانے نہیں رہے۔ بعد ازاں ایسا کچھ مت سمجھنا۔“ بابر شاہ نے آنسوؤں سے جھللاتی آنکھوں میں ڈولنا اپنا ٹکس دیکھا۔ کتنی نا تمام آرزوئیں حسرت بن کر اس کے چہرے پر رقم ہو گئی تھیں۔ بابر شاہ نے رخصت ہونے سے پہلے بہت غور سے زمرہ کے چہرے کے ایک ایک نقش کو دیکھا تھا، اپنے اندر دلی جذبات سے مغلوب ہو کر انہوں نے زمرہ کی صبح پیشانی چومی تھی اور وہاں سے رخصت ہو گئے۔ سات سالوں میں یہ محبت کا پہلا لمس تھا جس سے وہ دونوں آشنا ہوئے تھے لیکن اس کے بعد ان کے راستے جدا تھے۔ ایک آبلہ پانی کا طویل سفر زمرہ کا مقدر کر کے انہوں نے پھر پلٹ کر اس کی طرف دیکھا تک نہ تھا کہ وہ بیمار وفا جیتی بھی ہے یا مر گئی۔ انگلیوں پر جلن کا احساس ہوا تو وہ جیسے چونک گئے۔ سگریٹ سلگ سلگ کر ختم ہو چکا تھا بالکل ان کی محبت، ان کی زمرہ کی طرح۔ انہوں نے سگریٹ پھینک دیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

کتنے ماہ و سال چند لمحوں میں سمٹ کر آ گئے۔ ”تمہارا دل نوٹ گیا تو بھائی میرے پاس بھی کچھ نہیں۔“ جیسے بچہ رستے پر چھوڑ کر تمہارا شاہ جی بھی کب منزل پر پہنچ سکا۔ تم جیتے جی مر گئیں زمرہ اور میں..... میں مر کر جیتا رہا۔ کتنا بوجھ تھا میرے دل پر تمہاری وفاؤں کا مگر میں نے وہ بوجھ کسی مردہ لاش کی طرح دل میں دفن دیا اور جس شریک زندگی کی خاطر میں نے تمہارے پندار وفا کا ٹھیس پہنچائی میں اس کا بھی کب بن سکا۔ جن بچوں کے لیے میں خود کو منقسم ہونے سے بچاتا رہا۔ میرے جیسے میں ان کی بے اعتباری آئی۔ میں تو بے گناہ ہی دار پر چڑھا دیا گیا۔ زمرہ آج..... آج سوچتا ہوں سب کچھ چھوڑ دیتا۔ بس تمہارا دامن محبت میرے ہاتھ میں ہوتا تو..... تو شاید آج میں یوں لٹا ہوا خالی دامن خالی ہاتھ نہ ہوتا۔ میری زندگی جنت ہوتی۔ تم، تمہاری وفائیں مجھے میرے ہونے کا احساس دلاتی تھیں اور اب..... ان لمحوں میں جب..... جب میں ہونے اور نہ ہونے کے بیچ مصلوب ہوں تو تم کہاں ہو؟ کیا تمہارا دامن محبت پھر سے میرے لیے وسیع نہیں ہو سکتا؟ کیا اب بھی تمہاری وفائیں میرے نام نہیں ہو سکتیں؟“ وہ سر جھکائے کسی بارے ہوئے جواری کی طرح اپنے ہی نقش قدم پر پاؤں دھرتے واپسی کے راستے پر ہو لیے تھے۔

زندگی کے اس جوئے میں وقت نے آخری پتہ شو کر دیا تھا اور ان کے جیسے میں ہار آئی تھی۔ وہ واپس پلٹ رہے تھے اس ہار سمیت۔ جو لوگ شکست کھا کر نوٹ جاتے ہیں زندگی ان کے لیے صرف جہنم بن کر رہ جاتی ہے اور وہ شکست کھا کر نوٹنے والوں میں سے نہیں تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو تیروں کے مقابل اپنا جگر آزماتے ہیں اور وقت نے ابھی ان کے لیے اپنے ترکش میں کچھ تیر بچا کر رکھے ہوئے تھے۔



آج کالج کی چھٹی تھی سو سرت جہاں ہینا بھابی کے ساتھ کچن میں مصروف تھیں۔ صبح انہوں نے صابروہ کے ہمراہ پورے گھر کی خوب اچھی طرح جھاڑ پونچھ اور صفائی کی تھی۔ دن کے کھانے سے کچھ دیر پہلے ابامیاں اور بابر بھابی بھی واپس آ گئے تھے۔ گاڑی کا کافی نقصان ہوا تھا لیکن شبیر حسین شاہ مالی نقصانات کو کم ہی خاطر میں لاتے تھے۔ سرت جہاں نے رستہ واضح پر نگاہ دوڑائی۔ ایک بچنے والا تھا۔ ان کی منتظر نگاہیں کچن کی کھڑکی کے اس پار گیٹ کی طرف اٹھیں اور واپس پلٹ آئیں۔

”کیا بات ہے کسی نے آنا ہے.....“ ہینا بھابی نے ان کی نظروں کی چوری پکڑ لی۔

”نہیں تو..... آنا کس نے ہے؟“ سرت جہاں جلدی سے بولیں۔

”میں نے سوچا شاید تمہاری کسی دوست نے آنا ہے۔ صبح سے تمہاری ان گھریلو مصروفیات سے میں نے اندازہ لگایا۔“ ہینا بھابی کچن کڑا ہی کا مصالحہ چکھتے ہوئے بولیں۔

”برائیانی تمہارے ذمے ہے اماں بی کے طریقے سے بنانا۔ ورنہ ہم سب تو مارے مروت کے کھایا لیں گے۔ شا کرنے ریکارڈ لگا دینا ہے تمہارا۔“

”اب ایسی بھی ٹکمی نہیں ہوں مانا کہ آپ جیسی بھابیوں کی نندیں عموماً کوری رہ جاتی ہیں لیکن اماں بی نے سب کچھ سکھایا ہے مجھے۔“ سرت جہاں دہنگی چو لہے پر رکھتے ہوئے بولیں۔ ایک گھنٹہ مزید گزر گیا۔ کھانا تیار تھا سو ٹیبل پر لگا دیا گیا۔ گھر کے سبھی افراد کھانے پر جمع تھے۔ آپس کی باتوں کے دوران کھانا کھانے کے بعد ابامیاں نے قبوے کی فرمائش کر دی۔ صابروہ نے برتن اٹھا لیے اور قبوہ تیار کرنے کچن سے دھار گئی۔

”بڑے شاہ جی! باہر کوئی آدمی آپ سے ملنے آیا ہے۔“ مالی فضل الہی نے ڈائننگ روم میں جھانک کر کہا۔ سرت جہاں نے چونک کر سر اٹھایا۔

”کون ہے..... نام نہیں پوچھا اس کا؟“ شبیر حسین شاہ بولے۔

”پوچھا تھا جی پر..... مشکل سا نام تھا ذہن سے لے (اتر) گیا ہے؟“ مالی فضل نے شرمندگی سے سر جھکا کر کہا۔ شبیر حسین شاہ مسکرائے۔

”تمہارا بھی کوئی جواب نہیں فضل الہی..... شکر ہے تمہیں اپنا نام یاد رہتا ہے بہر حال اسے ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ ہم آتے ہیں۔“ ان کی بات سن کر فضل الہی باہر نکل گیا۔

”اباسیاں! کون ہو سکتا ہے؟“ اظہر چچا نے سوال کیا۔

”کوئی بھی ہو..... ملیں گے دیکھیں گے تو پتہ چلے گا کون ہے بہر حال تم لوگ آپس میں گپ شپ کرو ہم ذرا جا کر ملتے ہیں۔“ شبیر حسین شاہ انھہ کر ڈرائنگ روم کی طرف چلے گئے۔

دروازے پر ہونے والے کھٹکے سے چونک کر اس نے سر اٹھا کر سامنے دیکھا اور صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ روشن چہرے پر بھی داڑھی، کنپٹیوں کے سفید بالوں نے انہیں بے حد بارعب اور پرتھمکت بنا دیا تھا، اونچے قد اور قد سے وزنی جفے کے مالک شبیر حسین شاہ اس عمر میں بھی قابل رشک صحت و وجاہت کے مالک تھے۔ ڈرائنگ روم کی پڑ شکوہ سجاوٹ اور نفاست، حویلی کی بلند و بالا دیواریں اسے کسی چیز نے متاثر نہیں کیا تھا لیکن پہلی بار شبیر حسین شاہ کو دیکھ کر جیسے ایک لمحے کو اس کے اندر کہیں کچھ ہوا تھا۔

”اسلام علیکم.....“ اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو انہوں نے رکی سے انداز میں ہاتھ ملایا۔

”وعلیکم السلام۔“ ساتھ ہی اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی اس کے مقابل صوفے پر بیٹھ گئے۔

”جی بر خوردار..... آپ کون ہیں اور کس سلسلے میں مجھ سے ملنا چاہتے تھے؟“ شبیر شاہ نے تمہید کو

غیر ضروری سمجھتے ہوئے ڈائریکٹ اس سے اس کی آمد کی بابت پوچھا۔

”جی میرا نام فرجاد ملک ہے اور میں گورنمنٹ کالج میں فورتحہ ایئر کا سٹوڈنٹ ہوں۔“ فرجاد ایک

پل کو رک گیا۔ شبیر حسین شاہ کی پڑ سکوت سمندر کی طرح ٹھہری آنکھیں اس کے چہرے پر تنگ گئیں۔

”پھر.....؟“ اس لفظ ”پھر“ میں کیا کچھ پوشیدہ تھا۔ فرجاد کے لیے سمجھنا دشوار نہیں تھا۔

”سر مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے؟“

”بر خوردار جہاں تک میرا خیال ہے ہم تم سے پہلی بار مل رہے ہیں۔ تم کون ہو آج سے پہلے تک

ہم نہیں جانتے تھے اور ہم کیا ہیں یہ شاید تم اچھی طرح نہیں جانتے۔ بہر حال کیا کسی قسم کی مالی معاونت چاہئے ہم سے۔“ اجنبیت کا بھرپور تاثر شبیر حسین شاہ کے ادا کیے ایک ایک لفظ سے مترشح تھا۔

”جی نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں۔“

”تو پھر کیا بات ہے؟“

”میرا خیال ہے شاہ صاحب کہ اپنا مدعا بیان کرنے سے پہلے میں اپنا تھوڑا سا تعارف کروا دوں

تو شاید میری بات سمجھنے میں آپ کو زیادہ آسانی ہو۔“

”بولو..... ہم سن رہے ہیں۔“ شبیر شاہ صوفے کی پشت سے ٹپک لگا کر بیٹھ گئے۔

”شاہ صاحب! میرے نام سے آپ کو آگاہی ہو چکی ہے اور یہ بھی آپ جان چکے ہیں کہ میں کیا

کرتا ہوں۔ میرا تعارف بس اتنا سا ہے کہ میری زندگی اوپر والے کی رحمت کے پیش نظر ہے، بچپن سے ہی والدین کی شفقت سے محروم ہوں، زندگی میں جو کچھ کیا..... جو کچھ پایا..... اللہ کے بعد صرف اپنی ذاتی کوششوں سے پایا..... اور آج کسی قسم کی کمی نہیں ہے مجھے۔“

”تو بر خوردار یہ سب تم ہمیں کیوں بتا رہے ہو۔“ ان کے سوال پر وہ ایک لمحہ کو خاموش ہو گیا۔ کچھ جھجک، کچھ ہچکچاہٹ نے چند ساعت اس کی زبان پر پھر بٹھا دیا پھر وہ بہت دھیمے لہجے میں گویا ہوا۔

”اس لیے شاہ صاحب! کہ میں ضروری سمجھتا ہوں کہ دامن سوال دراز کرنے سے پہلے آپ کو اپنے بارے میں آگاہ کروں۔ میں بہت اہم اور ضروری بات کرنے والا ہوں یقیناً آپ کے سامنے اس طرح بات کرنا مجھے زیب تو نہیں دیتا لیکن میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ میرے والدین حیات نہیں ہیں جو آ کر آپ سے بات کرتے۔ ممکن ہے آپ کو میری بات سن کر غصہ آ جائے لیکن شاہ صاحب! میں جو کچھ آپ سے کہنا چاہتا ہوں وہ ایسا غیر اخلاقی، غیر مہذب بھی نہیں جسے سن کر آپ مجھ کو انھیں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ آپ اس وقت جس مقام پر ہیں یہاں انسان عمر کے ہر حصے سے تجربات کشید کر چکا ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے آپ میری بات توجہ اور غور سے دل و دماغ سے سنیں گے۔“ وہ بہت شائستگی سے اپنے مافی الضمیر کو بیان کر رہا تھا۔

شبیر حسین شاہ کی جہانگیرہ نگاہیں اس کے چہرے پر لگی ہوئی تھیں۔

”دیکھو بر خوردار! لفظ جب تک زبان پر نہیں آتے با حرمت ہوتے ہیں۔ جب ہونٹوں سے ادا ہو جائیں، بے وقعت اور حقیر ہو جاتے ہیں لہذا بولنے سے پہلے یہ سوچ لینا کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ تم کون ہو اور کس سے مخاطب ہو؟“

ان کی آنکھوں میں سکوت در آیا اور لہجے میں غضب کا خیراؤ۔ چند لمحے سر جھکا کر خاموش بیٹھ رہنے کے بعد وہ جھجک آمیز لہجے میں بولا۔

”شاہ صاحب! میں..... میں آپ کی بیٹی سر.....“

”بس.....“ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ اس کی بات ادھوری ہی رہ گئی۔ شبیر حسین شاہ کا چہرہ شدت غیض و غضب سے سرخ ہو رہا تھا یقیناً ان کے اندر ایک جوار بھانا اٹھ رہا تھا۔

”تمہاری زبان پر ہماری بیٹی کا نام ایک بار بھی آئے ہم برداشت نہیں کریں گے۔“ ان کے لہجے میں سانپ جیسی پھنکار تھی۔

”شاہ صاحب! آپ میری پوری بات تو سنیں۔“ فرجاد نے مزید بولنا چاہا۔

”بس! جو سن لیا وہ کافی ہے۔ ہم نا سمجھ، نادان نہیں۔ تمہاری بات سننے سے پہلے ہی سمجھ چکے تھے کہ کیا کہنا چاہتے ہو تم..... اسے بھی بہت جانو جو تمہیں اتنا بولنے کی اجازت دے دی، مگر آئے ہوئے

دشمن کو بھی ہم مہمان سمجھتے ہیں اور مہمانوں کے ساتھ بدسلوکی کرنا ہماری روایت نہیں۔“ شبیر شاہ نے اپنے غصے پر قابو پانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”شاہ صاحب! میری۔۔۔“

”بس میاں بس۔۔۔ تمہاری بات ختم ہو گئی۔ ہمیں مجبور نہ کرو کہ ہم تمہارے ساتھ وہ سلوک کریں کہ تم اپنی ناگوں پر واپس نہ جاسکو۔“ وہ اس کی طرف سے رخ پھیر کر کھڑے ہو گئے اور ہاتھ کے اشارے سے اسے چلے جانے کو کہا۔ فرجاد ان سے محض دو قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔

”شاہ صاحب! میں نے صرف مسرت جہاں کا ہاتھ مانگا۔“ چناخ کی بھرپور آواز آئی اور لفظ جیسے اس کے حلق میں ہی اکٹھ کر رہے تھے۔ اس قدر بھرپور تھپڑ تھا کہ فرجاد دو تین قدم پیچھے کھڑا گیا۔

”اوقات کیا ہے تمہاری۔۔۔ نسب کیا ہے تمہارا۔۔۔ اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو تمہیں تو یہ تک نہیں معلوم کہ تمہارا باپ کون تھا۔ تمہاری ماں کون تھی۔“

”بس شاہ صاحب بس۔۔۔ بہت سن لیا میں نے۔۔۔ میں یتیم سی۔۔۔ کم حیثیت سی۔۔۔ آپ بلند نسب سی لیکن دوسروں کو حقیر سمجھنے کا حق نہیں ہے آپ کے پاس۔“ فرجاد کو ان کے لہجے کا طنز کسی بجائے کی طرح دل میں کھینچا محسوس ہوا۔

”جب تم کسی کے دروازے پر جا کر سوال کرو گے تو اسے حق حاصل ہوگا کہ وہ تم سے پوچھے تو کسی کو آخر تم ہو کیا۔؟ پر خوروار آئندہ جب کسی دروازے پر اس نیت سے سوال کے لیے جاؤ تو اپنی اوقات ضرور دیکھ لینا۔“ شبیر حسین شاہ کے لہجے کی حقارت اسے کسی تازیانے کی طرح لگی۔

”شاہ صاحب! آپ بہت بلندی پر ہیں۔۔۔ مان لیا کہ اللہ نے آپ کو بہت اونچا مقام دیا ہے شاہ اسی لیے اتنی بلندی سے میں آپ کو بہت چھوٹا اور حقیر دکھائی دے رہا ہوں لیکن اگر آج بھی سب کچھ میرے پاس ہوتا۔۔۔ میں حیثیت میں آپ کے برابر ہوتا تو شاید آپ کا یہ اونچا قدم میرے سامنے دب جاتا یا پھر آپ اتنی بلندی کی بجائے وہاں ہوتے جہاں میں کھڑا ہوں تو یقیناً آپ کو اتنا چھوٹا ہرگز دکھائی نہ دیتا۔“

”بھو اس بند کرو اور دفع ہو جاؤ۔۔۔ ہمارے ضبط کا اور امتحان مت لو۔“ انہوں نے غصے سے دھاڑتے ہوئے فرجاد کو بیرونی دروازے کی طرف دھکیلا تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا دروازے سے نکل آیا اور سنبھلتے سنبھلتے بھی ایک دو قدم مزید پیچھے کو ہو گیا۔ دروازے کی دہلیز اب اس سے دو قدم کے فاصلے پر تھی۔ اس نے دونوں بازو دروازے کے پتوں پر رکھتے ہوئے شبیر حسین شاہ کی طرف دیکھا۔

”شاہ صاحب! میں جو بات کہنے آیا ہوں وہ کھل کر کے جاؤں گا۔“ ان کا سخت رویہ اس کی ضد کو اور پختہ کر رہا تھا۔

”تمہارا ایک لفظ بھی سننا ہمیں گوارا نہیں۔۔۔ تم جیسے بے حیثیت اوقات سے گرے دو گئے کے

مخلص سے بات کرنا ہم اپنی توہین سمجھتے ہیں۔“ شبیر شاہ اس کے قریب چلے آئے۔

”نکلو یہاں سے۔۔۔ اور آئندہ سادات گھر کی بلند و بالا دیواروں کی طرف نگاہ اٹھانے سے پہلے اپنے گریبان میں ضرور جھانک لینا۔“ انہوں نے دروازے کے پت پر دھرا اس کا ہاتھ نیچے کو جھکا۔

”شاہ صاحب! میں نے کہنا تھا کہ میں بات پوری کیے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔“

”میں کہتا ہوں کیسے نہیں جاتے۔“ انہوں نے آگے بڑھ کر اسے دھکا دیا۔ اس بار وہ تقریباً گرتے گرتے بچا تھا۔ برآمدے کی دیواروں کے ساتھ ترتیب سے لگی کرسیوں سے ٹکرا کر وہ بمشکل خود کو گرنے سے بچا سکا۔ تھوڑے فاصلے پر وہیں برآمدے میں پانچوں کزیل جوان بیٹھے ہوئے تھے۔ بوڑھے شیر کے دھاڑنے کی آواز بخوبی ان کی سماعت تک پہنچی تھی لیکن انہوں نے کوئی مداخلت نہیں کی۔ اب ڈرائنگ روم کے دروازے سے برآمد ہونے والے اجنبی کو بھی انہوں نے بہت غور سے دیکھا تھا اور شبیر حسین شاہ کا غضب سے بھرپور چہرہ بھی ان کے چہرے کے عضلات تن کر فٹوش کو بگاڑ رہے تھے۔

آنکھوں میں نفرت کے انکارے دھبے رہے تھے۔

”یہاں کتوں کا بھونکنا برداشت نہیں کیا جاتا۔ سادات گھر کا ایک اصول ہے کہ جو آنکھ اس گھر کی عزت کی طرف اٹھے نکال دو۔ اور تم۔۔۔ تم ہماری عزت کے درپے ہو۔ ہم کیسے برداشت کر سکتے ہیں۔“ ان کے لہجے سے آگ بھڑک رہی تھی۔ اظہر، ہابر، عارپ، شاکر، شفقت پانچوں محاطے کی عینگی کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ آگے بڑھ کر ابامیاں سے پوچھ لے۔

”شاہ صاحب! کبھی کبھی اندھیر کوٹھڑیوں میں بھی روزن کھل جایا کرتے ہیں۔ بعض جذبوں میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ بلند دیواریں بھی ان کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتیں۔ اجازت دیجئے۔“ وہ اپنی بات کہہ کر رکنا نہیں تیزی سے بیرونی گیت کی طرف بڑھ گیا۔ شبیر حسین شاہ چوٹ کھائے ہوئے سانپ کی طرح بل کھا رہے تھے۔ پشت پر ہاتھ باندھے طویل برآمدے کے چمکنے فرش کو بے رحمی سے روندتے ادھر سے ادھر ٹپکنے لگے۔

”زہرا خاتون۔۔۔ مسرت جہاں۔۔۔“ ان کی آواز میں غضب کا اشتعال تھا جیسے آج ان کے سامنے جو چیز آئے گی وہ جس نہیں ہو کر رہ جائے گی۔ ان کی بلند آہنگ آواز کسی آنے والے طوفان بلاخیز کا پتہ دے رہی تھی۔ مسرت جہاں اور اماں بی، اپنی جگہ لرز کر رہ گئیں۔ دونوں نے ایک نظر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ مسرت جہاں کے دل کا چور انہیں سر جھکانے پر مجبور کر گیا۔ اماں بی کی جہاندیدہ نظروں سے خود کو چراتی سمیٹتی وہ اٹھ کر برآمدے میں آ گئیں۔ شینا بھابی اور مقسوم بھابی ابامیاں کے ڈر سے وہاں آنے کی بجائے کچن کے دروازے میں خاموش تماشاخی بنی کھڑی سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ شبیر حسین شاہ نے مسرت جہاں کے چہرے پر نگاہیں گاڑ دیں۔ ان آنکھوں میں شکوہ، ملامت، مان کی ٹوٹی کرچیاں،

اعتماد اور بھروسے کی موت کا کرب کیا کچھ نہ تھا۔ مسرت جہاں نے ایک نظر ان کے پُر جلال چہرے کی طرف دیکھا اور پھر ان کی نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے آنکھیں جھکا لیں۔

”بیٹھے مسرت جہاں..... زہرا خاتون آپ بھی بیٹھیں۔“ شبیر حسین بدستور ٹپکتے ہوئے گویا ہوئے۔ اماں بی کو تو ابھی تک ان کے اس ناقابل فہم رویے کی سمجھ نہیں آئی تھی بہر حال وہ دونوں بیٹھ گئیں۔ شبیر حسین شاہ کسی کو مخاطب کرنے کی بجائے عجیب کاٹ دار انداز میں مسرت جہاں کو گھورے جا رہے تھے۔

”ابامیاں آخر بات کیا ہے؟ آپ بتاتے کیوں نہیں۔“ شاکر حسین اپنی فطری غلٹ پسندی کے باعث زیادہ دیر صبر نہ کر سکے۔

”اگر بات کہیں تو محض چند الفاظ ہیں لیکن ان کا پس منظر کس قدر تاریک ہے یہ شاید ہمارے سوا کوئی سمجھ نہ پائے، ہم مسرت جہاں سے تفصیلی بات کرنا چاہتے ہیں۔“ انہوں نے روئے سخن شاکر حسین سے مسرت کی طرف موڑ دیا۔ مسرت جہاں کی آنکھیں ضرور جھگی ہوئی تھیں لیکن ابامیاں کے چہرے کے تاثرات کا انہیں اچھی طرح اندازہ ہو رہا تھا۔

”مسرت جہاں..... ہمارے منہ سے نکلے الفاظ آپ کی نظر میں کتنے محتر ہیں۔“

”جی ابامیاں۔ میں سمجھی نہیں۔“

”آپ اتنی نادان تو نہیں کہ سمجھ ہی نہ پاؤں، ہم نے کیا کہا ہے۔ ہم نے آپ سے یہ پوچھا ہے کہ ہمارے کہے الفاظ آپ کے نزدیک کیا حیثیت رکھتے ہیں۔“ ان کے لہجے میں سکوت تھا لیکن ایسا سکوت جو کسی آنے والے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔

”ابامیاں! ہم نے ہمیشہ آپ کے کہے الفاظ کی حرمت کا پاس کیا ہے۔“ مسرت جہاں نے سر جھکائے جھکائے ہی جواب دیا۔

”آپ غلط کہہ رہی ہیں مسرت جہاں! ہمارے کہے لفظوں کو نامعتبر کیا ہے آپ نے۔ کیا آپ بھول گئیں ہم نے کہا تھا مسرت جہاں! جس اچلے لباس میں آپ ملبوس ہیں ہم اس پر ذلت کا ایک چھینٹا بھی برداشت نہیں کریں گے۔ کہا تھا ناں ہم نے۔“ شبیر حسین شاہ مسرت جہاں سے مخاطب تھے لیکن ان کی کئی باتیں کسی حد تک ان کے بیٹوں نے سمجھ لی تھیں۔

”جج۔ جی ابامیاں۔“ مسرت جہاں ہکلا سی گئیں۔ شبیر حسین شاہ کے منہ سے یہ بات سن کر اماں بی کا دل بھی سینے کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب کر ابھرا۔ ان کی نظریں مسرت جہاں کے چہرے پر ٹپک گئیں۔

”ہوں۔۔۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سب کچھ جانتے بوجھتے آپ نے اپنے پاکیزہ دامن کو داغدار

کیا۔ کیا آپ نے اس وقت سوچا نہیں کہ آپ کے دامن کی یہ سیاہی آپ کے بھائیوں اور باپ کی ناموس پر ایک طمانچہ ثابت ہوگی، ہم نے ایک جگہ سے چھینٹنے کی بات کی تھی اور آپ ذلت گھر میں ہی اٹھالائیں۔“

”ابامیاں..... آخر یہ سب کیا ہے۔ مجھ سے اب برداشت نہیں ہو رہا، صاف صاف بتائیں کیا مسئلہ ہے..... کیا ہوا ہے۔“ عارب بھائی کا ضبط جواب دے گیا۔

”دھیرج..... ہمیں پہلے مسرت جہاں سے پوچھنے دو۔ کیا یہی وہ تعلیم تھی جس کی خاطر انہوں نے احتجاج کیا تھا۔ زہرا خاتون نے حمایت کی تھی اور گھر کے سب افراد نے خوشی منائی تھی۔ مسرت جہاں کیا اپنے بعد آنے والوں کے لیے یہ زینہ چنا ہے آپ نے؟“ شبیر حسین شاہ انتہائی سخت مزاج سہی لیکن جوان اولاد خصوصاً بیٹی کے ساتھ کیا سلوک روا رکھنا چاہئے اس سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔ اسی لیے ابھی تک ضبط سے کام لے رہے تھے حالانکہ یہ معاملہ ایسا تھا کہ جس پر ضبط کرنا ان کے لیے کسی کڑے امتحان سے کم نہ تھا۔

”ہم نے آپ سے کچھ پوچھا ہے مسرت جہاں! کیا سوچ کر آپ نے ایک کم ذات شخص کو اتنا حوصلہ دیا کہ وہ ہمارے مقابل آن کھڑا ہوا۔“

”ابامیاں۔۔۔ ہم نے کچھ نہیں کیا۔ ہمارا یقین کیجئے ہم نے ایسا کچھ نہیں کیا جس سے آپ کی یا ہماری عزت پر کوئی حرف آتا ہو۔“ مسرت جہاں بہت آہستگی سے صفائی دینے والے انداز میں بولیں۔

”ہم نے سوال کچھ اور کیا ہے مسرت جہاں! آپ سے پوچھتے بغیر آپ کی مرضی کے بغیر وہ شخص اتنی جرات نہیں کر سکتا کہ سادات گھر کی دہلیز پر پاؤں بھی رکھ سکے۔ کہا کہ آپ کا نام لینا۔ خود سوچئے مسرت جہاں کسی اجنبی کی زبان پر آپ کا نام آئے، ہماری غیرت اسے زندہ زمین میں نہ گاڑ دے گی۔“

”بس ابامیاں! اب میری برداشت سے باہر ہو گیا ہے، میں سب سمجھ گیا ہوں۔ اب آپ کچھ نہ کہیں مجھ پر چھوڑ دیں۔ قسم سید کی اگر اب وہ کل کا سورج بھی دیکھ پایا تو۔“ عارب بھائی مارے طیش کے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”نٹھرو۔“ شبیر حسین شاہ نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں رکنے کو کہا۔

”ابامیاں! اس نے کون سی قابل اعتراض حرکت کی..... محض رشتہ ہی تو مانگا ہے۔“ مسرت جہاں عارب بھائی کی بات سن کر برا فروختہ ہوتے ہوئے بولیں۔ ”اب بات جب زبان پر آئی گئی ہے تو میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ..... کہ میں بھی فرجاد سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔“ لفظ نہیں تھے کوئی ہم تھا جو سادات گھر کے درود یوار کو منہدم کرتا چلا گیا۔ ابامیاں مسرت جہاں کے چہرے پر نظریں نکائے عجیب انداز سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ بے یقینی اور بے اعتباری سے شاید انہیں تو قہر نہیں تھی کہ مسرت جہاں کے منہ سے ایسے الفاظ نکل سکتے ہیں۔

”بے حیا۔۔۔ بے غیرت۔۔۔ کیا بک رہی ہے۔“ اماں بی غصے کی شدت سے کانپتے بچے میں بولیں لیکن مسرت جہاں نے جیسے یہ الفاظ ادا کر کے اپنے دل کا بوجھ اتار پھینکا تھا۔ سوچے بغیر کہ ان کا یہ بوجھ اس گھر کے کینوں کی روحوں کو کس کرب سے ہلکانا کر گیا تھا۔ پانچویں بھائی مشتعل ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے، شدت غیض و غضب سے شاید ان کی زبانیں گنگ ہو کر رہ گئی تھیں۔ غیرت کسی لادے کی طرح ان کے جسموں میں پکنے لگی، ان کے قدم اٹھے تو ماحول کا سکوت ٹوٹ گیا۔ وہ سب اپنے اپنے کمروں کی طرف گئے تھے اور جب واپس ملے تو پانچویں کے ہاتھوں میں آتشیں اسلحہ موجود تھا۔ مسرت جہاں، اماں بی، بھابھیاں اپنی اپنی جگہ لرز کر رہ گئیں۔ اس سے پہلے مسرت جہاں نے اپنے لیے کبھی کسی کی آنکھ میں نفرت یا غصہ نہیں دیکھا تھا لیکن اس وقت ہر دیکھنے والی آنکھ انہیں یوں گھور رہی تھی جیسے وہ کوئی بہت حقیر اور اپنے مقام سے گری ہوئی چیز ہوں۔

”ابامیاں۔۔۔ ہم اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔۔۔ اس کی زندگی یہیں تک تھی۔“ عارب بھائی نے کہا۔

”آپ ایسا ہرگز نہیں کریں گے۔۔۔“ مسرت جہاں نے جیسے تہیہ کر لیا تھا کہ آج باپ اور بھائیوں کے ضبط کی انتہا دیکھ کر دم لیں گی۔

”بکواس بند کرو تم اپنی۔۔۔ تمہاری شاہ پر وہ یہاں تک آیا۔ تم نے کیا سمجھا تھا ہم سب مرے ہوئے ہیں یا ہم نے ہاتھوں میں چوڑیاں پہن رکھی ہیں۔“ انظہر بھائی مشتعل لہجے میں بولے۔

”انظہر۔۔۔ عارب۔۔۔ باہر اندر رکھ آؤ یہ پستول اور بند و قیس۔۔۔ ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔“

”ابامیاں! اس کے بعد کون سے وقت کے منتظر ہیں آپ۔۔۔ اس شخص کی ہر آتی جاتی سانس اب ہم پر بار ہے۔“ باہر بھائی جیسے سرد مزاج شخص کا اشتعال بھی دیدنی تھا۔ شبیر حسین شاہ کے روکنے پر بھی وہ نہیں رک رہے تھے۔

”ابامیاں غلطی میری ہے تو سزا بھی مجھے ہی مٹی چاہئے۔“ مسرت جہاں نے کہا۔

”ٹھیک کہا تم نے۔۔۔ ذلت کا جج تو تم نے بویا ہے۔ تمہیں، پہلے کاٹ کر پھینکنا چاہئے۔“

عارب بھائی نے ریو الو اس پر تان لیا۔ اماں بی کی سانسیں حلق میں اٹک گئیں۔

”یا الہی۔۔۔ یہ میری آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں۔۔۔ میری روح میں اتنی سکت نہیں ہے میرے مولا جو اس طوفان کا سامنا کر سکے تو معاف کر دے ہمیں اللہ! ہم اس آزمائش کے قابل تو نہیں ہیں۔“ ان کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

”عارب! کیا کر رہے ہو۔۔۔“ باہر نے عارب بھائی کا پستول والا ہاتھ نیچے کیا۔

”پہلے اس کی سانسوں کی ذور کٹنی چاہئے جس نے ہماری عزت کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا۔“ وہ

پانچویں ہتھیار لے کر گھر سے باہر جانے لگے۔ مسرت جہاں اچھی طرح جانتی تھیں کہ اگر اس عالم میں وہ ان کے ہاتھ لگ گیا تو یقیناً اس دن کا ڈوبنا سورج اسے بھی اپنے ساتھ اندھیروں میں لے جائے گا۔ انہوں نے اپنا دوپٹا اتار کر بھائیوں کے پیروں میں رکھ دیا۔ اماں بی کی روح لرز گئی۔

”بھائی! رک جائیں آپ سب۔۔۔ معاف کر دیں اسے۔۔۔ آئندہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔“

”آئندہ کی کس نے دیکھی ہے۔۔۔ آئندہ ایسا تب ہی ہوگا ناں جب تم اس گھر کی دہلیز سے باہر پاؤں رکھو گی۔“ سرد لہجے میں کہہ کر عارب بھائی آگے بڑھے۔ سفید براق دوپٹے پر پانچویں بھائیوں کے نقش قدم ثبت ہو گئے۔ شبیر حسین شاہ نے دوبارہ انہیں رکنے کو کہا لیکن وہ پانچویں سنی ان سنی کر کے آگے بڑھ گئے۔ مسرت جہاں نے جبکہ کمرٹی میں لتھڑا ہوا آٹھل اٹھا یا اور کسی قیمتی مہینے کی طرح اپنے سینے سے لگا لیا۔

کسی کی طرف دیکھے بغیر وہ بہت خاموشی سے جا کر اپنے کمرے میں بند ہو گئیں۔ شبیر حسین شاہ نے اماں بی کے متشکر چہرے کو ایک نظر دیکھا اور بوجھل قدم اٹھاتے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

آج پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ ان کے بیٹوں نے ان کا کہا نہیں مانا تھا، ان کے روکنے پر وہ رکنے نہیں تھے۔ غیرت و ناموس پر آنچ آجائے تو انسان ضبط نہیں کر سکتا۔ وہ پانچویں بھی اسی جوش میں گھر سے نکلے تھے کہ فرجاد کو موت کی خنجر سلا دیں جس کی وجہ سے پہلی بار ان کی بہن نے سراٹھا کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ابامیاں سے اور بھائیوں سے بات کی تھی۔ اعتراف کیا تھا کہ یہ سب کچھ اسی کی ایماء پر ہوا ہے پھر وہ اسے کس طرح چھوڑ دیتے۔

شبیر حسین شاہ ان کے جانے کے بعد سے اپنے کمرے میں بند تھے۔ اماں بی کے بار بار دروازہ بجانے پر بھی انہوں نے دروازہ نہیں کھولا تھا۔ گھر بھر پر سکوت مرگ طاری تھا جیسے اتنی وسیع و عریض حویلی ویران اور آسیب زدہ ہو، کوئی کھٹکا، کوئی صدا نہیں تھی، رات کا کھانا تیار تھا لیکن کسی نے روٹی کو ہاتھ تک نہ لگایا۔

اماں بی دوسرے کمرے میں سر جھکائے خاموش بیٹھی تھیں۔ ماضی کا ورق ورق ان کے سامنے تھا، کہیں کوئی کوتاہی نہیں کی تھی انہوں نے۔ کسی معاملے میں بھی کوئی کجی ان سے سرزد نہیں ہوئی تھی پھر مسرت جہاں کی تربیت میں ان سے کہاں غلطی ہوئی؟ کہاں کمی ہوئی؟ وہ سمجھنے سے قاصر تھیں، انہیں شبیر شاہ کی طرف سے بھی ٹکراؤ تھا، رات ہو چکی تھی اور انہوں نے دروازہ نہیں کھولا تھا۔

ادھر مسرت جہاں سامنے بیڈ پر دوپٹہ پھیلائے اس پر بنے جوتوں کے نشان دیکھ رہی تھیں۔ آج سے پہلے تک یو ایقین تھا انہیں کہ وہ اپنے ماں باپ کی آنکھوں کا تارہ ہیں۔ بھائیوں کی لاڈلی ہیں لیکن جس طرح ان کے دوپٹے کو پیروں سے روند کر ان کے بھائیوں نے ان کے مان کو کرچی کرچی کیا تھا اس سے ان کا دل بھرا آیا تھا۔ ذہن میں اپنے گھر کے کینوں کے خلاف سوچیں ابھرنے لگیں۔

یہ محبت بھرے چہرے کس قدر منافق ہیں، زندگی بھر محبت کا ڈھونگ رچاتے رہے ہیں اور آخر کار

سود سمیت یہ محبت واپس لے لیتے ہیں۔ کیا ماں باپ ایسے ہوتے ہیں جنہیں اولاد کی خوشی سے کوئی سروکار ہی نہ ہو۔ جنہیں اپنی ذات، صرف اپنی خوشی عزیز ہو اور بس کیا بھائی ایسے ہوتے ہیں جنہیں بہنوں کا مان توڑتے ہوئے ایک بل کو بھی احساس نہ ہو۔

انسان ہیں یہ جو اپنے سوا ہر ایک کو حقیر سمجھتے ہیں۔ کیا یہ انسان کہلانے کے لائق ہیں، ایسی کون سی بڑی غلطی کر دی تھی اس نے محض رشتہ ہی تو مانگا تھا۔ کیا یہ اتنی بڑی خطا ہے جس کی سزا موت ہو۔ مسرت جہاں جوں جوں سوچ رہی تھیں ویسے ہی ان کے دل میں اپنے گھر کے افراد کے لیے نفرت پیدا ہو رہی تھی، انہیں اپنے بھائی انسان نما حیوان دکھائی دے رہے تھے جو ان کی محبت کو قتل کرنے کے درپے تھے جنہیں ایک انسان کی زندگی سے صرف اس لیے ہیر ہو گیا تھا کہ اس کے ہونٹوں پر ان کی بہن کا نام آ گیا تھا، ان کے دماغ میں سوچوں کا لاوا سا پکٹنے لگا۔ رات کا پہلا پہر تھا لیکن کسی نے ان کے دروازے پر آ کر ان سے کسی قسم کی بات کرنا گوارا نہیں کی تھی۔ کسی ناسور کی طرح کاٹ کر انہیں پھینک دیا گیا تھا اور جب وہ جسم سے الگ ہو چکی تھیں تو پھر اس جسم کا دکھ اس کا درد بھی انہیں محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ یونہی سوچوں میں گم بیٹھی تھیں جب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ انہوں نے دیوار گیر گھڑی پر نگاہ ڈالی، ساڑھے گیارہ بجے رہے تھے، دوسری گھنٹی پر انہوں نے ریسیور اٹھالیا۔

”ہیلو۔۔۔“

”ہیلو مسرت۔۔۔ مسرت یہ تم ہوتاں۔۔۔ بے قرار لہجے میں سوال کیا گیا۔ مسرت جہاں کی سماعت کو یقین ہی نہ آیا۔ ”فر۔۔۔ فر جادو آپ۔۔۔“ وہ بس اتنا ہی کہہ سکیں۔

”ہاں مسرت۔۔۔ میں ہی ہوں۔۔۔ تم۔۔۔ تم ٹھیک تو ہوتاں۔“

”یہ سوال تو مجھے آپ سے پوچھنا چاہئے۔۔۔ مجھے کیا ہونا ہے ٹھیک ہوں میں۔۔۔“

”مسرت! تمہارے ابا میاں کے سامنے دامن سوال دراز کرنے کی جرأت بہت مہنگی پڑی مجھے۔۔۔ اس کا آزدہ لہجہ مسرت جہاں کو بھی دکھی کر گیا۔

”میں بہت کم حیثیت سکی مسرت جہاں لیکن اتنی حیثیت ضرور رکھتا ہوں کہ تمہیں زندگی کی ہر خوشی دے سکوں۔“

”فر جادو! یہ آپ مجھ سے کیوں کہہ رہے ہیں۔ میں نے کب تقاضا کیا ہے خوشیوں کا۔ میں تو صرف آپ کی محبت پا کر ہی بہت خوش تھی۔“ مسرت جہاں دھیسے لہجے میں بولیں۔

”لیکن تمہارے ابا میاں کو تمہارے لیے اعلیٰ نسب، خاندانی اور دولت مند شخص کا رشتہ چاہئے اور یہ تینوں چیزیں میرے پاس نہیں۔۔۔ انہوں نے بہت حقیر سمجھا مجھے۔۔۔ شائد دولت ہی ان کے نزدیک واحد معیار ہے انسان کو پرکھنے کا۔“ فر جادو کا لہجہ بکھرا ہوا تھا یقیناً جو سلوک اس کے ساتھ کیا گیا تھا وہ کم از کم

اس کا مستحق نہیں تھا۔

”اب۔۔۔ اب کیا سوچا ہے آپ نے؟“ مسرت جہاں بے چینی سے بولیں۔

”مسرت! تمہاری محبت سے دستبردار ہونا میرے لیے موت سے بھی بدتر ہے، مجھے ایسی زندگی نہیں چاہئے جس میں تمہاری محبت، تمہارا ساتھ نہ ہو، زندگی نے ہر بار مجھ سے دھوکا کیا، ہر بار خوشی میرے دروازے پر دستک دے کر لوٹ گئی۔ کیا میرا دل صرف دنگیں سننے کے لیے ہے؟ کیا مجھے خوشیوں کی آرزو نہیں۔۔۔ اور اس بار۔۔۔ اس بار میں نے سوچ لیا ہے اس خوشی کو واپس لٹٹے نہیں دوں گا۔ تمہیں مجھ سے جدا کرنے کے لیے نقد پر کو بھی دانتوں، پسینے آ جائیں گے۔“ فر جادو کے لہجے میں جذبات کی سچائی اور مسرت جہاں کو پانے کی تڑپ تھی اور وہ تو جیسے پکھل رہی تھیں، جذباتوں کی تیز آنچ ان کے وجود کو جلا کر خاکستر کر رہی تھی، اس ٹوٹے ہوئے بکھرے ہوئے شخص کی محبت اتنی طاقتور ہو گئی کہ خون کے رشتوں کی صداقت پر غالب آ گئی۔

”فر جادو میں۔۔۔ میں بھی آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی، آپ جو کہیں گے میں دیباہی کروں گی۔ بس، مجھ سے جدامت ہوئے گا۔ مجھے یوں راستے میں مت چھوڑیے گا۔“

”مسرت! سوچیں ہوں گے مجھ میں۔۔۔ مگر یہ ہرگز نہ سوچنا کہ کبھی تمہیں راہ میں چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ مجھے تمہارا ساتھ چاہئے زندگی بھر کے لیے۔ تم۔۔۔ تم ملی ہو تو زندگی مجھے زندگی لگنے لگی ہے۔ ورنہ صرف سانس لیتا تھا۔ میں زندگی نہیں جیتا تھا۔۔۔ ہر آنے جانے والی سانس دل کو اذیت دیتی تھی لیکن اب۔۔۔ اب مجھے جینا اچھا لگتا ہے۔ تمہارے سنگ، تمہارے لیے۔“

لفظوں کی ٹھنڈی پھوہار مسرت جہاں کے محبت بھرے دل کو بھگور رہی تھی، انہیں ہر چہنی اذیت و کوفت بھول گئی، ایک طمانیت رگ و پے میں دوڑ گئی۔

جب ایک محبت کرنے والا اپنی محبت کی تمام تر شدتیں ان پر لٹا رہا تھا ان کے بغیر جو ایک بل جینے کا روادار نہیں تھا تو پھر انہیں اور کیا چاہئے تھا ان کی آنکھوں کے ہنرے پر خوابوں کی شبنم گرنے لگی۔

”مسرت! سیدھا راستہ اپنا کر تمہارے گھر والوں کے سامنے دامن سوال دراز کیا تھا لیکن بدلے میں سوائے حقیر کے اور کچھ نہ ملا۔ اگر کوئی امید ہوتی تو۔۔۔ تو شائد میں بار بار تمہارے دس پر دستک دیتا لیکن وہاں کے درود یوار پتھر کے ہیں۔ میری صدا بس صدا ہے صحرای ثابت ہوگی۔ اگر۔۔۔ اگر تم ساتھ دو تو شائد ہماری محبت تو منزل نصیب ہو جائے۔“

”آپ جو کہیں گے اسی طرح کروں گی، بولیں مجھے کیا کرنا ہے!“

”مسرت! تمہیں اپنا گھر والدین اپنے خون کے رشتے ہر آرام ہر آسائش کو چھوڑ کر میرے ساتھ چلنا ہوگا، دنیا کے اس گوشے میں جہاں تمہارے سامنے صرف میری ذات ہوگی اور میرے لیے صرف

تم جہاں محبتیں تقسیم ہونے کی بجائے صرف ہم دونوں کے بیچ رہیں گی اس گوشے کو ہم اپنے خوابوں اپنی آرزوؤں سے سجائیں گے۔ یولو مسرت ساتھ دوگی ناں میرا۔“ فرجاد محبت کی تمام تر شدت اپنے لہجے میں سموتے ہوئے بولا۔

سرت جہاں تو پہلے ہی اس سرزمین اس گوشے کے پسندیدہ رہی تھیں۔
 ”ہاں۔۔۔ میں ساتھ دوں گی آپ کا۔۔۔“

”سوچ لو سرت! تمہیں ان سب محبتوں سے دستبردار ہونا پڑے گا صرف میری محبت کے لیے۔۔۔“
 ”فرجاد! مجھے بے غرض محبت چاہئے۔۔۔ منافقت نہیں۔ ان رشتوں کے نزدیک میری خوشی کی کوئی اہمیت نہیں اور جب ان کے نزدیک میری ذات کی کوئی حیثیت نہیں تو پھر میں ان رشتوں کو اپنی محبت اپنی خوشی کی بھینٹ کیوں دوں۔ کس کی خاطر زندگی کو اپنے لیے آزار بنالوں۔ ان لوگوں کی خاطر جنہوں نے میری محبت کو تحقیر و تذلیل کا نشانہ بنایا۔“ سرت جہاں جذباتی لہجے میں بولیں۔

”ٹھیک ہے سرت۔۔۔ میں دو دن بعد فون کروں گا، تم ان اڑتالیس گھنٹوں میں خوب سوچ لو ایسا نہ ہو کہ بعد میں تمہیں یہ محبتیں رلائیں۔ تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکوں گا میں۔۔۔ مجھے تمہاری خوشی عزیز تر ہے اور تمہارا ہر فیصلہ دل و جان سے قبول۔ اگر قدم روک لوگی تب بھی تمہیں مورد الزام نہیں ٹھہراؤں گا اور اگر ساتھ چل پڑوگی تو اس یقین کو تمہارے ہمراہ کر دوں گا کہ منزل پر پہنچ کر تمہیں کبھی اپنی مسافت کے رازیں جاننے کا افسوس یا پچھتاوا نہ ہوگا۔“ فرجاد بے یقین لہجے میں بولا۔

”اور ہاں یہ بتاؤ کل کالج آرہی ہو۔۔۔“

”نہیں۔۔۔ کالج آنے پر پابندی لگ گئی ہے۔ میں اپنے گھر کی دلیز سے باہر پاؤں نہیں رکھ سکتی۔“ ان کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

”وہی روایتی رشتے، وہی روایتی رویے۔“ وہ زہر خند لہجے میں بولا۔

”تم پریشان مت ہونا سرت۔۔۔ اپنا خیال رکھنا یہ سوچ کر کہ تم میری امانت ہو۔۔۔ دو دن بعد فون پر بات کروں گا۔“

”ایک منٹ فرجاد! آپ کل کالج مت جائیے گا۔“ سرت جہاں کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔
 ”کیوں۔۔۔؟“

”بھائی بہت غصے میں ہیں، آپ کے پیچھے نکلے تھے گھر سے مسلح ہو کر۔۔۔ شکر ہے آپ ملے نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ وہ سکون سے نہیں بیٹھیں گے۔ آپ کی تلاش میں کالج ضرور جائیں گے۔“
 ”تو پھر۔۔۔؟“

”تو پھر یہ کہاں اشتہال کی کیفیت میں آپ کا اور ان کا سامنا کچھ ٹھیک نہیں ہوگا۔“

”یعنی تمہارا خیال ہے کہ تمہارے وہ گمراہ جوان بھائی مجھے قتل کر دیں گے۔“ فرجاد طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”سرت جہاں اشتعال میرے اندر بھی ہے لیکن میں ہمیشہ سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتا ہوں، میں کالج ضرور جاؤں گا، دیکھوں تو کسی کتنا دم ہے ان میں۔“

”نہیں فرجاد! ضد مت کریں آپ کو اپنی محبت کی قسم آپ کالج نہیں جائیں گے۔“ وہ جتنی انداز میں بولیں کہ جانتی تھیں نازک دھماکے کے دونوں سروں کو طاقت سے کھینچنے کا نتیجہ ہمیشہ دھماکے کا ٹوٹنا ہوتا ہے۔ نقصان بھائیوں کا ہوتا یا فرجاد کا اس کے لیے تو دونوں ہی کی اہمیت تھی۔ بے شک وہ ان سب کو چھوڑنے کا فیصلہ کر چکی تھیں لیکن ان کی جان تو نہیں لینا چاہتی تھیں۔ وہ سب زندہ رہیں۔ بس وہ ان کے درمیان سے نکل کر اپنی الگ دنیا بسانا چاہتی تھیں۔

”سرت! پہلے قدم پر ہی محبت کی بیڑیاں ڈال دیں تم نے میرے ہیروں میں۔ چلو ٹھیک ہے نہیں جاؤں گا۔۔۔“ فرجاد نے سرت جہاں کی بات مان لی۔ پھر چند منٹ باتیں کر کے انہوں نے فون بند کر دیا۔

یہ شخص انہیں اتنا عزیز ہو گیا تھا کہ اپنوں سے دوری کا سوچ کر بھی انہیں زیادہ ملال نہیں ہوتا تھا۔ البتہ اس کی باتوں سے اپنی مرضی کے معافی کشید کر کے وہ بہت بڑے سکون اور مطمئن ہو گئی تھیں۔ دو دن بعد جب وہ دوبارہ انہیں فون کرے گا تو کس قدر خوش ہوگا جب وہ اسے یہ بتائیں گی کہ وہ اپنے گزشتہ فیصلے پر قائم ہیں۔ وہ اس کے گھر کی چاندنی بننے کو تیار ہیں۔ اور تصور میں خوشیوں سے بھر اس کا روشن چہرہ دیکھ کر وہ بھی مسکرا دیں۔



آریان پنک سے واپسی کے بعد سے کچھ خاموش ہو گئی تھی۔ پہلے اسے یہ خدشہ رہتا تھا کہ اگر اصلیت کا پتا اس گھر کے مکینوں کو لگ گیا تو وہ اس کا وجود ایک پل کو بھی برداشت نہیں کریں گے لیکن اب اسے ایک مضبوط سپورٹ مل چکی تھی۔ فواد شاہ اس گھر کے معتبر ناموں میں سے ایک نام تھا۔ وہ اس کے بارے میں سب کچھ جان چکے تھے اور حیرت کی بات یہ کہ سب کچھ جاننے کے بعد ان کا رویہ اس کے ساتھ پہلے سے کہیں زیادہ نرم ہو گیا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ اس کا خیال رکھنے لگے تھے لیکن اب اس کی سوچیں ہر لمحہ ایک خوف ایک ڈر کے زیر اثر رہنے لگی تھیں۔ ستارہ بیگم کے ہاتھوں کی پہنچ اس کی گردن تک ہو گئی تھی اور کسی بھی لمحے وہ دوبارہ ان پتھروں کے بیچ محبوس ہو سکتی تھی جن سے بچانے کی خاطر اس کی ماں اور ٹھنکرو پاپا نے بہت تکلیف سہی تھی اور اب تک ہو رہے تھے۔ ”کیا فواد سے ان لوگوں سے بچا سکتے ہیں بھئی ان کے گھر کے درود ہمارا اتنے مضبوط ہیں کہ وہ درندوں سے چھپ کر یہاں پناہ لے سکے؟ وہ خود سے مسو جاتی اور الجھتی رہتی۔ اس میں ہمت نہیں تھی کہ وہ اس جگہ واپس جاتی جہاں سے وہ آئی تھی۔ ستارہ بیگم سے بھی وہ اچھی طرح واقف تھی۔ بڑے بڑے عہدیداروں، پولیس والوں کو اس نے ستارہ

لاؤنج کے دروازے سے فواد اندر آرہے تھے۔ آریان کا دل دھک سے رو گیا کہ کہیں خدا نخواستہ انہوں نے اس کی بات نہ سن لی ہو لیکن ان کے پاٹ چہرے سے اسے کسی قسم کا اندازہ نہیں ہوا۔
 ”آریان..... آپ نہیں گئیں دعوت پر.....“ انہوں نے اپنے کمرے میں جانے کی بجائے لاؤنج میں ہی صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس سے پوچھا۔ جو دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں چٹکتی مضطرب سی دکھائی دے رہی تھی۔ فواد نے بڑے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔
 ”ابھی بہت معصوم ہوں..... اندر کے احساسات چھپانے نہیں آتے تمہیں..... پھر کیوں خود پر جبر کرتی ہو..... کھل کر بات کہہ کر مطمئن کیوں نہیں ہو جاتی۔“ فواد سوچ رہے تھے لیکن انہوں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔

”وہ دراصل کس گیدر تک مجھے پسند نہیں۔“ اس نے جیسے رٹا رٹایا جملہ دھرا دیا۔
 ”ہوں.....“ ان کی آنکھیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور وہ اندر ہی اندر جزبہ زور ہی تھی۔
 ”آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں.....؟“
 ”نہیں..... تو.....“ ان کے جملے پوچھنے پر وہ گھبرا گئی۔
 ”آریان! میرا خیال ہے گزشتہ چند دنوں میں کم سے کم ہمارے درمیان اتنی دوستی ضرور ہو چکی ہے کہ آپ اپنی پریشانی اپنی کوئی تکلیف بلا جھجک مجھ سے شیئر کر سکیں۔“
 ”جی..... جی.....“ وہ سر جھکا کر بولی۔

”تو پھر وہ بات بتا دیجئے جو آپ کو پریشان کر رہی ہے۔ آپ کی اضطرابی کیفیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ بات معمولی نہیں ہے۔“ فواد اسے دھیرے دھیرے اپنے ٹریک پر لا رہے تھے۔
 ”آپ..... آپ یوں ہی پریشان ہو رہے ہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ بس امی یاد آ جاتی ہیں۔“
 ”آریان! آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ اپنے چہرے کے تاثرات نہیں چھپا سکتیں۔ امی کے یاد آنے پر آپ اس ہو سکتی ہیں پریشان اور خوف زدہ نہیں۔“
 ”یا امی..... یہ شخص کیا تاثرات کا پوسٹ مارٹم کرنے لگ جاتا ہے۔ آنکھیں ہیں یا ایکسرے مشین بندہ کچھ چھپا نہیں سکتا۔“ وہ جھنجھلا کر رہ گئی۔
 ”ٹھیک ہے..... آپ نہیں بتانا چاہتیں تو آپ کی مرضی.....“ وہ اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگے۔

”ایک منٹ ٹھہریے پلیز.....“ آریان کم سے کم ان جیسا ہمدرد کھونا نہیں چاہتی تھی۔
 ”ابھی ابھی ستارہ بیگم کے ایک آدمی کا فون آیا تھا..... وہ اب مجھے دھمکیاں دے رہے ہیں کہ میں خاموشی کے ساتھ ان کا کہنا مان لوں اور اسی غلامت کی دلدل میں واپس چلی جاؤں۔ جہاں سے اپنا

آپ بچا کر اتنی اذیتیں کاٹ کر میں یہاں تک پہنچی ہوں۔“ وہ سر جھکا کر بولی۔
 ”مثلاً کیا دھمکیاں دے رہے ہیں وہ.....“ فواد گہری سنجیدگی سے بولے۔
 ”وہ..... وہ اس گھر کے یکینوں کو کسی بھی قسم کا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ وہ لوگ بہت طاقتور ہیں بہت دسائل ہیں ان کے پاس۔“
 ”پھر..... آپ نے کیا سوچا؟“ فواد بھرپور توجہ سے اس کی بات سننے کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے کو بھی بغور دیکھ رہے تھے۔
 ”م..... میں..... میں نے ابھی کچھ نہیں سوچا۔“ آریان یہ نہ کہہ سکی کہ اس نے ان کے ہمراہ جانے کا فیصلہ کر لیا ہے اس لیے کہ اس خاندان کی عزت اور شرافت پر اس کی وجہ سے کوئی حرف آئے یہ وہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

”آریان! ایک بات تو طے ہے کہ اب آپ وہاں نہیں جائیں گی۔ اس گھر میں آنے کے بعد آپ ہماری عزت ہیں اور ہم اتنی جرأت رکھتے ہیں کہ اپنی عزت کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے دیکھنے والے کو اس حال کو پہنچا سکیں کہ دوبارہ وہ کسی کی طرف دیکھنے کے قابل ہی نہ رہے۔ سو یہ خوف اپنے ذہن سے نکال دیں۔ باقی رہا یہ سوال کہ وہ بہت طاقتور ہیں اور اس گھر کے یکینوں کو وہ کسی قسم کا کوئی نقصان پہنچا سکیں گے..... تو یہ بات بھی میں آپ پر واضح کر دوں کہ وہ ایسا کر کے دیکھ لیں انجام ان کے حق میں کس قدر بھیانک ثابت ہو سکتا ہے یہ وہ سوچ بھی نہیں سکتے۔“ فواد کا ٹھہرا ہوا لہجہ اور مطمئن انداز کسی حد تک آریان کو بھی طمانیت بخش گیا اس کا خوف کہیں دور جا سوا۔

”آریان! اپنی سوچوں پر خوف کو مسلط نہ ہونے دیں۔ خوف انسان کی شخصیت کو مسخ کر کے رکھ دیتا ہے اس کے اعتماد کو ختم کر دیتا ہے۔ اور میں آپ کی شخصیت کو اس کے تمام تر حسن سمیت دیکھنا چاہتا ہوں۔“ فواد جیسے لہجے میں کہہ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اور آریان ان کے کہے لفظوں پر غور کرنے لگی۔
 ”اس شخص کے حوالے سے خواب دیکھنا اب آنکھوں کو بہت اچھا لگنے لگا تھا۔
 وہ عامیانا اور فضول گفتگو نہیں کرتے تھے۔ لیکن چند لفظوں کا چناؤ بھی آریان کو بہت جامع محسوس ہو رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا اس کے ارد گرد فواد کی محبت کا نادیہ لیکن اتنا مضبوط حصار تن چکا ہے کہ بیرونی حواث جسے چھو تو سکتے ہیں لیکن توڑ کر اس تک پہنچ نہیں سکتے۔ وہ اس کے لیے۔

کبھی نہ ٹوٹنے والا حصار بن جاؤں

وہ میری ذات میں رہنے کا فیصلہ تو کرے

کی مکمل تفسیر بن چکے تھے اور آریان نے ان کی ذات میں رہنے کا فیصلہ دل سے کر لیا تھا۔



تھیں۔ دل میں اٹھتے ہزاروں دسو سے اور وہم ان کی امیدوں کو توڑنے کی کوشش میں لگے رہے لیکن وہیں کہیں موجود محبت کی سچائیاں اس ادھ موٹی امید کو پھر سے زندہ کر لیتیں۔ مسرت جہاں گھر سے بالکل لاتعلق ہو چکی تھیں اور شاید خود سے بھی۔ ان کا مطمح نظر صرف فرجاد کا انتظار تھا اور بس۔ فقط ہینا بھابی گھر میں واحد ہستی تھیں جو ان کی دل جوئی کرنے کی کوشش کرتیں۔ ان کے کھانے پینے کا خیال رکھتیں۔ لیکن عارب بھائی سے چھپ کر..... کیونکہ جب سے مسرت جہاں نے بھائیوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر فرجاد سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اس دن سے وہ عارب شاہ کے دل سے اتر گئی تھیں۔ اس لیے وہ خود ان کا ذکر کرنا یا سننا پسند کرتے تھے اور نہ ہی ہینا بھابی کو اجازت تھی کہ مسرت جہاں سے ہم کلام ہوں لیکن وہ عارب شاہ کی عدم موجودگی میں مسرت جہاں کا خصوصی خیال رکھتی تھیں۔ شاید وہ اپنی فطری نیک دلی اور حساسیت سے مجبور تھیں۔ اور یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ گھر والے سارے ہی مسرت جہاں کے خلاف تھے لیکن ہینا بھابی کا خیال یہی تھا کہ مسرت جہاں کی زندگی کا فیصلہ کرتے ہوئے ان کی خوشی کا خیال رکھنا گھر کے بڑوں کی ذمہ داری ہے۔ لیکن ان کے خیال کو کس نے کیا اہمیت دینی تھی۔ بہر حال مسرت جہاں کے ساتھ گھر میں صرف ہینا بھابی کا تھوڑا بہت رابطہ رہتا تھا۔ دسواں دن ڈھل گیا رات کی سیاہی نے آسمان پر چاروں اور اپنے پتکے پھیلا لیے تھے مسرت جہاں بستر پر گھٹنوں میں منہ دیئے بیٹھی تھیں۔ بنا کبل لیے اتنی شدید سردی میں وہ یوں بیٹھی ہوئی تھیں جیسے ان پر موسم کی شدتیں اثر ہی نہ کر رہی ہوں۔ وہ چنی، قلبی، روحانی اور جسمانی ہر اعتبار سے توڑ پھوڑ کا شکار تھیں۔ انتظار کی انتہا ہو چکی تھی دل اور دماغ کی جنگ کے سچ وہ نڈھال ہونے لگے تھیں۔

”فرجاد..... بس دو قدم ساتھ چل کر تھک گئے..... اتنی ہی ہمت تھی آپ میں۔ ارے میں تو آپ کے ساتھ خارزاروں اور پتھر لیے راستوں کی ہم سفر بننے کو بھی تیار تھی پھر کیا سوچ کر آپ نے قدم پیچھے ہٹا لیے۔ کیا سوچ کر مجھے یوں تنہا چھوڑ دیا۔ میں نے سب کی نظروں میں گر کر جینا گوارا کر لیا لیکن آپ سے دور ہو کر جینا..... نہیں..... مجھے ایسی زندگی نہیں چاہئے۔“ وہ دل ہی دل میں خود سے ہم کلام تھیں۔ جب کمرے کی خاموش فضا میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ انہوں نے کوئی توجہ نہ دی۔ سوچوں کے خاروں میں الجھتے ہوئے ان کے حواس بالکل ہی نیم مردہ سے ہو چکے تھے۔ تیسری نیل پر انہوں نے طوعاً و کرہاً یسور اٹھالیا۔

”ہیلو.....“ اکتا ہٹ آمیز لہجے میں گویا ہوئیں۔

”مسرت..... میں..... میں فرجاد..... دوسری طرف سے حیات آفریں آواز ان کی سماعت

میں اتر کر جیسے ان کی روح کو زندہ کر گئی۔

”فر..... فرجاد..... آپ..... آپ بہت سگدل ہیں..... اتنے دن آپ کو میرا خیال تک نہ آیا..... یہ

بھی نہ سوچا کہ میں کس قدر اذیت میں دن گزار رہی ہوں گی۔“ مسرت جہاں جیسے پھٹ پڑی۔

”مسرت..... آئی ایم ریلی سوری..... لیکن میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ چند دن لگ جائیں گے۔“

”لیکن ان چند دنوں میں اپنی خیریت بتانے کے لیے میرا احوال پوچھنے لیے آپ کم سے کم فون تو کر سکتے تھے۔“

ہاں یہ غلطی ضرور مجھ سے سرزد ہوئی۔ بہر حال اس وقت کیا کر رہی ہوں۔“

”آپ کے فون کی ہی منتظر تھی..... فرجاد..... زندگی میں میں نے کبھی کسی کا انتظار نہیں کیا لیکن ان دس دنوں میں انتظار کے جب کرب سے میں گزری ہوں میں چاہوں بھی تو نہیں بیان کر سکتی۔“

مسرت جہاں بھیکے لہجے میں بولیں۔“

”میں جانتا ہوں۔ انتظار کی اذیت کو مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے۔ زندگی بھر انتظار ہی تو کیا ہے۔ خوشیوں کا، سکون کا، آسودگی کا اور..... اور تمہارا۔ لیکن اب یہ انتظار ختم ہو جائے گا۔ تم جب میری زندگی میں آ جاؤ گی ناں تو سب کچھ مل جائے گا مجھے، تمہارا ساتھ خوشیاں بھی، سکون اور آسودگی بھی۔“ فرجاد ترنگ میں بولتا چلا گیا۔ مسرت جہاں اس کے لفظوں کے زیر و بم میں الجھ کر اس سے مزید شکوہ نہ کر سکیں۔ ورنہ ان دس دنوں کی ساری کوفت سارا کرب اس پر اندھیل دیتیں۔

”فرجاد..... مسرت جہاں نے اسے پکارا۔

”ہوں.....“ وہ جیسے کسی سوچ میں گم تھا۔

”ہم یہاں سے کہاں جائیں گے۔“ عجیب بچوں جیسے اشتیاق بھرے لہجے میں انہوں نے پوچھا۔

”اتنی بڑی زمین پر، کہیں نہ کہیں تو ہو گا وہ گوشہ جہاں ہم نے اپنی دنیا بسائی ہے۔ اتنے دن تمہیں بے وجہ انتظار نہیں کروانا رہا میں..... اپنا فلیٹ بیچ کر میں نے دوسری جگہ ایک چھوٹا سا مکان خریدا ہے۔ اس کی خرید و فروخت اور سیٹنگ میں کچھ وقت لگ گیا۔ بنک اکاؤنٹ ٹرانسفر کروا دیا ہے۔ ظاہری بات ہے اتنا بڑا قدم اٹھا کر ہم اس شہر میں تو نہیں رہ سکیں گے۔ مجھے تمہارے بھائیوں کا تو کوئی خوف نہیں لیکن تمہارا خیال ہے..... اس لیے ہم یہاں نہیں رہیں گے۔“ فرجاد نے دس دنوں کے دوران اپنی ساری مصروفیت کا جواز مسرت جہاں کے گوش گزار کیا۔ مسرت جہاں بھی کچھ مطمئن ہو گئیں۔

”اس وقت دس بج رہے ہیں ٹھیک ایک بجے میں تمہارے گھر کی عقی دوار کے قریب تمہارا انتظار کروں گا۔ بہت خیال اور دھیان سے محتاط ہو کر..... یہ سوچ لینا کہ اگر اس قدم کی بھٹک بھی کسی کو پڑ گئی تو پھر شاید ہم زندگی بھر نہ مل سکیں۔“ فرجاد نے کہا۔

”ٹھیک ہے..... میں ایک بجے پہنچ جاؤں گی۔“ مسرت جہاں نے کہا تو فرجاد نے فون بند کر دیا۔ یقیناً اسے تیاری میں کچھ وقت درکار ہو گا۔ مسرت جہاں بستر سے اٹھ گئیں۔ اپنے کمرے کا

دروازہ اندر سے بند کر کے پہلے انہوں نے انچ ہاتھ میں جا کر وضو کیا اور پھر کمرے میں جا کر جائے نماز بچھالی۔ نوافل ادا کر کے اپنے پالنے والے سے ہم کلام ہوئیں۔

”اے مالک..... تو دلوں کے حال جانتا ہے..... تیری اس دنیا میں ہماری کوئی حیثیت کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اس لیے ہم نے ایک فیصلہ کیا جو یقیناً تیرا بھی فیصلہ ہے کہ سب جانتے ہیں تیرے حکم کے بغیر ایک پتا بھی حرکت نہیں کر سکتا۔ کجا انسان ایک سے دوسرا قدم اٹھائے۔ تو نے ہر انسان کو حق اور اختیار دیا ہے کہ اپنی مرضی سے جنے جیسے چاہے جنے۔ ہم اسی حق کو استعمال کر رہے ہیں پروردگار تو ہماری مدد فرما۔ اس نئی مسافت کو ہمارے لیے سہل کر دے۔“ دعا مانگ کر جب وہ انھیں تو ان کا ذہن پہلے سے نہ سکون تھا۔ پہلے اگر کوئی ملال، کوئی خلش، کوئی دکھ تھا بھی تو اب اس کا ہلکا سا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ مطمئن انداز میں وارڈ روم کھول کر اپنے کپڑے نکالنے لگیں۔ چند زیورات اور پہننے کے کپڑے بعد ری نکال کر انہوں نے ایک بیگ میں رکھے اور وقت گزرنے کا انتظار کرنے لگیں لیکن جیسے گھڑی کی سوئیوں کو بھی علم ہو گیا تھا کہ وہ کیا کرنے جا رہی ہیں۔ سو وہ بھی جیسے رک رک سہم سہم کر چل رہی تھیں۔ سارے بارہ بجے مسرت جہاں نے اپنے دروازے سے باہر جھانکا۔ ابامیاں کے کمرے کی لائٹ جل رہی تھی باقی سادات مگر تقریباً اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ دروازے سے نکلنے لگی تھیں جب ابامیاں کے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ باہر نکل آئے۔ مسرت جہاں نے دروازہ دھیرے سے بند کرتے ہوئے ہلکی سے جھری چھوڑ دی اور اس میں سے باہر جھانکنے لگیں۔ ابامیاں عجب بے چینی کے عالم میں محن میں نہل رہے تھے۔

”یہ کیا.....؟“ وہ دھک سے رو گئی۔

”کہیں ابامیاں کو پتا تو نہیں چل گیا کہ میں کیا قدم اٹھانے لگی ہوں۔“ انہوں نے سوچا اور آگے بڑھ کر کمرے کی لائٹ آف کر دی۔ گویا دوسروں کو باور کرانے کے لیے کہ وہ سوچ چکی ہیں۔ ابامیاں بدستور محن میں نہل رہے تھے۔ مسرت جہاں مسلسل کھڑے رہنے کی وجہ سے تھک گئی تھیں۔ ٹانگیں اور پیچھے شل ہو گئے تھے لیکن خدا معلوم ابامیاں کو کیا بے سکونی، بے چینی اور اضطراب تھا جو وہ محن میں نہلے جا رہے تھے۔ ایک بجنے میں صرف پانچ منٹ باقی تھے۔ مسرت جہاں کی بے چینی اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی۔ انہوں نے ہاتھ میں پکڑی چادر اچھی طرح اپنے وجود کے گرد لپیٹ لی۔ حجاب سے چہرے کو چھپایا اور ایک ہاتھ میں بیگ تھام لیا۔ ابامیاں بیرونی دروازے کی طرف جا رہے تھے۔ مسرت جہاں پریشان ہوا انھیں لیکن یہی موقع تھا ان کے پاس۔ انہوں نے فرجاد سے کہا تھا کہ وہ چست کی طرف سے آئیں گی۔ سو ابامیاں کے بیرونی دروازے سے نکلتے ہی وہ ملی کی طرح بے آواز قدموں سے تیزی کے ساتھ برآمدے سے ہوتی ہوئی سیزھیوں کی طرف بھاگیں۔ دل یوں دھڑک رہا تھا جیسے سینہ پھاڑ کر باہر

آجائے گا۔ سادات مگر کے چاروں طرف بھرپور نگاہ دوڑاتے ہوئے وہ بہت تیزی سے سیزھیاں چڑھ گئیں۔ آخری سیزھی چڑھ کر وہ بے پاؤں تھوڑا آگے جا کر انہوں نے دھوکئی کی طرح چلتے سانسوں کو ہموار کرنے کی کوشش کی۔ بیرونی دروازے کے بند ہونے کی آواز آئی تو وہ چونک اٹھیں۔

”ایسا نہ ہو کہ ابامیاں میرے کمرے میں جھانکیں اور مجھے نہ پا کر گھر بھر کو میری تلاش میں سرگرداں کر دیں۔ پتا نہیں میں اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے آئی تھی یا جلدی میں کھلا ہی چھوڑ کر آ گئی۔“ وہ خود سے ہم کلام تھیں۔ ایک طرف اپنوں کے جاگ جانے کا خوف اور دوسری طرف یہ خوف کہ پتا نہیں فرجاد آیا بھی ہو گا یا نہیں۔ انہوں نے بہت آرام سے قدم آگے بڑھائے اور حویلی کی پشتی سمت چست کے آخری کنارے پر آ کر نیچے جھانکا۔ حویلی کی دیوار کے ساتھ کچھلی طرف ایک وسیع و عریض پلاٹ یونی بیکار پڑا ہوا تھا۔ مسرت جہاں کو وہاں نیم تاریکی میں ایک گاڑی اور اس کے ساتھ فیک لگائے باتوں میں مصروف دو انسانی بیولے دکھائی دیے۔ ایک پل کو وہ گھبرا کر پلٹیں۔ یقیناً رات کے اس پہر ان کی وہاں موجودگی بے سبب نہیں تھی۔ اور وہ کم سے کم ان کی نظروں میں نہیں آنا چاہتی تھیں لیکن اسی کے پیچھے ہنسنے سے پہلے ہی ان میں سے ایک بیوا تیزی سے قدرے روشنی میں آیا۔ وہ فرجاد تھا انہوں نے قدرے سکون کا سانس لیا۔ فرجاد نے بہت دھیمی آواز میں پوچھا۔

”نیچے کیسے آؤ گی۔“ مسرت جہاں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے ایک منٹ رکنے کو کہا۔ بیگ کی زپ کھول کر ری نکالی۔ یہ وہی ری تھی جس سے انہوں نے اپنے گھر کے سب سے بڑے درخت کی ڈال پر جھولا ڈال رکھا تھا۔ جس جھولے پر سادہ میں وہ جھولتے ہوئے گیت گنگنا کر رہی تھیں۔ جوان کے خوابوں، ان کی سوچوں میں شراکت دار تھا۔ آج وہ آنگن ہکھیاں، گڑیا بھی کچھ چھوڑ کر جا رہی تھیں تب بھی اس جھولنے نے اپنے ہونے کا حق ادا کر دیا تھا۔ وہ یہاں بھی ان کی خوشیوں کو حاصل کرنے میں مددگار ثابت ہوا تھا۔ انہوں نے زپ بند کر کے بیگ اوپر سے پھینک دیا جسے فرجاد نے کیچ کر کے ایک طرف رکھ دیا۔ فرجاد بہت غور سے ان کی ساری کارروائی دیکھ رہا تھا لیکن زیادہ بولنے سے گریز کر رہا تھا کہ کہیں اس کی آواز کسی اور کے کانوں میں نہ پہنچ جائے۔ یوں ری سے لٹک کر نیچے اترنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اس لیے اس نے مسرت جہاں کو کہا کہ وہ اچھی طرح ری کی مضبوطی کا یقین کر لینے کے بعد نیچے اتریں۔ مسرت جہاں نے ری کو اچھی طرح کھینچ کر جھکے دے کر اس کی پائیداری کا یقین کیا اور پھر کچھ جھجکتے ہوئے انہوں نے منڈیر پر سے اپنے پیچھے لٹکائے۔ دونوں ہاتھوں سے ری کو مضبوطی سے تھام کر انہوں نے خود کو فضا میں چھوڑ دیا۔ ایک پل کو تو انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے ان کے ہاتھ ان کا بوجھ برداشت کر پائیں گے اور ری ان کے ہاتھ سے چھوٹ جائیگی۔ ری ان کی نرم ہتھیلیوں پر بری طرح کھسک کر انہیں زخمی کر رہی تھی لیکن وہ اس وقت جس کیفیت سے گزر رہی تھیں۔ اس میں انہیں کسی چیز کا

احساس نہیں ہو رہا تھا۔ عجیب سا جمود طاری تھا۔ ذہن ہر سوچ سے خالی۔ بس فرجاد کو سامنے پا کر آنکھوں میں خوشی کی رمت جاگ رہی تھی۔ رسی زمین سے قدرے اونچی تھی اس لیے فرجاد نے ان کے دونوں بازو تھام کر انہیں نیچے اترنے میں مدد کی اور پھر تیزی سے ان کا ہاتھ تھام کر گاڑی کی طرف بڑھا۔

”چلو عامر“ پہلے سے گاڑی کے بیک ڈور کھلے ہوئے تھے فرجاد نے بیک انڈر پھینکا اور مسرت جہاں کے ہمراہ پچھلی نشستوں پر براجمان ہو گیا۔ عامر نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی بہت تیزی سے ٹرن لیا اور پھر ہر گز رتا لحد سادات نگر اور مسرت جہاں کے درمیان ان منٹ فاصلہ بڑھاتا چلا گیا۔ مسرت جہاں نے ایک محبت کی آسودگی کی خاطر سب کچھ قربان کر دیا۔ سادات نگر کے دروازے اپنے لیے بند کر دیئے خود اپنے ہاتھوں خون کے رشتوں کی ہر ذرہ کو توڑ کر وہ ایک نئی دنیا نیا جہان دریافت کرنے چل پڑیں۔ شاید ایک محبت کبھی کبھی بہت ساری محبتوں پر بھاری پڑ جاتی ہے۔ گاڑی اندھیرے میں گم ہو گئی تھی بالکل ایسے ہی جیسے شبیر حسین شاہ کی عزت۔



نئی لیے خنک ہوا سر ہیز درختوں کے پتوں سے اٹھکلیاں کر رہی تھی۔ لان میں لگائے گئے پھولوں کے پودے نت نئی خوشبوؤں کے حصار میں جھوم رہے تھے آسمان پر چھائے بادلوں نے یک دم موسم کو انتہائی حد تک دلکش بنا دیا تھا۔ یہ موسم ان سب کے لیے ایکساٹنگ ہوتا تھا۔ سو اس وقت بھی وہ سب لان میں جمع تھے۔ کچھ دنوں سے بڑی اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی لیکن آج وہ بھی کچھ بہتر محسوس کر رہی تھیں۔ سو وہ بھی ان سب کے رنج موجود تھیں۔ شاذان اور مہوش بیڈ منٹن کھیل رہے تھے۔ طاہر۔ انظہار۔ حسنین اور باصر الگ نیم بنائے کرکٹ کھیلنے میں مصروف تھے۔ روبہ۔ عتیقہ اور آریان بھی گھر کی خواتین کے ساتھ باتوں میں مصروف تھیں۔ جب سے فواد نے آریان کو اپنے ساتھ کا یقین دلایا تھا وہ پہلے کی نسبت کافی خود اعتماد نظر آنے لگی تھی۔ خوف بدرجہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ اور اسے زندگی کا یہ نیا روپ اچھا لگ رہا تھا۔ یقیناً جو لوگ خوشیوں اور محبتوں کو ترسے ہوئے ہوتے ہیں ان کے لیے تھوڑا بھی بہت ہوتا ہے۔ محبت کے چند قطرے بھی اب حیات کا درجہ رکھتے ہیں۔

ماحول بہت خوشگوار تھا سب ہنس بول رہے تھے۔

”ویسے زاہدہ! اب تم فواد کی شادی کر رہی دو۔۔۔ گھر میں کچھ ہلاک ہو کوئی رونق ہو۔“ بھابی مقوم نے خاموش بیٹھی زاہدہ چچی کو مخاطب کیا۔

”بس بھابی! بچوں کی مرضی اور پسند جہاں ہوگی وہاں کریں گے۔ فواد نے ابھی کسی لڑکی کے بارے میں مجھ سے بات نہیں کی۔“ زاہدہ چچی اس دن کے جھگڑے کے بعد سے بہت خاموش خاموش رہنے لگی تھیں۔ باہر چچا کے چہرے کی مایوسی اور دلگھڑائی کا ذمہ دار وہ خود کو ٹھہراتی تھیں۔ اس لیے اب ان

لی فطری اکثر، ضد اور انا پرستی جیسے اپنی موت آپ مر گئی تھی۔ بہت نرم اور چکدار رویہ ہو گیا تھا ان کا سب کے ساتھ اور تقریباً سب ہی گھروالوں نے نوٹ بھی کیا تھا یہ اور بات کہ انہیں جتنا یا نہیں۔ اور فواد، شاذان یا مہوش نے بھی ان سے کسی قسم کی بازندہ نہیں کی تھی۔ ان تینوں نے ماں باپ کے درمیان ہونے والے ساری گفتگو سنی تھی لیکن اس سلسلے میں وہ بالکل یوں انجان بن گئے تھے جیسے انہوں نے کچھ نہ سنا ہو۔ اور شاید بازندہ کرنے کا حق ان کے پاس تھا بھی نہیں۔

”ہاں۔۔۔ یہ تو تم نے ٹھیک کہا آج کل کے بچے کہاں ماں باپ کی پسند کو کچھ گردانتے ہیں۔“ تائی مقوم بولیں۔

”تائی امی! کیا آپ کے زمانے میں بھی لوگ پسند سے شادیاں کرتے تھے۔“ عتیقہ نے کہا۔

”ارے تو بہ کرو۔۔۔ پسند کی شادی۔ تو بہ تو بہ۔ ہمارے زمانے میں تو لوگ اپنی شادی کا تذکرہ تک اپنے منہ سے نہیں کرتے تھے۔ کہاں مرضی کی شادی۔۔۔ ماں باپ نے جس کھونٹے سے باندھ دیا، چپ چاپ سر جھکا کر بندھ گئے مجال ہے جو احتجاج کیا ہو۔ آج کل کی تو لڑکیاں ایسی منہ پھٹ ہیں کہ اپنی شادی کی بات بھی یوں کریں گی جیسے کسی عام سی تقریب میں شرکت کرنی ہو۔ نہ بھی آج کل تو بہت ہی برے حالات ہیں۔“ تائی مقوم معصومیت سے کہہ رہی تھیں۔

”نہیں خیر بڑی بھابی! ایسی بھی بات نہیں۔ اس وقت بھی بڑے بڑے کھلاڑی پڑے تھے جو ماں باپ کی عزت کی پرواہ کیے بغیر اپنی مرضی اور پسند سے شادی کر کے خاندان کے منہ پر کالک ملنے کو برا نہیں سمجھتے تھے۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں۔“ حدیقہ چچی کا زہریلا لہجہ محفل میں موجود سبھی کے حلق کڑوے کر گیا تھا۔ اللہ جانے حدیقہ کو اس گھرانے کے لوگوں سے کیا بیز کیا دشمنی تھی۔ وہ ان سب میں سے کسی کو بھی ہنستا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ اگر ان کے اور اس گھرانے کے حراج اور پسند میں کوئی فرق تھا تو اس کا انتقام وہ سب سے کیوں لے رہی تھیں۔ ایک ان کی ذات کے لیے تو سب اپنا آپ اپنی گھریلو روایات بدلنے سے رہے۔ اگر انہیں اپنی اور دوسروں کی خوشی مقوم ہوتی تو یقیناً وہ خود کو اس ماحول میں ڈھالنے کی کوشش کرتیں لیکن انہوں نے نہ صرف خود کو اپنے میاں اور بچوں کو سب سے الگ کر لیا تھا۔ بلکہ موقع بے موقع طنز اور تحقیر کے نظروں سے دوسروں کو زخمی کرنا بھی اپنا فرض سمجھ لیا۔ بڑی اماں کا مسکراتا ہوا چہرہ ایک ٹل کوتاہیک ہوا لیکن بچوں کی موجودگی میں وہ کسی قسم کا تاثر نہیں دینا چاہتی تھیں۔ اس لیے حدیقہ کی طرف سے انہوں نے اپنی توجہ ہٹائی۔

”حدیقہ! کبھی کبھی دوسروں کا دل رکھ لینا دوسروں کی دل جوئی کرنا آپ کی ذات کو دوسروں کی نگاہ میں معتبر کر دیتا ہے۔ میرا خیال ہے تم سمجھ گئی ہوگی۔“ عتیقہ چچو کے سر دلچے میں پہلی بار حدیقہ چچی کے لیے ایک حبیہ تھی۔ حدیقہ چچی ہونہ کہہ کر دوسری طرف متوجہ ہو گئیں۔ ایسا کر کے وہ صرف اپنے لیے

نفرت کاشت کر رہی تھیں۔ آج جو یورپی تھیں کل وہی کاٹنا بھی تھا۔ سو کسی نے زیادہ توجہ نہ دی۔ ایچہ چائے کے برتن اٹھا کر اندر جانے لگی تو آریان بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ گئی۔ حدیقہ چچی کی حقارت اور تفاخر بھری نگاہیں اسے اپنے وجود کے آ رہا رہتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ اس لیے وہ بھی ایچہ کے ہمراہ اپنے پورشن میں آگئی۔ ٹیلی فون کی بیل پہلے ایچہ نے ہی سنی تھی۔ برتن کچن میں رکھ کر اس نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھالیا۔ دوسری طرف کی بات سن کر اس نے ریسیور پر ہاتھ رکھا اور بولی رہی آپلی۔ آپ کا فون۔ کمرے کی طرف جاتی آریان کے قدم زمین نے جکڑ لیے۔ وہ بمشکل پلٹی۔

”میرا فون“

”جی شاید سکول سے ہو۔۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے آپ نے اپنا ٹیکسٹ نہیں بھیجی ہوگی تو سر پھٹی کی وجہ معلوم کرنا چاہتے ہوں گے۔“ ریسیور ہاتھ میں دیتے ہوئے قیاس آرائی کرنے کے بعد ایچہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ آریان نے ریسیور کان سے لگالیا۔

”ہیلو۔۔۔۔۔۔“ وہ مری مری آواز میں بولی۔ حقیقتاً اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ کسی طرح یہیں کھڑے کھڑے غائب ہو جائے۔ تاکہ اسے تکلیف پہنچانے والے، اس کے نقصان کے درپے ظالم لوگ ہاتھ ملتے رو جائیں لیکن یہ ناممکن تھا۔

”ہمارا خیال ہے رانی جی! تین دن سوچنے کے لیے بہت ہوتے ہیں۔ اور جہاں معاملہ ماں کی زندگی کا آجائے۔ اپنی زندگی اور دوسرے محبت کرنے والوں کی عزت کا۔ میرا خیال ہے وہاں فیصلہ کرنے میں زیادہ تاخیر نہیں کرنی چاہئے۔“

”تم لوگ میرا چچا چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔۔۔۔۔۔ آخر کیا بگاڑا ہے میں نے تمہارا۔ کیوں زندگی کو میرے لیے ایک ناروا بوجھ بنانے پر قتل گئے ہو۔۔۔۔۔۔ اس کا لہجہ بھیگ گیا۔

”کیسے چھوڑ دیں تمہارا چچا۔۔۔۔۔۔ ارے بڑا روپیہ لگایا ہے ہم نے تم پر۔۔۔۔۔۔ وہ ستارہ بیگم۔۔۔۔۔۔ وہ کسی طرح بھی تم سے دستبردار نہیں ہوگی۔“

”کتنا پیسہ لگایا ہے اس بدکار عورت نے۔۔۔۔۔۔ میں سارا ادا کر دوں گی۔ پائی پائی واپس کر دوں گی لیکن خدا میرا چچا چھوڑ دو۔“ آریان سسک رہی تھی۔

”کہاں سے لاؤ گی اتنا پیسہ۔۔۔۔۔۔ اے ہاں یاد آیا۔۔۔۔۔۔ اپنے راجہ سے کہو گی ناں کہ تمہاری قیمت چکا ہے۔ تمہیں ہم سے خریدے۔۔۔۔۔۔ لیکن رانی ہمارے بھی تو کچھ اصول ہیں۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ ستارہ بیگم اپنی دسترس میں آئی چیز یا کو اتنی آسانی سے نہیں نکلے دیتی۔ اس لیے اب فیصلہ کر کے بتا دو کہ کیا کرتا ہے۔“

”جب میں ایک بار کہہ چکی ہوں کہ قیمت چکا دوں گی اپنی۔۔۔۔۔۔ پھر۔۔۔۔۔۔ پھر بھی نہیں چھوڑ دے گی

میرا چچا۔“

”بتایا ناں کہ جو چیز ہماری ملکیت میں ہو وہ ہم کسی کو نہیں دیتے۔ بے کار ہونے پر توڑ سکتے ہیں۔“

”تو پھر ٹھیک ہے جو تمہارے دل میں آئے کرو۔ میں نے بھی فیصلہ کر لیا ہے کہ خواہ موت کو گلے لگاتا پڑے لیکن گندگی کے اس ڈھیر میں دوبارہ واپس نہیں جاؤں گی۔“

”ارے رانی! کیسی باتیں کرتی ہو۔۔۔۔۔۔ سونے کے جھروکوں کو گندگی کا ڈھیر کہہ رہی ہو۔“

”ارمانوں کے خون میں نہائے سونے کے جھروکے تمہیں مبارک ہوں۔ میری جان چھوڑو۔۔۔۔۔۔ یہ ذہن میں رکھ لو کہ میں اب تنہا نہیں ہوں۔ میرے ساتھ زبردستی تمہیں مہنگی پڑ سکتی ہے۔“

آریان کے لہجے میں فواد کی ہمراہی کا عہد غرور بن کر سایا ہوا تھا۔

”ہم سمجھ گئے۔۔۔۔۔۔ یہ تمہی سیدھی انگلیوں سے نکلنے والا نہیں۔ کوئی بات نہیں رانی جی۔ شاید تم بھول گئیں کہ ستارہ بیگم جب تمہی نکالنے کے لیے انگلیاں نیڑھی کر لے تو پھر بہت کچھ تہہ وہ بالا ہو جاتا ہے۔ اور ہم انگلیاں نیڑھی نہیں کرتے پورا ہاتھ تمہی میں ڈال دیتے ہیں۔ تم نے جو کہنا تھا کہہ ڈالا۔۔۔۔۔۔ اب جو کرنا ہے ہمیں کرنا ہے۔ افسوس تمہیں اپنا تو کیا احساس ہونا ہے اپنی ماں اور اپنے ارد گرد کھڑے لوگوں کی عزتیں اور جانیں بھی اپنی ضد کے عوض داؤ پر لگا دیں تم نے۔“ دوسری جانب سے ٹیلی فون بند کر دیا گیا۔ اس نے بھی بے جان ہاتھوں سے ریسیور کرینڈل پر رکھ دیا اور وہیں قریب پڑی کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔ پتہ نہیں اس کے نصیب کی یہ سیاسی کب دھلے گی۔ اس کی سوچیں اذیت سے کرانے لگی تھیں۔ درد سینے میں پھیلتا جا رہا تھا۔

”کیا کہیں کوئی جائے لگاں نہیں۔ کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں وہ اپنی حرمت سمیت زندگی کے سانس پوری کر سکے۔“ اس کی ماں۔۔۔۔۔۔ اذیتوں کا سفر کانٹے کاٹنے ختم ہوتی جا رہی تھی۔ ہر جبر سہہ چکی تھی وہ۔ لیکن غلاظت کی بے حس دلدل میں وہ گری ہوئی تھی اس میں سے نکلنے کا کوئی راستہ بھائی نہیں دیتا تھا۔ آریان کو خود سے دور رکھ کر پل پل اس کی یاد میں تڑپتی رہتی تھی یہ سوچ کر اس کا تڑپنا اذیت سہنا اور آریان کو اپنی ممتا سے محروم کر دینا اس سے کہیں زیادہ بہتر تھا کہ وہ اس کو غصے کے گندے ماحول میں چلتی۔۔۔۔۔۔ دن رات اس کی سماعت میں گھٹکھروؤں اور طلبوں کی صدا تھیں گونجتی اور ایک دن وہ نوخیز پھول حالات کے سنگلاخ ہاتھوں میں آکر پتی پتی ہو کر بکھر جاتا۔ اسے اپنی بچی کا بکھرنا منظور نہ تھا لیکن اس کی یہ ساری ریاضتیں، ساری کوششیں رائیگاں جات رہتی تھیں۔ اس کی اذیتیں نکلنے نہیں بے کار گئیں۔ ستارہ بیگم کی شاطر نظروں کی گرفت آریان پر پڑی تو جیسے وہ کھل ہی اٹھی تھی۔ اس کے کوٹھے پر حسین ترین اور چاند جیسا روشن چہرہ اپنی چھب دکھاتا تو بڑی بڑی نائیکا میں ہاتھ ملتی رہ جاتیں۔ ستارہ بیگم نے خفیہ طور پر آریان کو ہوشل سے یوں غائب کر دیا کہ خود اسے بھی پتا نہ چل سکا۔ جب اس نے اپنی ماں کے بے

بس چہرے اور ہتھکڑیاں کی ٹکڑیوں سے لبریز پیشانی دیکھی تو بہت کچھ سمجھ گئی۔ ستارہ بیگم کا داؤ چل گیا تھا۔ اس کی ماں کی محنت اور کوشش بھی اسے نہ بچا پائی تھی لیکن آریان کوئی ترنوالہ نہیں تھی جسے آسانی سے ہضم کر لیا جاتا۔ وہ کسی ہڈی کی طرح ستارہ بیگم کے حلق میں اٹک گئی تھی۔ مجبور ہو کر ستارہ بیگم نے خفیہ طور پر اس کا سودا کر دیا۔ ہتھکڑیاں کو اس کی بھنگ پڑ چکی تھی۔ سو وہیں سے فرار کا منصوبہ بنایا گیا اور آریان ان لوگوں کے چنگل میں پھنسنے سے پہلے ہی بھاگ نکل گئی۔ اور اب... اب وہی لوگ دوبارہ مسلسل اذیت کا سامان پیدا کر رہے تھے۔ ایسے کسی کام سے اپنے کمرے سے نکلی تو آریان کو یوں بے حس و حرکت مینٹا دیکھ کر اس کے قریب چلی آئی۔

”کیا بات ہے رینی آپنی... آپ کیوں اس قدر پریشان دکھائی دے رہی ہیں...“ اس نے آریان کو مخاطب کیا۔

”نہیں تو! ایسی تو کوئی بات نہیں...“ آریان اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ اپنے چہرے کے تاثرات کو چھپانے کا کمال نہیں رکھتی لیکن پھر بھی وہ اسے کیا بتاتی اس کا خاموش رہنا ہی بہتر تھا۔

”تم دونوں یہاں اس طرح کیوں بیٹھی ہوئی ہو جیسے کسی کا انتظار ہو۔“ کوریڈور میں داخل ہوتے ہی روبیہ کو وہ دونوں گفت و شنید کرتی دکھائی دیں۔

”انتظار کس کا کرتا ہے... آریان آپنی پریشان ہیں لیکن بتاتی ہی نہیں ہیں کہ کیا وجہ ہے؟“ ایسے نے کہا تو روبیہ نے بھی بغور آریان کی طرف دیکھا۔

”ہاں پریشان تو یہ واقعی لگ رہی ہے... سو آریان بغیر ر کے شروع ہو جاؤ۔ اگر تم اپنی پریشانی ہمیں نہیں بتاؤ گی تو ہم یہی سمجھیں گی کہ ہماری اتنی محبت کے باوجود تم ہمیں اب تک اپنا نہیں سمجھیں۔“

”نہیں ایسا مت سوچو... میں سچ کہتی ہوں کہ تم دونوں نے بہن کی کمی پوری کی ہے میرے لیے... مجھے جیسی کم مایہ لڑکی اتنی محبت اتنے غلوں کی کہاں حق دار تھی...“

”تم کس لائق ہو... یہ دوسروں پر چھوڑو۔ اس وقت اپنی پریشانی بتاؤ ہمیں...“

”کیا کرو گی سن کر... میں جو ہوں جیسی ہوں اس پر پردہ ہی پڑا رہے دو۔ میں تم دونوں کی محبت اور اس گھر کے سائے سے محروم نہیں ہونا چاہتی... میں جانتی ہوں جب تم دونوں سب کچھ جان لو گی تو نفرت سے منہ پھیر لو گی۔ اور محبت بھرے چہروں پر اپنے لیے نفرت مجھ سے برداشت نہ ہو پائے گی۔“

”رینی... خود سے نتیجہ اخذ کرتی رہتی ہو تم... افسوس صد افسوس کہ تم ہمیں سمجھ نہ سکیں۔“ روبیہ کے لہجے میں ملال تھا۔ آریان خاموش بیٹھی اس کی بات سن رہی تھی۔

”اب بول بھی چکو... کیوں ہمارے صبر کا امتحان لینے پر تکی ہوئی ہو۔“ روبیہ محبت بھری ناراضگی سے بولی۔ آریان نے سوچا... نہیں تو کمال... سب کچھ ان کو ہاتھ چل ہی جاتا ہے۔ نتیجہ تب بھی وہی

نکلے گا جواب لگتا ہے۔ وہ محبت کو آزمایا چاہتی تھی کہ اگر ان کے رویے بدل بھی گئے تو کم سے کم ان سب کو چھوڑتے ہوئے اسے بہت زیادہ اذیت تو نہیں ہوگی۔ اس نے اپنی داستان حیات کا ورق ورق ان دونوں کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔ ہر وہ اذیت جو اکیلے اس نے یا اس کی ماں نے سہی تھی۔ لفظوں میں ڈھال کر بیان کر دی۔ آنکھوں سے اشک برسنے لگے تھے۔ لفظ بے ربط ہو کر ٹوٹ ٹوٹ کر ہونٹوں سے ادا ہو رہے تھے اور روبیہ، ایسے ساکت بیٹھی درود کی یہ داستان سن رہی تھیں۔ اپنی بات کے اختتام پر اس نے سر اٹھا کر روبیہ اور ایسے کے چہروں کے تاثرات دیکھے... وہاں کچھ بھی غیر معمولی نہیں تھا۔ نہ حقارت، نہ حقیقت چھپانے پر کوئی غصہ۔ ان کی آنکھیں اس کے چہرے پر تکی ہوئی تھیں لیکن پُرسوز انداز میں۔ آریان ان کے یوں یک ٹک دیکھنے پر سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ دل میں چور ہو تو انسان خواہ مخواہ بات بے بات نتیجہ اخذ کرنے لگتا ہے۔ ندامت محسوس کرتا ہے یا خود کو دوسروں کی نظروں سے چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور آریان کا بھی اس وقت یہی حال تھا۔

”رینی... جن سے محبت کی جاتی ہے ناں انہیں اپنے درد کا بھی شریک بنایا جاتا ہے۔ جب انسان نے تنہا ہی اذیتوں کا سفر طے کرنا ہو تو پھر یہ محبتیں، یہ رفاقتیں محض بہلاوہ ہوتی ہیں۔ ایک بہانہ، صرف بے نام رشتہ...“ روبیہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

”آپنی! اتنے دن ہمارے درمیان رہ کر بھی آپ نہ جان سکیں کہ ہم نے آپ سے جیسی ہیں جو ہیں ہمیں قبول ہیں کی بنیاد پر دوستی کا رشتہ اپنایا ہے۔ آپ کا ماضی کیا تھا، ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں۔ اس لیے کہ ہم اچھی طرح جان چکے ہیں کہ آپ بے قصور بے خطا تھیں۔ ہمیں آج کی آریان آپنی سے پیار ہے۔ اتنا کہ ہم انہیں اپنی ذات کا ایک حصہ سمجھنے لگے ہیں۔ اور جہاں تک نفرت کی بات ہے تو میری پیاری آپنی... نفرت تو ہم نے قابل نفرت لوگوں سے کبھی نہیں کی... آپ... آپ تو پاکیزہ ہیں، معطر ہیں کسی پھول کی طرح... آپ کو تو خدا نے بنایا ہی محبت کے لیے ہے۔ پھر ہم سب آپ سے نفرت کیوں کریں۔“ ایسے کا ایک ایک لفظ امرت بن کر آریان کے دھکے دل کو بھگور رہا تھا۔ اس نے غم آلود آنکھوں سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

”یہ ذہن سے نکال دو رینی! کہ ہم تمہیں جانے دیں گے۔ تم حالات کی تیز دھوپ میں جھلس جاؤ یہ ہم کبھی برداشت نہیں کر سکتے۔“ روبیہ نے کہا تو اس کے لہجے میں آریان کے لیے فکر اور محبت رہی ہوئی تھی۔

”لیکن روبی! وہ تم دونوں کا نام لیتے ہیں کہ اگر میں ان کے ساتھ نہ گئی تو وہ خدا نخواستہ تم دونوں میں سے مجھے جانا ہو گا اس لیے کہ اپنی ذات کو بچا کر میں تم دونوں کو اذیت کے الاؤ میں نہیں پھینک سکتی۔“ آریان دکھ بھرے لہجے میں بولی۔

”رینی آپنی! نہ تو آپ کہیں جائیں گی اور نہ ہی ہمیں کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے...“

جانتے نہیں کہ سادات گھر کے باسی ابھی اتنے کھوکھلے نہیں ہوئے کہ کوئی ایرا غیر ایوں مناٹھا کر چلا آئے عزتوں کا سودا کرنے..... "ایقہ زندگی میں پہلی بار اتنی سنجیدہ ہوئی تھی۔ روبیہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا یہ تم ہی ہوگی....." وہ شرارت آمیز لہجے میں بولی۔ ماحول پر طاری کشیدگی کو بھی تو کسی طرح کم کرنا تھا۔

"کیوں..... کیا سینک نکل آئے ہیں میرے جو پہچاننے میں دقت ہو رہی ہے۔"

"نہیں خیر تم بغیر سینکوں کے بھی کم خوبصورت نہیں....."

"ایسا! پلیز اس وقت میں خطرناک حد تک سنجیدہ ہوں۔ زندگی میں پہلی بار....."

"اور شاید آخری بار بھی....." روبیہ نے لقمہ دیا لیکن اہیقہ نے سنی ان سنی کر دی۔

"معاملہ کم سنگین نہیں ہے..... ہمیں بہت سنجیدگی سے اس مسئلے کا حل سوچنا ہے کہ آریان آپلی پر

کوئی حرف نہ آئے..... گھر کے بڑوں کو بھی خبر کرنی پڑے گی تاکہ کسی بھی پیش آنے والی مشکل میں ہمیں مکمل سپورٹ دستیاب ہو..... میرا خیال ہے سب سے پہلے فہدی بھائی سے بات کی جائے....."

"ہاں ان سے بات کی جائے..... تاکہ ایک بار پھر آریان کو گھر بھر کے سامنے ذلیل کرتے پھریں۔" روبیہ کو فواد کے اس دن والے رویے پر بہت غصہ تھا۔ حالانکہ آریان نے اس دن کے بارے میں بھی پوری تفصیل سے انہیں آگاہ کیا تھا کہ غلطی فواد کی نہیں تھی۔ ان کی جگہ کوئی بھی ہوتا۔ ایسے انکشاف کے بعد اس کا رویہ ایسا ہی ہوتا تھا۔

"نہیں روبی! اب ایسا نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ اب وہ سب کچھ جان چکے ہیں۔" آریان نے ڈھکے مچھے لفظوں میں فواد کی حمایت کی۔

"تو بس پھر ٹھیک ہے..... فہدی بھائی اور شانی بھائی کو ساتھ ملا لیتے ہیں۔" اہیقہ نے کہا۔

"اور مبہوش.....؟" روبیہ نے پوچھا۔

"رہنے دو اس مغرور حسینہ کو..... بے چاری کی ناک کے نیچے ہی نہیں آتا کوئی۔" اہیقہ جیسے اس سے سخت خار کھائے بیٹھی تھی۔

"چلو ٹھیک ہے رات کو فہدی بھائی کے ساتھ ڈسکس کریں گے۔" اہیقہ اور روبیہ اس کے لیے کس قدر فکر مند تھیں۔ جس کے چاہنے والے اس قدر فکر مند اور حساس ہوں اسے بھلا کیا خوف..... آریان کو ان کا اپنے لیے یوں متشکر اور پریشان ہونا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ بہر حال ان کو اپنا جواز بتا کر اس کی پریشانی تھوڑی کم ہو گئی تھی۔ طبیعت بھی قدرے بحال ہو گئی۔ شینا پھپھو کے آجانے پر گفتگو کا موضوع بدل گیا۔ اور جب عشاء کی اذان سے کچھ پہلے ڈاکٹر فواد کھینک سے واپس آئے تو اہیقہ نے ان سے تھوڑا

سادقت مانگا۔

"کیا بات ہے بہت قارل اور سنجیدہ ہو رہی ہو....." انہیں اس کا سنجیدہ ہونا کھل رہا تھا۔

"حالات اور ماحول پر ڈچینڈ کرتا ہے برادر..... بہر حال آپ کھانا دانا کھالیں..... کچھ دیر بعد ہم آپ کو شرف ملاقات بخشیں گے۔" آخری جملے میں شرارت کی آمیزش تھی۔

"تم کبھی سدھر سکو گی مجھے ناممکن ہی لگتا ہے۔" فواد مسکراتے ہوئے اپنے پورشن کی طرف بڑھ گئے۔ رات کو میٹنگ کے شرکاء جن میں فواد، شاذان، اہیقہ، روبیہ اور آریان شامل تھے فواد کے کمرے میں موجود تھے۔

"ہاں بتاؤ..... کیا مسئلہ ہے۔" فواد بند پر بیٹھ کر سر ہانہ گود میں رکھتے ہوئے بولے۔

"جناب عالی..... مسئلہ سنگین ہے بھی اور نہیں بھی۔ بہر حال مسئلہ آریان آپلی سے متعلق ہے۔" اہیقہ نے بات شروع کی۔

"کیا مطلب.....؟" فواد کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولے۔

"مطلب یہ کہ جو لوگ آپ کے کلینک میں آئے تھے..... جھگڑا اور توڑ پھوڑ کی تھی انہوں نے۔ وہ لوگ اب آریان آپلی کو پریشان کر رہے ہیں۔" اہیقہ نے مختصر الفاظ میں کہا۔ فواد جان گئے کہ آریان نے اہیقہ اور روبیہ کو اپنا امر از بنالیا ہے البتہ شاذان منہ کھولے ہوناقوں کی طرح دیکھ رہا تھا اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"کیا مطلب! کون لوگ ہیں وہ....."

"دیکھو شانی! تم اپنی چھوٹی سی عقل دانی پر زیادہ بوجھ نہ ڈالو....." اہیقہ نے شاذان سے کہا جو تجسس نظروں سے آریان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"لیکن یہ سب آپ خود بھی تو مجھے بتا سکتی تھیں آریان! آپ نے اتنے دن مجھ سے اس مسئلے پر کوئی بات نہیں کی تو میں سمجھا شاید وہ خود ہی پیچھے ہٹ گئے۔ بہر حال آپ پریشان نہ ہوں بہت جلد اس کا کوئی حل نکال لیں گے۔" فواد کے لہجے میں چھپی پس پردہ شکایت آریان کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ لیکن اس نے زیادہ غور نہیں کیا۔ اس وقت ان سب کی ہمدردیاں توجہ اور ساتھ ہی اس کی سب سے بڑی ضرورت تھی۔

"برادر عزیز! اسی حل کو تلاشنا ہے اسی لیے ہم یہاں آئے بیٹھے ہیں۔" اہیقہ نے کہا۔

"میرے خیال میں ہمیں شینا پھپھو سے تفصیلی بات کر لینی چاہئے۔ وہ ہمیں بہتر گائیڈ کر سکتی ہیں۔"

"لیکن کیا وہ ناراض نہیں ہوں گی۔" آریان کے لہجے میں غدر کا تاثر تھا۔

"نہیں آریان! شینا پھپھو ایک لبرل سوچ کی مالک بہت سلجھی ہوئی خاتون ہیں تم دیکھنا وہ ہمارے لیے اس مسئلے میں کتنی مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ اور اہیقہ میں پہلے شینا پھپھو سے بات کروں گا۔"

مجھے یقین ہے کہ کوئی بہتر راستہ نکل آئے گا۔“

”کیا مطلب ہے کیا ابھی بات کرنے جا رہے ہیں۔“ ہدیہ نے حیرت سے پوچھا۔

”کیوں اس میں کیا ہرج ہے۔۔۔۔۔؟“ وہ استغہامیہ انداز میں بولے۔

”نہیں ہرج تو کوئی نہیں۔۔۔۔۔ بہر حال جیسے آپ کی مرضی۔۔۔۔۔“

”میں یہ سوچ رہا ہوں کہ جس قدر جلد ہو سکے اس مسئلے کو حل ہو جانا چاہئے۔ تاخیر کسی صورت بہتر نہیں ہے۔ بہر حال میں جا رہا ہوں پھپھو کے پاس۔ تم لوگ یہیں رک کر میرا انتظار کرو۔“ فواد کہہ کر کمرے سے نکل گئے۔

”لوا کیلے ہی جیمز بانڈ 007 بننے کا شوق چرایا انہیں۔“ ہدیہ کو قلعہ ہو رہا تھا کہ فواد انہیں چھوڑ کر خود آریان کے سب سے بڑے خیر خواہ بن کر ماما کے پاس چلے گئے تھے۔ بہر حال اب صبر اور انتظار کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ وہ برا سامنہ بنا کر بیڈ پر نیم دراز ہو گئی۔ جبکہ آریان خاموش بیٹھی اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں پر نگاہیں جمائے ہوئے تھے۔ بقول روہیہ کے بہت روشن چیشانی تھی اس کی اور بہت فریش لکیریں تھیں اس کے ہاتھ میں۔ لیکن مقدر میں روشنی کہیں نہیں تھی بس اندھیرے ہی اندھیرے تھے۔ مقدر کی کٹھنی ایک زخمی مسکراہٹ بن کر اس کے ہونٹوں پر ثبت ہو گئی۔

ادھر فواد ذہن میں لفظ ترتیب دیتے ہوئے ہینا پھپھو کے کمرے میں داخل ہوئے تو وہ سامنے بیڈ پر نیم دراز کوئی ڈائجسٹ پڑھنے میں مصروف تھیں۔ برسوں سے ان کی یہ مطالعہ والی عادت آج تک نہ چھوٹی تھی۔

”پھپھو آ جاؤں۔۔۔۔۔؟“ وہ دروازے میں ہی رک کر اجازت طلب کرنے لگے۔

”آ جاؤ۔۔۔۔۔ وہ سیدھی ہو بیٹھیں۔“

”کیا ہو رہا تھا۔۔۔۔۔؟“ انہوں نے یونہی برہنہ لہجہ میں پوچھا۔

”روز کی روٹین پوری کر رہی تھی۔ ایسی عادت پڑی ہوئی ہے کہ رات کو کچھ پڑھ نہ لوں نیند نہیں آتی۔“

”پھپھو یہی تو آپ کی ڈیسنسٹی ہے۔ حقیقتاً اس مطالعے ہی کے باعث گھر میں سب سے لبرل ہیں آپ۔“ وہ عقیدت سے بولے۔

”خیر تو بے بڑا کھن لگایا جا رہا ہے۔“ پھپھو کو اپنا یہ ہونہار ہتھیار بہت پیارا تھا۔

”نہیں پھپھو میں سچ کہہ رہا ہوں۔۔۔۔۔ بہر حال اس وقت تو میں بہت اہم موضوع پر بات کرنے کے لیے آیا ہوں۔ آپ کو کوئی مصروفیت تو نہیں یا نیند تو نہیں آرہی۔“

”نیند اور مصروفیت تم سے زیادہ اہم تو نہیں۔ تم بات کرو میں سن رہی ہوں۔“ انہوں نے فواد

کے کہنے کو بہت اہمیت دی۔ جس سے ان کو کافی حوصلہ ہوا۔

”پہلی بات تو یہ کہ آپ خود کو بالکل غیر جانبدار فریق کے طور پر رکھیں گی۔ دوسرے سادات نگر کی روایات و اقدار اور یہاں کے مکینوں کی سوچ سے ذرا ہٹ کر اس معاملے کو پرکھیں گی۔“ فواد انہیں ہموار کرتے ہوئے بولے۔

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ تم بات کرو۔۔۔۔۔ زیادہ سسپنس کری ایٹ مت کرو۔“

”پھپھو موضوع آریان کی ذات اور اس کا ماضی ہے۔ جس سے کچھ دن پہلے مجھے آگاہی ہوئی ہے میں چاہتا ہوں کہ آپ کو بھی ساری تفصیل بتا کر اس مسئلے کا حل تلاش کیا جائے جو اب درپیش ہے۔“ فواد کے منہ سے یہ بات سن کر پھپھو سیدھی ہو بیٹھیں۔ دوسرے لفظوں میں ہمہ تن گوش ہو گئیں۔

”آریان کے ماضی کے متعلق۔۔۔۔۔ بولو۔۔۔۔۔ میں سن رہی ہوں۔“

”پھپھو۔۔۔۔۔ آپ کو یاد ہوگا چند دن پہلے شام کے وقت آپ سب لان میں موجود تھے۔ جب میں آریان کے ساتھ بہت غیر مہذب انداز میں پیش آیا تھا۔ یقیناً آپ سب کو ہی بہت ناگوار لگا رہا ہوگا۔ یاد ہے ناں پھپھو! جب میں اسے گھسیٹ کر کمرے میں لے گیا تھا۔“

”ہوں۔۔۔۔۔ آگے بولو۔۔۔۔۔“

”اس دن میرا اپنے دوستوں سے جھگڑا نہیں ہوا تھا۔ بلکہ دو اجنبی میرے کھینک پر آئے تھے غنڈہ ٹائپ شخص تھے اور انہوں نے مجھے آکر بتایا کہ آریان ان کی ملکیت ہے اور اسے خاموشی سے ان کے حوالے کر دیا جائے۔ جب میں نے ان سے پوچھا کہ ان کا آریان سے کیا تعلق ہے تو ان بد معاشوں نے بتایا کہ آریان ایک طوائف زادی ہے اور کوٹھے سے بھاگی ہوئی ہے۔“ ایک پل کو رک کر انہوں نے ہینا پھپھو کے تاثرات دیکھے۔ وہ بہت دل جمعی سے ان کی بات سن رہی تھیں۔ پھر انہوں نے الف سے لے کر ی تک ساری تفصیل بتادی۔ آریان سے ہونے والی گفتگو کا حرف حرف کہہ ڈالا۔

”اب بتائیں پھپھو! کیا اسے گھر میں رکھنا چاہئے۔ یاد رکھئے دے کر گھر سے باہر نکال دینا چاہئے۔“

”کیسی باتیں کرتے ہو فواد۔۔۔۔۔ احقانہ باتیں مت کرو۔۔۔۔۔ وہ تو پہلے ہی بہت دکھی ہے۔ اس کی دل جوئی کرنے اور اس کے زخموں پر مرہم لگانے کی بجائے اسے مزید چرے کے لگانے کی بات کرتے ہو۔۔۔۔۔ وہ جو بھی تھی وہ اس کا ماضی تھا جس پر اس کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ اگر وہ اپنی مرضی سے اس گندگی میں رہنا پسند کرتی تو وہاں سے بھاگتی ہی کیوں۔ اب جبکہ وہ سادات نگر میں ہے اس کی جان اور اس کی عزت کی حفاظت ہماری ذمہ داری ہے سمجھے۔“ ہینا پھپھو کے لہجے میں آریان کے لیے تردست آیا۔ فواد کو اس پل اپنی پھپھو بہت پیاری لگیں حساس اور مثبت انداز فکر رکھنے والی۔

”بس یہی چاہتا تھا میں۔۔۔۔۔ اس کی مجبوری کو سمجھا جائے۔ اس وقت وہ اکیلی ہے تنہا ہے اس کا

ساتھ دینے والی اس کی ماں اس وقت ان خالوں کے چنگل میں ہے سو ہمارا فرض ہے کہ اس کی مدد کریں۔“

”بالکل۔ لیکن یہ کوئی مسئلہ تو نہیں۔ تم وہ مسئلہ بیان کرو جو اب درپیش ہے۔“

”اصل میں وہ لوگ آریان کا چچا کرتے ہوئے سادات نگر کی دہلیز تک پہنچ چکے ہیں۔ مجھ سے بات کرنے کے بعد وہ رکے نہیں بلکہ انہوں نے درپردہ آریان پر دباؤ ڈالنے کے لیے ٹیلی فونک رابطہ رکھا۔ بار بار اسے فون کر کے پریشان کر رہے ہیں کہ ہمارے ساتھ چلو ورنہ سادات نگر کی کسی بہو یا بیٹی کو ہم اٹھا کر لے جائیں گے۔ وہ بہت پریشان ہے۔“

”بات تو ہے پریشانی کی۔ اور صرف اس کے لیے ہی نہیں ہمارے لیے بھی۔“ ہینا پھپھو پڑ سوچ انداز میں بولیں۔

”اسی لیے تو آپ کے پاس آیا ہوں کہ اب کیا کیا جائے۔“

”میرا خیال ہے سب کو اعتماد میں لینا پڑے گا اماں بی سمیت۔“

”نہیں پھپھو۔ آپ کے سوا کسی کو بھی علم نہیں ہونا چاہئے۔“ فواد بھی مزید کچھ کہنا چاہتے تھے کہ دروازے میں سے ایقہ نے اندر جھانکا۔

”اندرا آجائیں۔“

”جب یہاں تک تشریف لے ہی آئی ہیں تو اندر بھی آجائیں۔“ فواد نے جل کر کہا۔ ”حد ہوتی ہے نافرمانی کی۔ کہہ کر بھی آیا تھا کہ وہاں کوئی نہ آئے اور سب کے سب منہ اٹھا کر آگئے تھے۔“ اب اپنی چونچیں ذرا بند رکھنا۔ فواد نے انہیں تنبیہ کی اور ایک بار پھر ہینا پھپھو کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ سب اندر آکر بیٹھ گئے تھے۔

”فہدی! جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ بالکل ناممکن ہے۔ گھر کے افراد سے کوئی بھی بات زیادہ دیر چھپی نہیں رہ سکتی۔ اور خود سوچو اماں بی جو اسے اتنا چاہتی ہیں جب انہیں یہ پتا چلے گا کہ ان سے کچھ چھپایا گیا ہے تو انہیں کتنا افسوس ہوگا۔ میرا خیال ہے بتا دینا بہتر ہے۔ دوسری صورت میں سب کی ناراضگی مول لینی پڑے گی۔“ ہینا پھپھو بالکل ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ بڑی اماں آریان کو بہت محبت سے پیش آتی تھیں۔ اور آریان ان کی محبت کو کسی صورت کھونا نہیں چاہتی تھی۔

”پھر۔“

”جو کچھ بھی کرنا ہے بہت سوچ سمجھ کر کرنا۔ میرا خیال ہے سب گھر والوں کی سپورٹ حاصل ہونے پر زیادہ بہتر نتیجہ برآمد ہوگا۔“

”پھپھو! میں اپنے طور پر ان لوگوں کو سبق سکھانا چاہتا ہوں۔“

”فہدی! حقانہ باتیں مت کرو۔ وہ لوگ مجرمانہ طور طریقے کے ہوں گے۔ ان سے یوں براہ

راست بھڑاتا آسان نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو۔“

”کیوں کیا وہ سلطان راہی کی روح سے ملاقات کر کے آئے ہیں۔“ شاذان کا منہ بند نہ رہ سکا۔

”شانی۔۔۔۔۔ فضول باتوں سے پرہیز کرو۔۔۔۔۔ موقع محل دیکھ کر بات کیا کرو۔“ روبہ نے اسے

گھورا۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ سب اس وقت آریان کے لیے پریشان تھے۔

”یہ مسئلہ اتنا سیدھا نہیں ہے۔ کتنی پیچیدگیاں ہو سکتی ہیں تم میں سے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ ہم

لوگ جو گھروں کی چار دیواری سے نکلے ہیں پھر بھی اپنوں کے حصار میں رہتے ہیں۔ مجرمانہ ذہنیت کے

لوگوں کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ ستارہ بیگم جیسی عورتیں ہاتھ آیا شکار اتنی آسانی سے نہیں جانی دیتیں۔

اور اس کے لیے کسی کی جان بھی لینی پڑ جائے تو وہ اس سے بھی نہیں چوکتیں۔ اس لیے میرا مشورہ یہی ہے کہ تم

میں سے عملی طور پر کوئی سامنے نہ آئے۔ میں اماں بی سے تفصیلی بات کروں گی۔ سب مل کر اس مسئلے کو حل

کرنے کی کوشش کریں گے۔“ ہینا پھپھو نے انہیں سمجھایا۔ وہ سب خاموشی سے ان کی باتیں سن رہے تھے۔

”اور آریان! تم پریشان مت ہونا۔ میرے لیے جیسی ایقہ اور روبہ ہیں اسی طرح تم بھی ہو۔

کسی کی جرات نہیں کہ وہ میری بیٹی کو کوئی معمولی سی تکلیف پہنچا سکتے۔ سادات نگر بزدل لوگوں کی جاء

نہیں۔ تمہاری طرف اٹھنے والی میلی آنکھ نکالنے کی جرات ہے ہم میں۔“ ہینا پھپھو کا مستحکم لہجہ آریان

کی ٹپکیں بھگو گیا۔

کسی نے سچ کہا ہے کہ عورت جب ماں بن جاتی ہے تو دنیا بھر کے بچوں کو وہ اپنی اولاد سمجھنے لگتی

ہے۔ اس کی متا کسی سمندر کی طرح وسیع ہوتی ہے۔ جتنی محبت بانٹتی ہے اس سے کہیں زیادہ محبت

اور پیدا ہو جاتی ہے۔ ہینا پھپھو بھی سراپا ماں تھیں۔ ہر ایک کے لیے اور آریان جیسی حرماں نصیب لڑکی

کے لیے بھی۔ فواد ان سے بات کر کے مطمئن ہو گئے تھے۔ اور آریان بھی۔

اگلے دن ہینا پھپھو نے اماں بی سے تفصیلی بات کی اور موقع کے مین مطابق ان کے دل میں

آریان کے لیے جو محبت تھی وہ جوں کی توں رہی بلکہ اس کے درد اس کے دکھن کر اور بڑھ گئی تھی۔ انہوں

نے سب خواتین کو اپنے پاس بلایا سوائے حدیقہ کے۔ کیونکہ وہ دوسروں کے دکھوں سے حکا اٹھانے

والوں میں سے تھیں۔ اور ان سے آریان کے متعلق ہر بات کہہ کر انہیں یہ بھی کہا کہ جلد سے جلد اپنے

شہرہ کو اس مسئلے پر رام کرنے کی کوشش کریں تاکہ اس بے سہارا لڑکی کو مشکل سے نکالا جاسکے۔ سب

خواتین نے موقع دیکھ کر شوہروں سے بات کر لی اور سب ہی آریان کی حمایت میں نظر آ رہے تھے۔

حدیقہ اور شا کر چونکہ اس گھر کے کسی مسئلے میں شامل نہیں ہوتے تھے۔ اس لیے انہیں اب بھی اس معاملے

سے دور ہی رکھا گیا تھا۔ بڑی اماں سمیت گھر کے سب مرد و خواتین آریان کے حق میں تھے سوائے

عرب تایا کے۔ ان کو ہینا پھپھو کچھ نہیں بتانا چاہتی تھیں۔ لیکن اماں بی نے کہا کہ اسے اعتماد میں لے

لو۔ یہ نہ ہو کچھ عرصہ بعد اسے کہیں سے بھٹک پڑ جائے اور تمہاری جان کے لیے مصیبت بن جائے۔ پہلے ہی تمہاری زندگی بہت تنگ ہے اور پھر زیادہ تنگ ہو جائے گی۔ سوانہوں نے ایک دن جب عارب تایا کا موڈ کچھ بہتر تھا جو کہ شاذ و نادر ہی ہوتا تھا۔ آریان کی بات چھیڑ دی لیکن جو شدید رد عمل عارب تایا کی طرف سے دیکھنے میں آیا۔ دینا پھپھو پریشان ہو گئیں۔



مہندی رچے گورے گورے پاؤں اچھٹے سانسے تھے کمرے میں نیم تاریکی تھی شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے بالکل اس کی زلفوں کی طرح۔ غلام عباس نے سانسے مچلیں بستر پر محو خواب وجود کو دیکھا۔ کس قدر حسن سمیٹ رکھا تھا اس بے خبر وجود نے۔ یوں لگتا تھا کائنات ہی سمٹ کر مجسم ہو کر سانسے آگئی ہو۔ لمبی لمبی گہری آنکھیں جن پر سیاہ چٹکوں کا چھنار سا یہ فلک رہتا تھا اور اس وقت بھی سرخی مائل گورے گالوں پر وہ چٹکیں اپنا سایہ کیے ہوئے تھیں۔ نیم دگلا بی شکر فی ہونٹ جیسے کوئی گیت گانے کو چل رہے تھے۔ اس گھر میں بے شمار کمرے تھے لیکن غلام عباس کو یہی لگتا تھا کہ زندگی بس اسی کمرے میں مقید ہے۔ جانے کیوں اس کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی سانسیں ہل ہو جاتی تھیں۔ سینے میں سلگتی ارمانوں کی چٹا پر جیسے شبنم کی خندک اترنے لگتی تھی۔ اس نے ہاتھوں میں پکڑے موچے کے ڈھیروں پھولوں کو ایک نظر دیکھا پھر وہ بے قدموں آگے بڑھ کر اس نے وہ سارے پھول ان گورے گورے چہروں پر ڈھیر کر دیے یوں جیسے کوئی داس دیوی کے چہروں میں کچھ دان کر رہا ہو۔ نرم گدرائے ہوئے چہروں کو شاید نرم نرم پھولوں کا بھل سانس ناگوار گزارا تھا وہ کچھ کسمسائے اور پھر جیسے ساری کائنات ہی متحرک ہو گئی۔ محو خواب وجود ایک تو بہ شکن انگڑائی لے کر بیدار ہو چکا تھا۔ سیاہ گھوڑا آنکھیں نیند کے شمار سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ غلام عباس نے نگاہیں چرائیں۔

”کیا وقت ہو گیا غلام عباس کیا روشنیاں جل اٹھی ہیں؟“ دھیمی سی آواز غلام عباس کے کانوں سے ٹکرائی۔

”جی بی بی۔۔۔۔۔“ غلام عباس کا چہرہ تھکا ہوا تھا اور نگاہیں زمین میں گڑی ہوئی تھیں جانے کیا بات تھی وہ ان آنکھوں میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ پورے دن میں اس کے لیے وہ لمبے بے حد قیمتی اور مقدس ہوتے تھے۔ جب وہ اس کمرے میں پھول لے کر آتا تھا۔

”غلام عباس! تم سے کتنی بار کہا ہے ہمارے پاؤں اس قابل نہیں جن پر تم یہ پھول نچاؤ کرو۔ ایسا کر کے تم ان کی پاکیزگی کو بھی مجروح کرتے ہو اور میری ذات میری روح کے رُخموں پر سے کھرٹ اترنے لگتے ہیں۔ پاکیزگی، پارسائی، پاک دامنی، محبت ان لفظوں سے نا آشنا ہو چکی ہوں۔ ان پھولوں کی نرمی سے میرے رُخموں کا مداوا ممکن نہیں۔“ درد جب لفظوں میں در آتا ہے تو سننے والے کی

سماعت کو بھی زخمی کر دیتا ہے۔ غلام عباس نے تڑپ کر اس کی جانب دیکھا۔

”ایسا مت کہیں بی بی! آپ کیا جانیں آپ کیا ہیں۔ میں نے پہلے بھی آپ سے کہا ہے کہ مجھے مت روکا کریں۔ اپنی زندگی پر میرا کوئی اختیار نہیں۔ میں نے کبھی اختیار کی تمنا بھی نہیں کی۔ بس چند لمبے مجھے عطا کر دیں غلام عباس کسی سے کچھ نہیں مانگتا نہ ہی آپ سے کسی چیز کا طلب گار ہے۔ بس ایک خواہش ایک آرزو ہے اس کو پورا کرنے دیں۔“ غلام عباس کی آنکھیں اب بھی جھکی ہوئی تھیں۔ چاندنی کی آنکھیں اس کے چہرے پر تنگ گئیں۔ جس جگہ چہروں کی پہچان مشکل ہو جائے کون کیا ہے۔ کیسا ہے؟ سمجھ ہی میں نہ آئے وہاں ایسا بے ریا شخص کیا جی پائے گا۔

”آج ایک بات پوچھیں غلام عباس۔ کیا تاؤ گے؟“

”پوچھیں بی بی۔۔۔“

”تم روزانہ میرے لیے پھول کیوں لے کر آتے ہو؟“

”پتا نہیں کیا بات ہے بی بی! لیکن آپ کو آواز دے کر جگانا مجھے اچھا نہیں لگتا اور چھوٹا اس لیے نہیں کہ میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا۔ آپ کی پاکیزگی مانع ہوتی ہے۔ اس لیے۔۔۔ اس لیے آپ کو جگانے کا مجھے یہی طریقہ سمجھ آیا۔“ غلام عباس کا لہجہ بہت دھیمّا تھا اور چاندنی جیسے اس کی محبت کے اس انداز پر کانپ اٹھی تھی۔ اس کا زخم زخم وجود بھلا محبت کے اس انداز کا کہاں تحمل ہو سکتا تھا۔ اس کی چٹکیں لرزنے لگیں۔ گرم گرم آنسو اس کی آنکھوں کے کناروں پر ٹھہر گئے۔ اپنے پھلے ہوئے گھنیرے بالوں کو سمیٹ کر اس نے جوڑے کی شکل دی اور بہت خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ غلام عباس دیر تو اس کے بولنے کے انتظار میں کھڑا رہا اور جب وہ کچھ نہ بولی تو وہ بھی نہایت خاموشی سے کمرے سے نکل گیا۔ سامنے کرسی پر اس کا باسی گجرے اور دیگر ستھار کی چیزیں رکھی تھیں۔ باہر کا ماحول اپنے آپ میں آنے لگا تھا۔ روشنیوں کے ہوتے ہی دھیمے دھیمے ساز دھیرہروں کی طرح اٹھنے لگے تھے۔

”مجھبتیں پانے کا جو طریقہ تم نے چنا تھا نا۔۔۔۔۔ آخر اس کا انجام یہی ہے۔ کیا بغاوت کبھی اس بھی آئی ہے۔ باغی کی سزا موت ہے اور تم۔۔۔۔۔ تم خود دیکھ لو۔ ہرگز رتے دن اور رات میں کتنی بار مرتی ہو تم۔ کیا جینا اس کو کہتے ہیں؟“

کچھ دھندلے عکس اس کی آنکھوں کے سامنے آرہے تھے۔ اس کے کچھ اپنے بھی تو تھے جن کو وہ کھو چکی تھی اور جب کچھ کھو جاتا ہے تو اتنی بڑی کائنات میں اس کو تلاش کرنا کہاں ممکن ہوتا ہے اور اب۔۔۔۔۔ اب یہ غلام عباس۔۔۔۔۔ یہ ایک بار پھر اس کے راستوں کے کانٹے چھنے نکل کھڑا ہوا ہے یہ جانے بغیر کے وہ کانٹے جن نہیں سکے گا ہاں محبت کے خارزار میں ٹھہرتے کراسے مزید زخمی ضرور کر دے گا۔



کے تقریباً تمام فردا ماں بی کے کمرے میں جمع ہو گئے۔

”میرا خیال ہے کہ جس کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے۔ اسے بھی بلایا جائے۔“ اماں بی سہرے ہوئے لہجے میں بولیں۔ اور عینا پھپھو جا کر آریان کو اپنے ہمراہ لے آئیں۔ آریان کو اماں بی نے اپنے قریب بٹھالیا اور طائرانہ نظر کمرے میں موجود افراد پر ڈالی۔ سب ہی خاموش اپنی اپنی جگہ سوچوں میں گم بیٹھے تھے۔

”میں ایک بہت اہم موضوع پر بات کرنا چاہتی ہوں لیکن اس سے پہلے یہ جاننا چاہوں گی کہ سادات نگر کے کمینوں کے لیے میرے کہے کی کتنی اہمیت ہے۔“

”اماں بی! یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ آج بھی اور آنے والے کل کو بھی اس گھر کے ہر فیصلے پر آپ کی مہر تصدیق ثبت ہونی ہے۔ ابامیاں نہیں ہیں تو کیا ہوا۔۔۔۔۔ ہمارے نزدیک آپ کا کہا ہوا بھی اتنا ہی محترم اور معتبر ہے جتنا کہ ان کا تھا۔“ انظر چچا سلیقے سے بولے۔ اماں بی طمانیت بھرے انداز میں مسکرائیں۔

”تو بس ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ آریان بیٹی کے بارے میں پچھلے کچھ دنوں کے دوران ہونے والے انکشاف کے بارے میں سب جان ہی چکے ہوں گے۔ میں نے آپ سب کو اس لیے بلایا ہے تاکہ اپنے فیصلے سے آگاہ کر سکوں کہ آریان اب اسی گھر میں رہے گی۔ بیٹھ، روپیہ، مہوش اور انا کی طرح۔۔۔۔۔ آپ میں سے کسی کو کوئی اعتراض تو نہیں۔۔۔۔۔“ انہوں نے بات ختم کرتے ہوئے عین نظروں سے سب کے چہروں کے تاثرات دیکھے سوائے عارب شاہ کے سب نارمل انداز میں بیٹھے ہوئے تھے۔

”ہمیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے اماں بی! جب آپ نے فیصلہ کر لیا ہے تو پھر آپ کو کسی کی رائے لینے کی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔“ باہر چچا بھی اماں بی کے حمایتیوں میں شامل ہو گئے۔

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے باہر۔ ایک بیٹی کے باپ ہو کر سمجھ نہیں سکتے کہ اس جیسی لڑکی ہمارے گھر میں رہے گی تو ہماری بچیوں پر کیسے اثرات مرتب ہوں گے۔“ عارب شاہ چپچپے ہوئے لہجے میں بولے۔

”اس جیسی سے تمہاری کیا مراد ہے عارب؟“ اماں بی کا لہجہ بے چلک تھا۔

”کیا اب سادات نگر کے کمین اپنے مقام سے اس حد تک گر چکے ہیں کہ انہیں سید گھرانوں اور کٹھنوں کا درمیانی فرق ہی نظر نہیں آ سکتا۔“

”بھائی! یہاں آپ زیادتی کر رہے ہیں۔ اس بچی کو ہمارے درمیان رکھتے بہت دن گزر چکے ہیں۔ ایسی کون سی قابل اعتراض بات دیکھی آپ نے اس میں۔۔۔۔۔ جس کی وجہ سے اس کا یہاں رہنا ہمارے گھر کے ماحول کو خراب کر دے۔“ انظر شاہ عارب تایا کی بات سن کر تحمل لہجے میں بولے۔ حقیقتاً

صبح کا وقت تھا۔ سادات نگر کی چہل پہل حسب معمول تھی۔ بچے سہرے ہی سکولوں کو جا چکے تھے۔ فواد کو ایرجنسی ٹیلی فون آیا تھا سو وہ بھی کھینک جا چکے تھے۔ بیٹھ کے پیچڑ ہونے والے تھے۔ اس لیے وہ کالج جانے کی بجائے گھر پر ہی تیاری کر رہی تھی۔ رات گئے تک پڑھنے کی وجہ سے وہ ابھی سوئی ہوئی تھی۔ روپیہ اور آریان سکول جانے کی تیاری کر رہی تھیں کہ انہیں عینا پھپھو والے کمرے سے بلند آواز میں سنائی دیں۔ روپیہ تیزی سے آگے بڑھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ چپا کسی بات پر اس کی ماما کو ڈانٹ رہے ہیں۔ عینا پھپھو کی آواز نہیں آرہی تھی۔ عارب تایا ہی دھاڑے جا رہے تھے۔ پھر اس نے دیکھا۔ کسی طوفان کی طرح وہ اپنے کمرے سے نکلے اور اماں بی کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ اماں بی چاشت کی نماز سے فارغ ہو کر تسبیح کرنے میں مصروف تھیں۔ جب وہ اندر داخل ہوئے۔۔۔۔۔ ان کے خطرناک تیور اماں بی کو پہلی نظر میں ہی دکھائی دے گئے۔

”اماں بی۔۔۔۔۔ کیا ہو رہا ہے اس گھر میں۔ کیا سن رہا ہوں میں۔“ اتنے ہی بلا تہید انہوں نے قدرے سخت لہجے میں اماں بی کو مخاطب کیا۔

”عارب بیٹا۔۔۔۔۔ سکون سے بیٹھ کر بات کرو۔ جو بھی کرنی ہے۔ کیا سن لیا تم نے۔۔۔۔۔؟“ اماں بی کا سکون قابل دید تھا۔

”ایک طوائف زادی اس گھر میں کس لیے رہ رہی ہے۔۔۔۔۔ اماں بی کیا اچے کے اصول ختم ہو چکے ہیں۔ مریچی ہیں سادات نگر کی روایات۔۔۔۔۔“ عارب شاہ سخت برا فروخت تھے۔

”عارب پہلے اپنے لہجے کو درست کر دو کہ کس سے مخاطب ہو۔۔۔۔۔ یہ مسئلہ اٹھے گا میں جانتی تھی۔۔۔۔۔ اسی لیے میں نے سب کو بلایا ہے۔ اگر انتظار کر سکتے ہو تو چند لمحوں انتظار کر لو۔۔۔۔۔ ہر بات واضح ہو جائے گی۔“ اماں بی انہیں جواب دینے کے بعد دوبارہ اپنی ادھوری تسبیح کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ عارب شاہ سچ و تاب کھا رہے تھے لیکن جانے کس مصلحت کے تحت خاموش ہو گئے۔ پھر کچھ ہی دیر میں گھر

”لیکن پتا بھی تو چلے کہ آخر وہ کہتا کیا ہے۔۔۔۔۔ کس بات پر وہ اتنے غصے میں آ گیا وہ تو بہت خاموش اور کٹھنی سنا کی شخصیت کا مالک ہے۔“

”اللہ جانے! صبح سے کہے جا رہا ہے مجھے جانے دو۔۔۔۔۔ میں نے جانا ہے۔۔۔۔۔ میں آ رہا ہوں۔ میں جاؤں گا۔ میں آؤں گا۔ خدا جانے کون سے سارے کی مخلوق اٹھا کر لے آئے ہو کون سی بولی بولتا ہے میری تو عقل سے باہر ہے۔“ کاشف جل بھن کر بولا۔

”چلو میرے ساتھ جا کر دیکھتے ہیں۔۔۔۔۔“

”نہ بابا۔۔۔۔۔ تم جاؤ۔ مجھے اپنی زندگی فی الحال بہت پیاری ہے۔ ہائے میری فریال تمہاری محبت میں یہ ڈاکٹری جیسا منحوس پیشہ جان کو چٹ گیا۔“ وہ آہ بھر کر اپنی اکلوتی مہکیت کو یاد کرنے لگا جس کی خواہش پر اس نے میڈیکل جوائن کیا تھا۔

”تم کبھی سدھر نہیں سکتے۔“ فواد نبیل پر سے اسٹیتھی سکوپ اٹھا کر وارڈ کا راونڈ لینے چلے گئے۔ نذیر اور اکبر نے اسے بری طرح جکڑ رکھا تھا اور نرس سلی اس کے بازو میں انجکشن لگانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس کی مسلسل مومنٹ کی وجہ سے وہ اس میں ناکام ہو رہی تھی۔

”کیا ہو رہا ہے۔۔۔۔۔ یہ کیا طریقہ ہے؟“ فواد گرج کر بولے۔ نذیر اور اکبر نے گھبرا کر مریض کے بازو چھوڑ دیئے۔

”جس روئے سے بچانے کی خاطر میں نے اسے یہاں ایڈمٹ کیا ہے تم لوگ وی سلوک اس کے ساتھ روادار کھو گے تو کیا فرق پڑے گا اس کی شخصیت پر۔۔۔۔۔ احمق کہیں کے۔“ آخری لفظ فواد نے خود کلامی کے سے انداز میں کہے۔

”سرجی! اس کی دوائی اور ٹیکے کا نام ہو گیا ہے۔“ سلی نے کہا۔

”لیکن دوا سے پہلے اسے کچھ کھانے کو دو۔۔۔۔۔“

”پر سراسر یہ کچھ کھاتا بھی تو نہیں۔۔۔۔۔ یہ دیکھیں صبح اس نے کیا حال کر دیا میرا۔“ نذیر نے اپنا گال آگے کر کے دکھایا۔

”ہاں سن چکا ہوں۔۔۔۔۔ بہر حال تم جاؤ کچھ لے کر آؤ کھانے کو میں کوشش کرتا ہوں۔“ فواد کہہ کر بہت آرام سے اس کے قریب بیٹھ گیا۔

”بابا۔۔۔۔۔“ بہت ملاحت سے اسے پکارا۔ تو وہ جیسے چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔

پتا نہیں ان کے سامنے وہ اس قدر سلجھا ہوا کیوں بن جاتا تھا۔ وہ آج تک یہ سمجھ نہیں پائے تھے کہ ان کے سامنے تو کبھی اس نے کوئی اوٹ پٹائی حرکت نہیں کی تھی۔

”دیکھو۔۔۔۔۔ مجھے جانے دو۔۔۔۔۔ میں نے جانا ہے۔ میں آ رہا ہوں۔ میں جاؤں گا۔ میں

کیلنک میں داخل ہوتے ہی فواد کو کچھ غیر معمولی محسوس ہوا۔ آفس میں سر پکڑے بیٹھا کاشف، اپنے سامنے پڑے پانی کے ادھ بھرے گلاس کو یوں گھور رہا تھا جیسے پتا نریم کی مشق کر رہا ہو۔

”جہیں کیا ہوا ہے۔۔۔۔۔“ فواد نے اس کا کندھا ہلایا۔

”یہی تو افسوس ہے کہ ابھی تک کچھ ہوا کیوں نہیں۔۔۔۔۔“ وہ تو جیسے جلا بیٹھا تھا۔

”یہ بھلا کیا بات ہوئی۔“ فواد مسکراتے ہوئے اس کے سامنے والی چیئر پر بیٹھ گئے۔

”تم سے اگر اپنا مریض نہیں سنبھالا جاتا تو کوئی بچہ منگوا دو جس میں طوطے کی طرح بند کر دیں اسے حد ہوگئی۔ کیلنک کو پاگل خانہ بنا کر رکھ دیا ہے۔“

”یار بے ضرر سا شخص ہے وہ۔ کیا کہہ دیا اس نے جہیں؟“

”ابھی کچھ نہیں کہا مگر کہہ بھی سکتا ہے۔ صبح اکبر بھاگا بھاگا میرے پاس آیا کہ وہ مریض گیٹ سے باہر جانے کی کوشش کر رہا ہے۔ نذیر کیا ڈنڈا اور وارڈ بوائے نے بڑی مشکل سے قابو میں کیا ہوا تھا۔ اتنی مشکل سے کنٹرول کر کے اسے وارڈ میں لائے اور بیروں میں سنگل ڈال کر بیڈ کے ساتھ باندھ دیا پھر ناشتہ کرانے کی کوشش کی تو نواب صاحب نے گلاس اٹھا دھر شیخ دیا۔ چائے کا کپ اکبر کے بیروں پر دے مارا۔ وہ جلے بیروں کی مٹی کی طرح پورے وارڈ میں اچھلنے لگ گیا۔ نرے اٹھا کر نذیر کے منہ پر دے ماری۔ کمال پھاڑ ڈالا اس کا تین چار ٹانگے لگانے پڑے۔“ کاشف نے داستان الم ایک ہی سانس میں کہہ سنائی۔

”یار! اتنا تو معصوم شخص ہے وہ۔۔۔۔۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ سب اس نے کیا ہوگا۔“

”تو پھر ٹھیک ہے جہیں اگر یہ معصوم شخص بہت پیارا ہے ناں تو رہا اپنے اس کیلنک کم پاگل خانے میں اس کے ساتھ۔۔۔۔۔ مجھے تو چھٹی دو۔ میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔ کل کلاں کو میرا سر پھاڑ ڈالے یا مجھ پر حملہ کر دے تو میرے تو سارے ارمان خاک میں مل گئے ناں۔“ کاشف اپنے مخصوص انداز میں بولا۔

اؤں گا۔" بے ربط لفظ اس کے منہ سے نکل رہے تھے۔

"بابا! کہاں جاتا ہے آپ کو۔" فواد نے اسی طرح نرم لہجے میں کہا۔ نذیر کپاؤ نظر آتی دیر میں ڈبل روٹی کے دو تین چم اور دودھ کے ایک گلاس پر مشتمل ناشتہ لے آیا۔

"میں۔۔۔ مجھے جانا ہے۔۔۔ میں جاؤں گا۔" اس کی جیسے ایک ہی رٹ تھی۔

"چلیں ٹھیک ہے آپ نے جہاں جانا ہے میں لے چلوں گا آپ کو۔۔۔ لیکن پہلے کچھ کھالیں۔"

"لے چلوں گے۔" اس کے لہجے میں شک تھا۔

"ہاں لے چلوں گا۔"

"تم۔۔۔ لے چلوں گے۔"

"ہاں بابا!۔۔۔ جہاں کہیں گے لے چلوں گا لیکن پہلے آپ کو یہ کھانا کھانا ہوگا پھر دوا لینی ہوگی۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔" وہ رضامند ہو گیا تھا۔ فواد نے ڈبل روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے دودھ میں بھگو کر اسے کھانے شروع کر دیے۔ نرس سٹوڈنٹ، نذیر اور اکبر ہونق بنے دیکھ رہے تھے۔ آج سے پہلے انہوں نے کسی ڈاکٹر کو اپنے مریض کے ساتھ اس قدر ان گنج نہیں دیکھا تھا۔ فواد خود بھی بہت ریز رو تھے لیکن انہوں نے جس سچے یٹھن اور حالات میں اس کو دیکھا تھا وہ سمجھتے تھے کہ وہ ان کی خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ سو ایک لحاظ سے انہیں اس سے قلبی لگاؤ سا محسوس ہوتا تھا۔

وہ بہت توجہ کے ساتھ بغیر مزاحمت کیے کھانا کھاتا رہا۔ پھر گلاس میں باقی بچا ہوا دودھ پی لینے کے بعد اس نے ارد گرد ایک نظر ڈالا۔

"اب۔۔۔ اب مجھے جانا ہے۔۔۔ مجھے لے چلو۔"

"نہیں بابا! اب کچھ دیر آرام کریں۔۔۔ آپ تھک گئے ہوں گے۔" فواد کا انداز نالہ والا تھا۔

"آرام کروں۔۔۔" وہ تیز لہجے میں بولا۔ "میں نے کہا۔۔۔ مجھے جانا ہے۔۔۔ میں جاؤں گا۔۔۔ مجھے جانے دو۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا گلاس خائیں کی آواز سے سامنے دیوار پر دے مارا۔ فواد نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑنے کی کوشش کی۔

"تم۔۔۔ تم نے جھوٹ بولا۔۔۔ تم نے کہا لے چلوں گے۔" وہ چلانے لگا۔

دارڈ میں موجود دوسرے مریض سر اٹھا اٹھا کر دیکھ رہے تھے۔

"بابا!۔۔۔ میں نے انکار تو نہیں کیا۔ میں لے چلوں گا آپ کو۔" فواد آگے بڑھے لیکن اس نے

ان کے سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر ایسا بھرپور دھکا دیا کہ وہ گرتے گرتے بچے۔ پہلی بار اس کی جنونی کیفیت ان کے سامنے آئی تھی۔

"جھوٹ۔۔۔ تم سب جھوٹے ہو۔۔۔ تم نہیں لے کر جاؤں گے میں نے جانا ہے۔" وہ اپنے آپ کو

زنجیروں سے آزاد کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ فواد سے یونہی چھوڑ کر آفس میں آ گئے۔

"کاشف۔۔۔ ہی ازرنٹلی آسیریس کیس۔۔۔" فواد جھکے ہوئے لہجے میں بولے اور کرسی پر سر تھام کر بیٹھ گئے۔

"نہیں میرے بھائی وہ تو بے چارہ بے ضرر اور معصوم سا شخص ہے۔" کاشف نے لطیف سے طنز یہ لہجے میں کہا۔

"محترمہ! اس سے پہلے میں نے اس کی ایسی کیفیت نہیں دیکھی۔ کیا اسے اسی طرح کے دورے پہلے بھی پڑتے رہے ہیں۔" فواد نے پوچھا۔

"نہیں پہلے ان دوروں کی شدت بہت کم ہوتی تھی۔ اب تو بہت شدید ہیں۔ اس کے اس طرح ہسٹریائی انداز میں چیخنے اور چلانے کا وارڈ کے دوسرے مریضوں پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔" کاشف نے کہا۔

"یہ تو ہے۔۔۔ پھر تمہارے خیال میں کیا ہونا چاہئے۔"

"میرا خیال ہے اس کو اوپر کے کمرے میں شفٹ کر دو۔" کاشف نے ہر خیال انداز میں کہا۔

"نہیں۔۔۔ یہ خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ ملازمین کی ذرا سی غفلت سے اس کی جان بھی جا سکتی ہے کیونکہ اس کے آج کے بی یونیورسٹی سے یہ اندازہ ہو چکا ہے مجھے کہ وہ میٹھی اپ سیٹ ہے اور ایسے لوگ کسی وقت بھی کچھ کر سکتے ہیں جو ان کے لیے یا کسی دوسرے کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔" فواد نے کاشف کی تجویز رد کر دی۔ اسی وقت باہر شاہ نے آفس میں قدم رکھا۔ فواد ان کو دیکھ کر حیران سے ہو گئے۔ کاشف نے آگے بڑھ کر ان سے مصافحہ کیا۔

"ابو! آپ۔۔۔ خیریت تو ہے ناں۔۔۔؟" انہوں نے پوچھا باہر شاہ بہت کم ان کے کلیک آتے تھے۔

"ہاں خیریت ہی ہے۔ گھر سے کسی کام نکلا تو اماں بی نے اپنی دواؤں کی پرسکریپشن تھما دی۔ یہیں قریب ہی ہاشمی بلڈرز ہیں ناں۔ وہیں کام تھا مجھے تو سوچا جاتے ہوئے پرچی تھمیں دے جاؤں۔ گھر واپسی پر یاد سے لیتے آتا۔" انہوں نے جیب سے کانڈ نکال کر نمیل پر رکھا۔ کاشف آفس سے کسی کام کا بہانہ کر کے نکل گیا تھا کہ ممکن ہے باپ بیٹے کو کوئی ضروری بات کرنا ہو۔

"ابو! آئی تھنک بات کچھ اور ہے۔" فواد نے باہر شاہ کے چہرے پر چھائے سکوت اور لہجے کی سنجیدگی سے اخذ کیا تھا۔ مگر نہ باہر شاہ اتنے چھوٹے سے کام کے لیے ان کے کلیک پر بھی نہ آتے کہ دوائیاں تو میڈیکل سٹور سے مل جاتی ہیں۔ فواد کی بات سن کر ایک ٹانجے کو باہر شاہ نے ان کے چہرے کو دیکھا۔

اولاد جب کندھے سے کندھا ملا کر چلنے لگ جائے۔ ماں باپ کے لیے کس قدر مشکل ہو جاتا ہے اپنا آپ چھپانا۔

”ہوں۔۔۔ فہدی! تم نے اپنی ہینا پھپھو سے کوئی بات کی تھی؟“ انہوں نے فواد سے پوچھا۔
”کس سلسلے میں۔۔۔“ فواد سیدھے ہو بیٹھے۔ یعنی ان کا خیال درست تھا کہ کچھ نہ کچھ ہوا ہے اب کیا ہوا ہے یہ تو بابر شاہ ہی بتا سکتے تھے۔
”آریان سے متعلق۔۔۔“

”جی ہاں۔۔۔ کی تھی۔۔۔ گھر میں اس مسئلے پر کوئی بات ہوئی ہے۔“ انہوں نے پوچھا۔
”ہاں ہینا نے اماں بی سے بات کی اور بعد میں اماں بی نے گھر کی خواتین کے ذریعے بات ہم تک پہنچائی۔ باقی سب تو ٹھیک ہی تھے بس عارب بھائی نے بہت ہنگامہ کیا۔۔۔“
”لیکن کس بات پر۔۔۔“ فواد کوفت بھرے لہجے میں بولے۔ اسے عارب بتایا اپنی انہی عادات کی وجہ سے کچھ خاص پسند نہیں تھے۔ کبھی کبھی تو ہینا پھپھو کے لیے ان کا دل بہت دکھتا تھا کس قدر تائس خاتون اور عارب بتایا جیسے شخص کے ساتھ زندگی کے اتنے سال کس طرح گزارے ہوں گے انہوں نے۔

”یہی بات ایٹو بنا رکھی تھی کہ آریان کا بیک گراؤ ٹھیک نہیں۔ اب تک آریان انہی کے پاس تھی لیکن ان کے اس طرح ہنگامہ کرنے کے بعد میں آریان کو اپنے پورشن میں لے آیا ہوں۔۔۔ تم پریشان نہیں ہونا۔ آریان کے مسئلے میں تم اکیلے نہیں ہو۔۔۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔۔۔ اس بچی کی عزت اور زندگی بچانے کے لیے جو بھی مجھ سے بن پڑے گا میں کروں گا۔“ بابر شاہ نے فواد کو اپنے ساتھ کا یقین دلایا تو وہ جیسے خود کو ہلکا پھلکا تصور کرنے لگے۔

”تھینک یو۔۔۔ تھینک یو دیری۔۔۔ میں سچ سچ خود کو اکیلا محسوس کر رہا تھا۔“

”پگے! ماں باپ کس لیے ہوتے ہیں۔ برفیلہ اپنی ذات پر سہ جاتے ہیں اولاد کی خوشی کی خاطر۔ آریان کو میں اپنی جینی بنا چکا ہوں۔ اس لیے اب اس کی حفاظت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ بہر حال ابھی تو میں تمہیں لینے آیا تھا کہ میرے ساتھ ایس۔ پی کے آفس چلو۔۔۔ پولیس کو پہلی فرصت میں اعتماد میں لینا ہمارے لیے زیادہ سودمند ثابت ہوگا۔ پہلے ان بد معاشوں کا تو معاملہ نمٹائیں۔ جو آئے روز پریشان کر رہے ہیں۔ ستارہ بیگم کے بارے میں بعد میں سوچیں گے۔“ بابر شاہ یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”ابو! میرا خیال ہے کہ آپ خود ایس۔ پی سے مل لیں۔۔۔ آپ کا دوست ہے۔۔۔ آپ زیادہ بہتر طور پر اس سے بات چیت کر سکیں گے۔ میرا ذہن اس وقت آپ سیٹ ہے۔“

”اویار۔۔۔ کیوں آپ سیٹ ہے؟ کوئی وجہ بھی تو ہو۔۔۔“ بابر شاہ نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ اسی پہلے کاشف نذیر کے ہمراہ اندر داخل ہوا۔ اس نے بابر شاہ اور فواد کے مکالمے کا آخری حصہ سن لیا۔
”وجہ بہت معقول ہے جناب! ان کے کلینک پر ایک وی۔ آئی۔ پی مریض تشریف فرما ہیں۔ سو ان کا آپ سیٹ ہونا لازمی ہے۔“

”کیا مطلب؟ کیا کسی بڑے گھر سے تعلق رکھتا ہے وہ۔۔۔“ بابر شاہ دلچسپی سے بولے۔
”جی نہیں۔۔۔ موصوف نے انہیں مڑک پر بچوں سے پتھر کھاتے دیکھا تو پکڑ کر کلینک لے آئے۔۔۔ بس تب سے انہوں نے جو سلوک ہمارے ساتھ اور ہمارے مریضوں کے ساتھ روا رکھا ہوا ہے الامان الحفیظ۔۔۔“ کاشف ایک سی لے میں بولے جا رہا تھا۔

”بند بھی کر دو اپنی بکواس۔۔۔ ابوالیسی کوئی بات نہیں۔ اصل میں میں ایک ایکسپیریمینٹ کر رہا ہوں اس پر۔۔۔“ فواد نے کہا۔

”تم تو ایکسپیریمینٹ کر رہے ہو اور اس نے جونڈیر اور اکبر کے اوپر کیا تھا وہ کیا تھا؟“

کاشف کی بات سن کر بابر شاہ کی توجہ نذیر کے بینڈج والے گال پر پڑ گئی۔
”اسے کیا ہوا۔۔۔؟“

”یہ ڈاکٹر فواد کی لیبارٹری کے مسئلے کا شکار ہوئے ہیں۔“

”میں سمجھا نہیں۔۔۔“ بابر شاہ کی توجہ اپنی پریشانی سے وقتی طور پر ہٹ گئی۔

”جن پر ہمارے ڈاکٹر صاحب تجربہ کر رہے ہیں۔ اپنے نذیر صاحب انہی کے تجربے کا شکار ہوئے ہیں۔“

”فواد! یہ تو بہت خطرناک بات ہے۔ تم نے ایسے مریض کو اپنے کلینک میں کس لیے رکھا ہوا ہے۔ یہ سینٹرل ہسپتال تو نہیں۔“

”ابو! وہ عام حالات میں داخل رہتا ہے کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے۔“

”بہر حال اسے یہاں سے شفٹ کر دو۔۔۔ جس طرح اس نے اسے زخمی کیا۔ کسی اور کو بھی کر سکتا ہے بلکہ دورے کی حالت میں ایسے لوگ قتل تک کر دیتے ہیں اور انہیں پتا نہیں چلتا۔“ بابر شاہ نے کہا۔

”مجھے جانے دو۔۔۔ میں نے جانا ہے۔۔۔ چھوڑو مجھے۔۔۔ میں آؤں گا۔ میں جاؤں گا۔“ آفس کے ساتھ والے کمرے سے اچانک بہت اونچی آواز بلند ہوئی۔

”چلیے جناب، ریڈیو پھر آن ہو گیا۔“ کاشف نے ہیزاری سے کہا۔

”آخر اس کے ساتھ مسئلہ کیا ہے۔۔۔ کون ہے۔۔۔ کیا بیک گراؤنڈ ہے اس کا؟ کچھ اتنا پتا بھی ہے یا یونہی فلاح دارین حاصل کرنے چل پڑے ہو۔“ بابر شاہ نے فواد سے پوچھا۔

”نہیں ابو! اس کے بیک گراؤنڈ کے بارے میں میں کچھ نہیں جانتا۔ کافی دن پہلے روڈ پر میں نے پہلی بار اسے انتہائی زخمی حالت میں دیکھا تھا۔ بچے اس کو پتھر مار رہے تھے۔ ہتا نہیں میرے دل میں اس کے لیے کچھ سی کیوں پڑی۔ میں نہیں جانتا۔ بس یہ سوچ ذہن میں ابھری کہ مجھے اس شخص کو بچانا چاہئے۔ بس اس وقت سے یہ میرے کھینک پر ہے۔“

”کیا اس کی بیماری آخری سٹیج پر ہے۔“ بابر شاہ نے پوچھا۔

”نہیں ابو! اس کے ٹھیک ہونے کے ایٹمی پرسنٹ چانس ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اس کو توجہ اور ٹریٹمنٹ ملے تو یہ جلدی ٹھیک ہو سکتا ہے۔“ فواد نے کہا۔

”اور یہ جو کچھ بول رہا ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے۔؟ کہاں جانا چاہتا ہے؟ کسی جگہ کا نام بھی لیتا ہے؟“

”نہیں انکل! کسی جگہ کا تو نام نہیں لیتا۔ لیکن لگتا ہے کہ بے چارہ بڑی بری چوٹ کھائے بیٹھا ہے۔“

”کہیں کسی کو خٹے والی کے عشق اور فرقت میں اس کا یہ حال نہ ہو گیا ہو۔“ کاشف اپنی عادت کے مطابق اوٹ پٹانگ ہانکے جا رہا تھا اس بات سے بے خبر کے بابر شاہ پر اس کے ان جملوں نے اثر کیا تھا۔ انہوں نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر کاشف کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے کا رنگ ایک لمحے کو حنفیہ ہوا تھا جو فواد کی نظروں سے بھی چھپا نہ رہ سکا۔

”کاشف یار! کسی کسی وقت بولنے سے پہلے سوچ بھی لیا کرو۔۔۔۔۔۔“ پھر وہ بابر شاہ سے مخاطب ہوئے۔

”نہیں ابو! ایسی کوئی بات نہیں بس کسی کسی وقت دورے کی حالت میں اس کی سوئی اڑ جاتی ہے۔ عموماً خاموش ہی رہتا ہے۔ بس دورے کی حالت میں ہی اسے بولتے سنا ہے اور یہی جملے دہراتا ہے۔ ہتا نہیں اس کے پس پردہ کیا کہانی ہے۔“ فواد جیسے باتوں میں بابر شاہ کا دھیان پٹانے کی کوشش کرنے لگے۔ بابر شاہ بالکل خاموش تھے۔ جیسے وہاں موجود ہی نہ ہوں۔ پھر وہ کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”اچھا۔۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔۔ چلتا ہوں۔۔۔۔۔۔ میں خود ہی مل لوں گا۔۔۔۔۔۔ ایس۔ پی سے۔“ عجیب سے الجھن آمیز انداز میں کہہ کر وہ باہر جانے کو پلٹے۔ ساتھ والے کمرے سے متواتر آوازیں آرہی تھیں۔ ان کے قدر غیر ارادی طور پر اس طرف اٹھ گئے۔ حالانکہ ان کا ادھر جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

”انکل! ادھر مت جائیے گا۔ اس وقت وہ دورے کی کیفیت میں ہے۔“ کاشف نے انہیں اس طرف جاتے دیکھ کر پیچھے سے کہا لیکن انہوں نے جیسے سنا ہی نہ تھا۔

”ابو۔۔۔۔۔۔ نہ جائیں ادھر۔ وہ آپ کو کہیں زخمی نہ کر دے۔“ فواد نے بھی رد کیا لیکن انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں خاموش کرا دیا۔ اور خود جیسے قدموں سے چلتے اس کمرے کے دروازے پر پہنچ گئے۔

گئے۔ جہاں وہ چلا رہا تھا۔ دروازے کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا۔ انہوں نے کمرے کے اندر جھانکا۔ فرش پر ادھر ادھر برتن، بستر کی چادر اور جانے کیا کیا الا بلا کھرا پڑا تھا اور وہ بیڈ پر ایک کونے میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دن میں زنجیریں تھیں۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور ہونٹوں پر یہی الفاظ تھے۔

”مجھے جانا ہے۔۔۔۔۔۔ میں آؤں گا۔۔۔۔۔۔ میں جاؤں گا۔۔۔۔۔۔ چھوڑ دو مجھے جانے دو۔۔۔۔۔۔ مجھے لے چلو۔“ بابر شاہ کی نظریں اس کے چہرے پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ بہت عام سے انداز میں اس کو دیکھ رہے تھے کہ اچانک ان کے ذہن میں کچھ الجھن ہی پیدا ہوئی۔ یونہی دیکھتے دیکھتے الجھن آمیز لکیریں ان کی پیشانی پر نمودار ہو گئیں۔ انہوں نے پُر سوچ انداز میں آنکھیں سکڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

کون سی چیز دماغ کو شیخ کر رہی تھی وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ اضطرابی انداز میں ہونٹ کاٹتے وہ دوبارہ پلٹ آئے۔ فواد کو اپنے ابو کا یہ انداز بہت غیر معمولی اور عجیب لگا تھا۔ وہ بے خیالی میں چلتے ہوئے ان کے قریب آ گئے۔ ان کی نظریں تو فواد کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں لیکن فواد یقین سے کہہ سکتے تھے کہ بابر شاہ ان پر نظریں جمائے رکھنے کے باوجود انہیں نہیں دیکھ رہے تھے۔ ان کی باطنی آنکھیں کہیں اور دیکھ رہی تھیں۔

”فہدی! تم اس کا بہت خیال رکھنا۔۔۔۔۔۔ اسے کہیں جانے مت دینا۔“ بابر شاہ کے منہ سے نکلنے والے جملے غیر متوقع تھے۔ فواد کے ذہن میں کئی سوچوں نے بیک وقت سر اُبھارا۔

”کیا ہے اس شخص میں کہ پہلے میں نادانستگی میں اس کے عمر میں گرفتار ہوا اور اب ابو بھی۔۔۔۔۔۔ وہ الجھن آمیز انداز میں اپنے ابو کے چہرے کو دیکھ رہے تھے۔ جہاں کوئی تاثر نہیں تھا۔ بابر شاہ بات ختم کر کے دوبارہ واپسی کے لیے پلٹے۔ اور بہت آہستہ روی سے قدم اٹھاتے آفس سے نکل گئے۔ کاشف ان کو جاتے دیکھ رہا تھا۔ اس سارے دورانے میں وہ کبھی بابر شاہ کو اور کبھی فواد کو دیکھتا رہا ان کے تاثرات نوٹ کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ بابر شاہ کے جانے کے بعد وہ بھی کندھے اچکا تاوارڈ کی طرف چلا گیا۔ فواد اپنے ابو کے بارے میں سوچنے لگے۔

”کیا شناساکی ہو سکتی ہے ابو کی اس شخص سے۔ کیا زندگی میں پہلے کبھی یہ ملے ہیں؟“

اور دوسری طرف بابر شاہ کی سوچ بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔ ہتا نہیں کیا بات تھی وہ شخص انہیں کچھ شناسا لگا تھا۔ انہیں یاد نہیں آ رہا تھا کہ انہوں نے پہلے اسے کہاں دیکھا۔ ہتا نہیں دیکھا بھی تھا یا نہیں۔ بعض چہرے یونہی شناسا اور مانوس سے نکلتے ہیں لیکن یہ بات تو ملے تھی کہ اس شخص کو دیکھ کر بابر شاہ کے الجھے ہوئے ذہن کو ایک اور نئی الجھن مل گئی تھی۔



تھکے ہوئے پیروں میں اتنی سکت نہیں تھی کہ اس کے وجود کا بوجھ سہار سکتے۔ وہ تقریباً خود کو تھپتھپاتے

ہوئے کمرے تک لائی تھی..... آراستہ و بچراستہ کمرہ، تادرو تابیاب قیمتی چیزوں سے سجا اس کا یہ کمرہ..... اگر کسی کو کہتی کہ اس کمرے میں اس کا دم گھٹتا ہے تو وہ اس کا مذاق اڑاتا..... اگر وہ کہتی کہ اس کمرے میں رہنے سے بہتر وہ یہ سمجھتی ہے کہ چھوٹی سی جھوپڑی میں رو لے تو سننے والا اسے بے وقوف گردانتا، لیکن حقیقت یہی تھی اسے یہ آسائش نہیں چاہئے تھی۔ یہ مٹھلیں قالین، نرم گرم بستر، اٹلس و کنوَاب کے ملبوسات۔ ان میں سے کوئی چیز اس کے لیے کشش نہیں رکھتی تھی۔ اس لیے کہ اس سب کے عوض اس کی روح اس کا وجود رہن تھا..... اس کی ذات گروی تھی۔ اور جب آزادی کا احساس ختم ہو جائے تو ہنجرہ سونے کا ہو چاہے تیلیوں کا..... پرندے کے لیے زندگی سے عدم دلچسپی کے لیے یہی بات کافی ہے کہ وہ آزاد نہیں..... قید ہے اور قید بھی ایسی کہ اسی ہنجرے کے درود یوار سے سر نکرانگرا کر ایک نہ ایک دن اسے مرجانا ہے لیکن آزادی کا سانس اسے اب نصیب نہیں ہوتا..... اس کے ساتھ بھی تو کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ آزادی..... اور آزادی کی لطافتیں سب ہی کچھ ایک سہانا خواب تھیں۔ اسے لگتا تھا جہنم جہنم سے وہ اس ہنجرے میں قید ہے۔ بھاری بھر کم لباس سے نجات پا کر اس نے بالکل سادہ سے کپڑے زیب تن کیے۔ زیورات کے نام پر جو بوجھ اٹھا رکھا تھا اس سے چھٹکارہ پایا چہرے پر مصنوعی حسن کے نشانات مٹائے۔

عبادت کا پہلا اصول یہی ہے کہ ایک بار جس در پر ہاتھ ٹیک دیا پھر مرجانا ہے وہ در نہیں چھوڑنا۔“
 غلام عباس تم کیا کہہ رہے ہو میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ چاندنی کو واقعی اس کی باتیں سمجھ نہیں آ رہی تھیں۔

”سمجھ جائیں گی بی بی! آپ بھی سمجھ جائیں گی۔ جس استاد سے میں نے سبق لیا ہے کبھی تو اس کی نظر کرم آپ پر بھی ہوگی۔ سب مفہوم واضح ہو جائیں گے۔ ہر بات سمجھ آنے لگے گی۔ پھر آپ غلام عباس کا ان کہا بھی سمجھنے لگ جائیں گی اور مجھے اسی دن کا انتظار ہے۔ اس انتظار کی مسافت کے عوض جتنے کانٹے میرے پیروں میں چھبیں گے میرے اندر اور صبر آتا جائے گا۔ وہ کانٹے پھول سمجھ کر میں دامن میں بھرتا رہوں گا۔“

غلام عباس بات کھل کر کے کمرے سے نکل گیا اور چاندنی حیرت کے عالم میں دروازے کے سامنے لگے پردے کو ہٹا دیکھ رہی تھی۔



رات اپنی تمام تر لہریاں کے ساتھ رخصت ہو چکی تھی ایک ہل کے لیے بھی بابر شاہ کی آنکھیں نیند سے آشنا نہیں ہوئی تھیں۔ بہت سارے مسائل کسی عفریت کی طرح منہ پھاڑے ان کے سامنے کھڑے تھے۔ فواد کے کھینک میں جس شخص کو انہوں نے آج دیکھا تھا۔ اس نے انہیں ایک نئی الجھن میں ڈال دیا تھا۔ بار بار ذہن سے جھٹکنے کے باوجود اس کا چہرہ ان کی نگاہوں کے سامنے آ جاتا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ بار بار تخیل کے پردے پر وہ چہرہ انہیں کیوں دکھائی دے رہا ہے۔ اس سے پہلے انہوں نے اسے کہاں دیکھا تھا۔ انہیں یاد نہیں آ رہا تھا لیکن اس چہرے کے ٹکڑے خوردہ نقوش انہیں شناسا لگ رہے تھے۔ کوئی سوچ ان کے ذہن میں سوئی کی طرح چبھ رہی تھی۔ اپنے کمرے میں کرسی پر بیٹھے وہ کسی سوچ میں گم تھے۔ اسی وقت زاہدہ بیگم کمرے میں داخل ہوئیں۔ بابر شاہ کے چہرے پر مثبت پریشانی انہوں نے آتے ہی محسوس کر لی تھی۔

انہوں نے ناشتے کی ٹرے ان کے سامنے ٹیبل پر رکھ دی۔ بابر شاہ کی نیند سے عاری سرخ ہوتی ہوئی آنکھیں زاہدہ بیگم کی طرف انہیں۔ تردد اور پریشانی نے جیسے انہیں ایک ہی رات میں بیمار کر کے رکھ دیا تھا۔

”زاہدہ۔۔۔ ناشتہ نہیں کرنا فی الحال مٹرونگ سی چائے کا ایک کپ چاہئے۔ اگر تکلیف نہ ہو تو۔۔۔“

”تکلیف کی کیا بات ہے۔۔۔ ابھی بنائے دیتی ہوں۔۔۔“ انہوں نے کہا اور ٹرے اٹھانے لگیں تو وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

”آپ کدھر جا رہے ہیں۔۔۔“ ان کی کیفیت کو سمجھنے کے باوجود زاہدہ چچی نے کسی قسم کا استفسار مناسب نہیں سمجھا۔

”ان میں جا کر بیٹھتا ہوں۔۔۔ پتا نہیں کیا بات ہے کمرے کی فضا میں دم گھٹ رہا ہے۔“ وہ کہتے ہوئے باہر چلے گئے۔ صبح لان میں بالکل خاموشی تھی۔ ہلکی ہلکی خنک ہوا چل رہی تھی وہ لان چیمبر پر بیٹھ گئے۔ ذہن کے تمام گوشے حالات کی الجھی ہوئی ذور کو سلجھانے کی تک دو دو میں لگے ہوئے تھے۔ پریشانی اور تنہائی کی عمیق نکیروں کا جال سا پیشانی پر پھیلا ہوا تھا۔ اسی ہل رو بہ انہیں اپنے پورشن سے نکل کر ان کے حصے کی جانب بڑھتی دکھائی دی۔ اس نے دروازے سے اندر جھانک کر آریان کو آواز دی اور ایک دو منٹ کے بعد آریان بھی اس کے ہمراہ تھی۔ عائشا وہ دونوں سکول جا رہی تھیں۔

جس جگہ وہ بیٹھے ہوئے تھے ان دونوں کو وہاں سے گزر کر جانا تھا۔ سوان کے قریب آتے ہی دونوں نے سلام کیا۔

”وعلیکم السلام۔ سکول جا رہی ہو۔۔۔“ انہوں نے برہنیل تذکرہ پوچھا۔

”جی انکل۔“ آریان نے جواب دیا۔

”بیٹا! بہت احتیاط اور دھیان سے جایا کرو۔ آج کل بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔“

”جی۔۔۔“ وہ اثبات میں جواب دیتی گیٹ کی طرف چل پڑیں۔ بابر شاہ کی نگاہیں آریان کے سر پر تھیں اور ذہن کی سوئی ہر جھنجھٹ سے ہٹ کر آریان پر آ گئی۔ پتا نہیں کیا بات تھی بابر شاہ کو اس بچی سے عجیب سی انسیت ہو گئی تھی۔ اس کا رکھ رکھاؤ۔ اس کا سلیقہ، حسن صورت، حسن سیرت۔ کوئی بھی تو ایسا پہلو نہیں تھا جس کی وجہ سے وہ طوائف زاوی یا کوٹھے کی پیداوار نظر آتی۔ اس کی روشن پیشانی، حیا سے جھکی چٹکیں، معصوم پاکیزہ چہرہ اور بھولپن اس کے خاندانی ہونے کی دلیل تھی۔ انہوں نے اسے اپنی بیٹی کہا تھا۔ اور اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کے مستقبل کی ذمہ داری بھی انہوں نے اٹھانی تھی۔ انہوں نے ایک باپ بن کر اسے رخصت کرنا تھا اور ایک بیٹی کی طرح اس کے سارے چاؤ پورے کرنے تھے لیکن کیا کوئی اتنا اعلیٰ ظرف ہوگا کہ اس بچی کو اس کے داغدار ماضی سمیت قبول کر لے؟ جب سے وہ اسے اپنے پورشن میں لے کر آئے تھے اس کی ذات کے جوہر تو اب ان کے سامنے کھلے تھے۔ اس کی دھیمی دھیمی مسکراہٹ اور صحرائے مندر میں نہنے والی گھنٹیوں جیسی آواز انہیں بہت بری طرح کسی کی یاد دلا گئی تھی۔ اس کا مضبوط کردار، سکھڑا پاپا اور اس کی شخصیت کا سلجھاؤ۔ ہر چیز ہی انہیں اچھی لگتی تھی۔ انہوں نے اب تک آریان میں کوئی برائی نہیں دیکھی تھی جو قابل گرفت و قابل مذمت ہوتی۔

آریان کے لیے شریک زندگی چننے وقت انہیں از حد خیال رکھنا ہوگا کہ اب تک کی محرومیوں بھری

زندگی کے بعد آئندہ کوئی محرومی اس کے حصے میں نہ آئے۔۔۔۔۔ ان کے ذہن میں فواد شاہ کا بھرپور سراپا در آیا۔ ان کی لودیتی آنکھوں کی ہلکی سی چمک بابر شاہ نے دیکھی تھی لیکن ابھی وہ پورے وثوق سے نہیں کہہ سکتے تھے۔۔۔۔۔ ہاں البتہ آریان کو اگر اس نگاہ سے دیکھا جاتا تو وہ ہر لحاظ سے ان کے معیار پر پوری اترتی تھی۔۔۔۔۔ "بہن تو میں اسے کہہ ہی چکا ہوں تو پھر مستقل بیٹی بنانے میں کیا ہرج ہے۔۔۔۔۔ لیکن اس سے پہلے اس کی ماں کو یہاں موجود ہونا چاہئے۔ اس کو عذاب سے نکالنا ضروری ہے۔۔۔۔۔" ایس۔ پی صاحب سے ملاقات کے بعد بابر شاہ کافی پریشان تھے کیونکہ جن ستر سو شخصوں کا ذکر ایس۔ پی نے ان کے سامنے کیا تھا انہیں حل کرنا قدرے مشکل تھا۔

"کن سوچوں میں گم ہیں۔۔۔۔۔ چائے لیں۔" زاہدہ بیگم چائے کا کپ لیے قریب ہی کھڑی تھیں۔ سوچوں کے گرداب میں پھنس کر وہ ارد گرد سے بالکل ہی بے خبر ہو گئے تھے۔ انہوں نے کپ پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن وہ جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ وجہ بہت معقول تھی۔ آریان اور روبیہ جنہیں ابھی سکول گئے پانچ چھ منٹ سے زیادہ نہیں ہوئے تھے وہ دونوں انتہائی گھبرائی ہوئی حالت میں گیٹ سے داخل ہوئی تھیں۔ زاہدہ بیگم اور بابر شاہ دونوں ہی ان کی حالت دیکھ کر چونک گئے تھے۔ آریان کا تو گھبراہٹ کے مارے اس قدر برا حال تھا کہ اس کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔ حلق خشک اور آنکھیں بالکل بھری لگ رہی تھیں۔ چہرے کا رنگ ہلکی سی طرح پیلا پھٹک ہو رہا تھا۔ جبکہ روبیہ قدرے حواسوں میں تھی۔ زاہدہ بیگم نے آریان کا ہاتھ پکڑ کر اسے کرسی پر بٹھایا۔

"کیا بات ہے؟ کیا ہوا۔۔۔۔۔ اور اس قدر گھبرائی ہوئی کیوں ہو۔۔۔۔۔" انہوں نے پوچھا۔

"وہ۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ وہ بابر۔۔۔۔۔" آریان کی زبان اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔ بہادر ہونے میں اور بہادر کہنے میں کس قدر فرق ہوتا ہے آریان کو آج اچھی طرح سمجھ آ رہا تھا۔

"کیا ہے بابر۔۔۔۔۔" بابر شاہ کچھ کچھ سمجھ گئے تھے لیکن پھر بھی کنفرم کرنا چاہتے تھے۔

"وہ۔۔۔۔۔ وہ بابر پان دالی دکان پر۔۔۔۔۔ دونوں۔۔۔۔۔ دونوں کتے بیٹھے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔" آریان کوشش کے باوجود اپنی بوکھلاہٹ اور گھبراہٹ پر قابو نہیں پاسکی تھی۔ بابر شاہ کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں جی۔۔۔۔۔ نہ جائیں بابر۔۔۔۔۔ لعنت ڈالیں ان پر۔۔۔۔۔" زاہدہ بیگم ایک ہی سانس میں بولے چلی گئیں۔

"زاہدہ بیگم! تم کبھی عقل سے کام نہ لینا۔۔۔۔۔" بابر شاہ دانت پیٹتے ہوئے کونٹھی کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئے۔ وہ سب بھی ان کے ہمراہ ہی آگئے۔ بابر شاہ نے لاؤنج میں رکھے ہوئے نیلی فون کا ریسیور اٹھایا اور کچھ نمبر پر پریس کیے۔

"ہیلو۔۔۔۔۔ ایس۔ پی کا مران صاحب سے بات کرائیں۔" دوسری جانب سے ریسیور اٹھائے جانے پر انہوں نے کہا۔ کچھ لمحے یونہی سرک گئے غائب ایس۔ پی کا ریڈر انفارم کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ریسیور سے آواز ابھری۔

"ہیلو۔۔۔۔۔ ایس۔ پی صاحب میں بابر شاہ بات کر رہا ہوں۔۔۔۔۔" بابر شاہ نے اپنا تعارف کرایا۔

"جی جناب! کیا حال چال ہیں آپ کے۔۔۔۔۔" ایس۔ پی خوشگوار لہجے میں بولے۔

"بالکل ٹھیک ٹھاک۔۔۔۔۔ کل جس سلسلے میں آپ سے ملا تھا۔ اس کے بارے میں کچھ تفصیل مزید ہے۔"

"جی فرمائیں میں سن رہا ہوں۔"

"جن بد معاشوں کا میں نے آپ سے تذکرہ کیا تھا وہ اس وقت ہماری گلی کی ہی ایک دکان پر موجود ہیں۔۔۔۔۔" بابر شاہ نے اطلاع بہم پہنچائی۔

"ذرا صبر تو بتادیں ان کے۔۔۔۔۔" ایس۔ پی نے پوچھا تو بابر شاہ نے روبیہ کے بتائے ہوئے صلیب ان کے گوش گزار کر دیئے۔

"آپ فکر مت کریں۔۔۔۔۔ میں ابھی تھانے فون کروا تا ہوں۔" ایس۔ پی نے کہا۔

"بہت بہت شکریہ آپ کا۔۔۔۔۔"

"بابر صاحب! غیریت مت برتنے۔ ہمارا آپ کا تو بڑا اچھا ساتھ ہے۔" ایس۔ پی مسکراتے لہجے میں بولے۔ بابر شاہ نے بھی ایک دو باتیں کرنے کے بعد فون بند کر دیا۔

"چاچو! کیا کھڑے ہیں تھے ایس۔ پی صاحب! روبیہ ان کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی ان سے مخاطب تھی۔

"اب گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ایس۔ پی صاحب خود اس معاملے کو تنقیدگی سے لے رہے ہیں۔ انشاء اللہ بہت جلد مسئلہ حل ہو جائے گا۔" وہ واپس لان میں آگئے۔

"ویسے آریان بیٹا۔۔۔۔۔ اب اگر آپ مناسب سمجھیں تو ذرا تفصیل سے اپنے بارے میں آگاہ کریں۔ اپنے والد اور والدہ کے بارے میں۔ تاکہ اس وقت آپ جن لوگوں کے چنگل میں ہیں۔ ان لوگوں پر پکا ہاتھ ڈالا جاسکے۔" بابر شاہ آریان سے بہت نرم لہجے میں بولے۔

"انگل میرا ماضی کیا تھا میں بتا چکی ہوں۔ ایک طوائف نے مجھے جنم دیا۔۔۔۔۔ ہاپ کون ہے۔۔۔۔۔ مجھے نہیں معلوم۔۔۔۔۔ ماں کے پاس ایک فلکست سا کاغذ ہے جس پر ایجاب و قبول کی ایک رسمی ہی کارروائی کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس شخص کا نام میرے سارے سرٹیفکیٹس پر درج ہے لیکن وہ کیسا ہے میں نہیں جانتی۔ میں نے آج تک اسے دیکھا نہیں۔" آریان کے لہجے میں درد و کرمیں لیے لگا۔

”ہوں۔ نوے فی صد لوگوں کی طرح گناہ کر کے منہ چھپانے والوں میں سے۔۔۔۔۔“
 ”نہیں انکل۔۔۔۔۔ اس شخص نے باقاعدہ نکاح کیا تھا امی سے۔۔۔۔۔ لیکن پھر جانے اس کے دل میں کیا آئی کہ انہیں یوں بے یار و مددگار چھوڑ کر چلا گیا اور اس کے بعد آج تک پلٹ کر نہ دیکھا۔ شاید دنیا سے ڈر گیا۔۔۔۔۔“

”آریان! ستارہ بیگم کے ہاتھ کیسے لگیں تم۔۔۔۔۔“ روبہ نے سوال کیا۔

”یہ میری بد قسمتی ہے۔۔۔۔۔ میں اور کیا کہوں اس بارے میں۔ ماں سے محبت کرنا مہنگا پڑا مجھے۔ امی کے منع کرنے کے باوجود میں لاہور ان کی جائے رہائش پر پہنچ گئی تھی۔ سات سال سے اٹھارہ سال کی عمر تک بورڈنگ میں رہنے والے بچے کو ایک گھر کے تصور کی کس قدر طرہائیت اور خوشی محسوس ہو سکتی ہے شاید کوئی نہ سمجھ سکے۔ بارہ سال ماں سے الگ رہی تھی میں۔ اور۔۔۔۔۔ ستارہ بیگم نے بس ایک نگاہ مجھ پر ڈالی۔ لیکن اس ایک نگاہ کے بعد میں آزادی کو ترس گئی۔“ آریان پرت پرت اپنی ذات کے راز کھول رہی تھی۔

”یہ ستارہ بیگم کس قسم کی ذہنیت رکھتی ہے۔“ بابر شاہ نے پوچھا۔

”وہی ہی ذہنیت رکھتی ہے جیسی ہر کامیاب دھندہ کرنے والی بانی کی ہو سکتی ہے۔ وہ خود کو کہا کرتی تھی ستارہ بیگم ولد پیسہ۔۔۔۔۔ اسے بس پیسے کی زبان سمجھ آتی ہے اور پیسے ہی کی بولی بولتی ہے وہ۔۔۔۔۔“ آریان کے لہجے میں نفرت اُٹھ آئی۔

”آریان۔۔۔۔۔ تم اور تمہاری امی دونوں ہی بے قصور ہیں۔ ناکردہ گناہوں کی سزا کا بھگتان تم کیوں بھگتو۔۔۔۔۔ ہم ستارہ بیگم کے مطالبات پورے کریں گے۔ تمہاری توجہ جان چھوٹ ہی جائے گی لیکن ہماری کوشش یہ ہے کہ تمہاری مانی کو بھی ظلم کے چنگل سے چھڑایا جائے۔“ بابر شاہ مضبوط لہجے میں بولے۔
 ”اعظمہ چچا کسی کام سے باہر نکلے تو ان سب کو وہاں بیٹھا دیکھ کر وہ بھی وہیں آگئے۔“

”کیا ہو رہا ہے۔۔۔۔۔“ لان چیمبر پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے بابر شاہ کی طرف دیکھا۔ انہوں نے پہلی ہی نظر میں ان کی پریشانی بھانپ لی تھی۔

”بس کچھ مسائل ہیں جن کے حل کی وجہ سے پریشان ہوں۔۔۔۔۔ لیکن خیر۔۔۔۔۔“

”کچھ مجھے بھی تو بتائیں۔۔۔۔۔“ اعظمہ نے اصرار کیا تو بابر شاہ نے آریان سے متعلق ساری بات تفصیل سے بتادی۔

”ہوں۔۔۔۔۔“ اعظمہ نے بڑے انداز میں ہلکا رہا۔ ”بھائی مسئلے پریشان ہونے سے کبھی حل نہیں ہوتے۔ پھر آپ تنہا ہی ہر مسئلے کے سامنے سینہ سپر ہو جاتے ہیں۔ اس لیے دہری پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے آپ کو۔۔۔۔۔ بہر حال یہاں آپ ہرگز اکیلے نہیں ہیں۔ ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔ ماما کے

انہیں بہت ہیں لیکن ایسا بھی نہیں کہ ان کا تدارک نہ کیا جاسکے۔ انسان کرنے پر آئے تو کیا نہیں ہو سکتا۔“ اعظمہ چچا شروع سے ہی سٹیٹ فارورڈ قسم کے بندے تھے۔ مسئلے کی تہہ میں پہنچ جانا اور فوری اس کا حل نکال لینا ان کے لیے زیادہ مشکل نہیں تھا لیکن اس کے برعکس بابر چچا کی خاموش طبیعت کے باعث ان کے اندر فیصلہ کن قوت ارادی قدرے کم تھی۔ بس زندگی میں چند بار ایسا ہوا کہ وہ حالات کے سامنے ڈٹ گئے اور حالات کو ان کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑے۔

آریان، اعظمہ چچا اور بابر چچا کے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہی تھی۔ کسی قدر سکون کے لمحے میسر آئے تھے اسے ایک طویل عرصے کے بعد۔ زاہدہ چچی اور روبہ بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ اسی وقت صابرہ موبائل ہاتھ میں لیے ان کے قریب چلی آئی۔ کال بابر شاہ کے لیے تھی۔ انہوں نے موبائل کان سے لگا لیا۔ پہلو کے بعد وہ کچھ نہ بولے دوسری طرف کی بات سنتے رہے اور آخر میں شکر یہ کہہ کر موبائل آف کر دیا۔

”آریان! تمہاری ایک پریشانی تو ختم ہو گئی۔“ بابر چچا نے کرسی کی پشت سے ٹپک لگاتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب انکل؟“ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے ان کی طرف دیکھ کر بولی۔

”اب گھبرانے کی ضرورت نہیں وہ دونوں پولیس کی حراست میں ہیں۔“ بابر چچا نے کہا۔

”فون کس کا تھا بھائی؟“ اعظمہ چچا نے پوچھا۔

”ایس۔ پی کا۔۔۔۔۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے انہیں فون کر کے اطلاع دی تھی کہ وہ دونوں غنڈے جو آریان کو تنگ کرتے ہیں اور جنہوں نے فواد کے کلینک میں بھی کافی توڑ پھوڑ کی تھی ہماری گلی میں ہی ایک دکان پر موجود ہیں۔ ایس۔ پی صاحب کے فون پر تھانے کے عملے نے فوری ایکشن لیا اور انہیں گرفتار کر لیا گیا ہے۔“

”یہ تو بہت اچھا ہوا۔ خواہ مخواہ بچی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے منحوس مارے۔“ زاہدہ چچی اپنی لینگوئج میں بولیں۔ آریان نے بھی سکون کا سانس لیا۔

”آریان بیٹا۔ تمہیں ابھی میرے ساتھ چلنا ہوگا۔“ بابر شاہ نے کہا تو آریان سے پہلے اعظمہ چچا بول پڑے۔

”وہ کس سلسلے میں۔۔۔۔۔“

”ایس۔ پی صاحب سے ملنے کے لیے۔۔۔۔۔ ان دونوں کے خلاف بیان دینا ہے آریان کو۔“

بابر چچا نے کہا۔

فواد تیار ہو کر باہر نکلے تو بابر چچا نے انہیں پکار لیا۔

”فہدی..... ایک منٹ.....“

”جی ابو.....“ وہ ٹائی کی ٹاٹ سیٹ کرتے ہوئے ان کے قریب چلے آئے۔

”ایک منٹ تم ذرا بیٹھو..... آریان جیٹا! تم ابھی سکول جاؤ۔ میں تمہیں سکول سے ہی پک کر لوں گا۔“

”وہ پہلے فواد سے اور پھر آریان سے بولے۔ فواد کچھ نہ سمجھتے ہوئے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

آریان اور وہ یہ سکول جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”بھائی! میں بھی جا رہا ہوں۔ ٹرک لوڈ کروانا ہے گندم سے۔ پرسوں سے مال یونٹی پڑا ہوا ہے۔

ٹرک کی کچھ ریئرنگ کروانی تھی۔ میں بس ایک گھنٹے میں آ جاؤں گا۔ پھر اس مسئلے پر بھی کچھ کرتے

ہیں۔“ اظہر چچا بھی اٹھ کر چلے گئے۔ زاہدہ چچی بھی چائے کے برتن اٹھا کر اندر چلی گئیں۔

”جی ابو..... کہیں.....“

”کلینک جا رہے ہو.....“

”جی ہاں.....“

”وہ تمہارے پیش منیض کا کیا حال ہے؟“

”اب کچھ بہتر ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کے لیے آب و ہوا کی تبدیلی بہتر ثابت ہوگی۔ اس

لئے میں نے سوچا کہ آج اسے کچھ سیر و تفریح کروادیں۔ کلینک پر تو آج عابد اور عامیہ کی ڈیوٹی ہے۔ ہفتے

میں ایک دن وہ دونوں ہوتے ہیں۔ سو میں اور کاشف فارغ تھے تو سوچا..... کچھ چینیج ہو جائے۔“

”تو ٹھیک ہے پھر اٹھو چلیں۔“ باہر چچا کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”آپ نے بھی کہیں جانا ہے.....“ فواد نے پوچھا۔

”ہاں تمہارے ساتھ ہی جانا ہے۔“ باہر چچا مسکرا کر بولے تو وہ کچھ حیران حیران سے گاڑی میں

آ بیٹھے لیکن بولے کچھ نہیں۔

کلینک پہنچ کر انہوں نے کاشف کو پروگرام سے آگاہ کیا۔

”لیکن تمہارا وہ معصوم، بے ضرر مریض تو سو رہا ہے.....“

”کوئی بات نہیں ابھی جاگ جائے گا۔“

”کہاں لے جاؤ گے اسے۔“

”مارگلہ لٹر.....“ فواد نے جواب دیا۔

”یقین ہو گیا..... تم اپنے ساتھ ساتھ میرا بھی رگڑا لٹوا کر رہو گے.....“ کاشف معنوی تاسف

سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”کچھ نہیں ہوتا۔ تم تو بزدلی میں لڑکیوں کو بھی پیچھے چھوڑ رہے ہو۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض

ہے کہ ابو بھی میرے ساتھ جا رہے ہیں تم اور میں ہی نہیں ہیں۔“

”سر جی! وہ بابا جاگ گیا ہے..... ناشتہ بھی آرام سے کر لیا ہے اس نے۔“ نرس سلٹی نے اندر آ کر

بتایا تو فواد کاشف کو ہمراہ لے کر اس کے کمرے میں چلے گئے۔ واقعی وہ بہت خاموش اور تہذیب یافتہ

انسان نظر آ رہا تھا۔ کسی قسم کی حرکت کیے بغیر وہ خاموشی سے ان دونوں کی طرف دیکھنے لگا۔

”میں جاؤں گا..... میں نے جانا ہے۔“ وہ سرگوشی والے انداز میں بولا۔

”یار فواد! یہ تمہیں دیکھتے ہی کہاں جانے کی ضد شروع کر دیتا ہے۔“ کاشف بولا۔

”بابا..... کہاں جانا ہے آپ نے.....“ فواد بہت نرم لہجے میں بولے۔

”میں جاؤں گا..... میں نے جانا ہے.....“

”ٹھیک ہے بابا آپ کو لے چلوں گا۔ لیکن ایک شرط کہ آپ شور نہیں کریں گے۔“ فواد نے

کہا۔

”شور..... نہیں کروں گا!“ وہ فواد کو اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے گھورتا ہوا اپنے مخصوص سپاٹ

انداز میں بولا۔

”ہاں..... اگر آپ کوئی ایسی ونسی حرکت نہ کریں تو آپ کو لے چلوں گا۔“

”نہیں کرتا..... لے چلو گے۔“ وہ جھپٹکے سے بولا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک درآئی۔

”ہاں بالکل..... لے چلوں گا۔“

”لے چلو گے۔“

”ہاں بابا لے چلوں گا..... اب انہیں.....“ فواد نے آگے بڑھ کر اس کے پیروں کو زنجیروں سے

آزاد کر لیا۔ زنجیروں کے نشان اس کے پیروں پر اس بری طرح بنے ہوئے تھے جیسے وہ اس کے پیروں

میں ہی کھپ گئی تھیں۔

”اٹھو.....“

”ہاں جی..... انہیں.....“

”لو اٹھا.....“ وہ ایک جھپٹکے سے بیڈ پر سے اٹھا لیکن لڑکھڑا گیا۔ کافی دنوں سے اس نے زمین پر

پاؤں نہیں رکھا تھا۔ زنجیروں کی وجہ سے بھی پیروں میں خون کی گردش جیسے بہت کم رہی ہوگی۔ اسی لیے

اس کے پیروں کا بوجھ نہیں اٹھا پار ہے تھے۔ فواد نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔

”چلیں.....“ انہوں نے کاشف کو اور اسے مخاطب کیا۔

”چلو.....“ اس نے خوشی سے کہا۔ پتا نہیں کیوں فواد کو اس کا اس طرح مسکراتا بہت اچھا لگا۔ باہر

چچا ننی کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے انہیں آتے دیکھ کر وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ کلینک سے باہر آ کر

فواد نے اس کو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بٹھایا اور کاشف کو اس کے ہمراہ بیٹھنے کو کہا۔

”یار اتہبارے کہنے پر میں بیٹھ جاؤں گا۔ پر میری زندگی اور موت کے ذمہ دار تم ہی ہو گے۔“
کاشف ناراضگی سے بولا۔

”بکواس نہ کرو اور چپ چاپ بیٹھ جاؤ۔ کھا نہیں جائے گا وہ تمہیں۔“ فواد کے کہنے پر وہ
ڈرنے کی ایکٹنگ کرتا ہوا اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ باہر شاہ فرنت سیٹ پر بیٹھ گئے اور فواد نے ڈرائیونگ
سیٹ سنبھال لی۔ گاڑی کلینک سے نکال کر مین روڈ پر ڈال دی۔

”ابو! وہ دونوں تو گرفتار ہو گئے جن کی وجہ سے پچھلے دنوں کافی ٹینشن رہی لیکن مکمل طور پر اطمینان
والی بات نہیں ہے ابھی۔۔۔۔۔ آریان کے اصل دعویداروں کے علم میں جیسے ہی یہ بات آئے گی وہ وسیع
پیمانے پر اس کی بازیابی کے لیے کوشش کریں گے۔“ فواد نے کہا۔

”ہاں! تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔۔۔۔۔ یہ مسئلہ فی الوقت حل ضرور کیا ہے لیکن حل نہیں ہوا۔۔۔۔۔ اسی سلسلے
میں آج ایس۔ پی سے ملتا ہے مجھے۔۔۔۔۔ آریان کا بیان بھی ہو جائے گا اور اس کی زبانی ستارہ بیگم کے
بارے میں معلومات بھی مل جائیں گی۔ ایس۔ پی کا سران کا پتہ آزاد بھائی لاہور میں ایس۔ پی کے
عہدے پر تعینات ہے۔ یقیناً اس وجہ سے بھی وہ ہماری فہر کرے گا۔ مجھے سو فیصد امید ہے کہ یہ مسئلہ حل
ہو جائے گا۔“ باہر چچا پر خیال انداز میں بولے۔

وہ دونوں آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ اور کاشف خاموش بیٹھا گاڑی کے شیشے سے باہر جھانک
رہا تھا۔ جبکہ اس کے ساتھ والی نشست پر بیٹھا شخص خلاف توقع رویے کا اظہار کر رہا تھا۔ یعنی شیشے میں
سے باہر بھاگتی ہوئی گاڑیوں اور لوگوں کو دیکھ دیکھ کر خوشی سے ہنس رہا تھا۔

مارگلہ ہل پر جانے والی سڑک پر نرن لیتے ہی وہ قدرے خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ وہاں پہنچ کر گاڑی
روک کر فواد نے اس کی طرف والا دروازہ کھول دیا۔

”آئیں بابا۔۔۔۔۔ باہر آ جائیں۔۔۔۔۔“

”باہر آ جاؤں۔۔۔۔۔“ وہ جھٹکے سے بولا۔

”جی ہاں۔۔۔۔۔“ فواد نے کہا تو وہ گاڑی سے اتر آیا۔

”بابا۔۔۔۔۔ دیکھیں کتنی خوبصورت جگہ ہے آپ اب گھومیں پھریں۔۔۔۔۔“ فواد نے اس سے بات
کرنے کے بعد کاشف کو اس پر نظر رکھنے کو کہا اور خود باہر چچا کے ہمراہ نسبتاً ہٹ کر ایک درخت کے نیچے
بیٹھ گئے۔ ان کی نظروں کا مرکز صرف وہی ذات تھی۔ اور وہ حیران تھے کہ وہ جو تمام راستہ خوشی سے
قلقاریاں مارتا رہا تھا۔ یہاں پہنچ کر بالکل چپ ہو گیا تھا اور چاروں طرف عجیب عجیب نظروں سے دیکھ
رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شناسائی یا پسندیدگی کے بجائے کچھ بیجان سا محسوس ہو رہا تھا۔ کاشف اور وہ

دو دیر سے دیر سے چلتے ان کے قریب آ گئے۔

”یار فواد! تم اس کو یوں نارمل لوگوں کی طرح آزاد مت چھوڑو۔۔۔۔۔ یہ کسی پل نظر بچا کر بھاگ بھی
سکتا ہے۔“ کاشف نے کہا۔

”نہیں بھائے گا۔۔۔۔۔ تمہیں کس لیے کہا ہے کہ اس پر نظر رکھو۔۔۔۔۔ اتنی جان تو ہوگی کہ اسے بھاگتے
دیکھ کر قابو کر سکو۔۔۔۔۔“

”تم نے کیا مجھے جھارا پہلوان سمجھ رکھا ہے۔ پتا بھی ہے کہ دورے کی حالت میں جس آدمیوں
بتنی طاقت آ جاتی ہے اس میں۔ میں ننھی سی جان اکیلا کہاں اسے قابو کر سکوں گا۔“ کاشف کا کہنا بھی
درست ہی تھا اس کا تجربہ چند دن پہلے انہیں ہو چکا تھا۔ وہ باری باری ان دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔
لیکن سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہے۔

”میں جاؤں گا۔۔۔۔۔ مجھے جانا ہے۔۔۔۔۔ چلو۔۔۔۔۔ لے چلو۔۔۔۔۔“

”لو! اب موصوف اور کہیں جانے کو پر تول رہے ہیں۔ تمہاری اس فیاضی کا بھی موصوف کے
دماغ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔“

”فیاضی۔۔۔۔۔“ ایک لفظ کچھ جانا پہچانا سا تھا۔ اس نے چونک کر دیکھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے
شدید غصے سے اس کے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا۔ وہ کسی شعلے کی طرح بھڑک اٹھا۔

”فیاض۔۔۔۔۔ فیاض۔۔۔۔۔“ اس نے کاشف کو گریبان سے پکڑ لیا اور تقریباً جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔
”ہاں۔۔۔۔۔ جھوڑو۔۔۔۔۔ فیاض۔۔۔۔۔ فیاض۔۔۔۔۔“ وہ بری طرح کاشف سے چٹنا ہوا تھا۔ کاشف بے

چارہ تو اس اقتدار پر بوکھلا کر رہ گیا۔ جبکہ فواد اور باہر شاہ بھی حیران پریشان سے اس کی طرف دیکھ رہے
تھے۔ شاید ماضی کے تہ خانے میں یاد کا کوئی روزن کھلا تھا کوئی کرن چمکی تھی لیکن وہ صرف فواد کے لیے
تھی۔ خود اس کے دماغ کو شیخ کے جھٹکے سے نکلنے لگے تھے۔

”فیاض۔۔۔۔۔ لے چلو۔۔۔۔۔ فیاض۔۔۔۔۔ جھوڑو۔۔۔۔۔ جانا ہے۔۔۔۔۔“ اس پر آہستہ آہستہ دورے کی سی
کیفیت طاری ہونے لگی۔ باہر شاہ بہت غور سے اس کو دیکھ رہے تھے۔ فواد اور کاشف دونوں ہی اسے
سنبھالنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس کے حلق سے داشکاف جیٹیں بلند ہونے لگیں۔ آنکھیں حلقوں سے
اٹل کر باہر آ گئی تھیں اور پتلیاں پھیل چکی تھیں۔ چہرے اور گردن کی رگیں ابھر آئیں۔ اس کے عضلات
عجیب سے تناؤ کھنچاؤ کا شکار ہو گئے۔ ہاتھ پاؤں اکڑ گئے۔ آہستہ آہستہ اس کی جیٹیں بند ہو گئیں اور حلق
سے ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی ذبح شدہ جانور کرب کے عالم میں ذکرار پاہو اور وہ پھر وہ بے سدھ
ہو کر ان دونوں کے بازوؤں میں ہی ڈھلک گیا۔

وہاں رکنا اب بیکار ہی تھا۔ جس کے لیے وہ یہاں آئے تھے وہ تو دنیا دمانیہا سے بے خبر ہو گیا

تھا۔ بمشکل تمام اسے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹا کر وہ سب گاڑی میں بیٹھ گئے۔ فواد نے پہلے باہر شاہ کو گھر پر ڈراپ کیا اور خود کاشف کے ہمراہ کھینک آ گئے۔ ایمر جنسی وارڈ میں اس کو خصوصی ٹریٹمنٹ دی جانے لگی۔



لبے بالوں کے ننھے ننھے مھنگروں میں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ سفید سادہ ساڑھی میں بیوس وہ اکیلی بیٹھی جانے کیا سوچ رہی تھی۔

”بی بی..... ایسے کیوں بیٹھی ہیں؟“ غلام عباس اسے یوں بیٹھے دیکھ کر قریب چلا آیا۔

”خالی ہاتھ جو رہ گئی ہوں.....“ اس نے جیسے عام سے لہجے میں کہا۔

”نہ بی بی..... ایسے نہ کہیں..... آپ تو دان کرنے والوں میں سے ہیں۔ آپ کے ہاتھ کیسے خالی ہو سکتے ہیں.....“

”ارے غلام عباس! مجھ جیسے لوگ کسی کو کیا دے سکتے ہیں سوائے دکھوں کے..... ساری ریاضت خاک میں مل گئی..... برسوں کی اذیت سہنے کے باوجود کچھ حاصل نہیں ہوا۔“ وہ خود کھائی کے سے انداز میں بولی۔

”غلام عباس! جب ساری زندگی چلتے چلتے پاؤں زخمی ہو جائیں روح میں تھکان اتر آئے اور بعد میں پتا چلے کہ جو اثاثہ جو ز اور اہ ساتھ لے کر چلے تھے وہ تو کوئی نقب زن بے خبری میں لے آڑا..... تو اس وقت کیا ہوتا ہے.....“

”بی بی..... میں تو خود زندگی بھر سفر میں رہا..... چلتا رہا اور پاؤں زخمی ہوتے رہے۔ وجود پر چھکن ایسے ہے جیسے زخم پر کھرنڈ..... پر مجھ میں اور آپ میں فرق ہے بی بی..... میں جب سفر کے لیے نکلتا تھا تو خالی ہاتھ تھا..... میرے پاس زاد سفر نہیں تھا۔ اس لیے میں لٹنے کے کرب سے ناواقف ہوں لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ ایک مسافر کے لیے ز اور اہ کتنا ضروری ہوتا ہے۔“

”غلام حسین! اندر زخموں نے کراہٹ مچا رکھی ہے..... میں ختم ہوتی جا رہی ہوں..... کیا میرا گناہ اتنا بڑا تھا کہ جس کی سزا ساری زندگی پر محیط ہو جائے۔ دیکھو اب تو..... اب تو میرے بالوں میں پاندی کے تار جھلکانے لگے ہیں..... اب تو میرے چہرے کی رعتائی بھی دم توڑتی جا رہی ہے..... اس سن کے پیچھے تو دیوانے تھے ناں سب..... پھر اب، اب میری مسلسل سزا ختم کیوں نہیں ہو رہی؟“

”بی بی..... آپ نے کون سا گناہ کیا ہے۔ یوں خود کو مت برا کہیں..... سمجھی سمجھی قدرت ہمارے لیے بڑے عجیب فیصلے کرتی ہے اور ہمیں تمام عمر ان فیصلوں کے آگے بے زبان بن کر سر جھکنا پڑتا ہے۔“

”میں احتجاج کا کوئی حق نہیں دیا جاتا۔ اور آپ اور میں انہی لوگوں میں سے ہیں۔“

”نہیں غلام عباس! تم نہیں جانتے..... میرا گناہ بہت بڑا ہے۔ میں نے راتوں کو اٹھ اٹھ کر خدائے وحدہ لا شریک سے معافی مانگی..... انہی آنکھوں سے پتے آنسوؤں سے گناہ کی اس سیاہی کو دھونے کی کوشش کرتی رہی لیکن ابھی کمی ہے۔ ابھی اور ریاضت چاہئے۔ اور میں..... میں ٹوٹ چکی ہوں..... چاندنی کا بکھرا ہوا غلام عباس کے دل پر چ کے لگا رہا تھا۔

”بی بی! آج آپ کا حرف حرف مایوسی کے بوجھ تلے دبا ہوا محسوس ہو رہا ہے..... غلام عباس ابھی زندہ ہے بی بی! آپ خدا کے بعد مجھ پر بھروسہ رکھیں۔“

”غلام عباس! تمہیں یاد ہے نا۔ کئی سال پہلے تم نے ایک بار کہا تھا کہ جس استاد سے تم نے سیکھ لیا ہے اس کی نظر کرم مجھ پر بھی ہوگی..... تب میں تمہارا ان کہا بھی بکھنے لگ جاؤں گی..... کیا تمہیں آج بھی اس دن کا انتظار ہے۔“

”آپ کو اب تک یاد ہے بی بی.....“ وہ کچھ حیران ہو کر بولا۔

”ہاں غلام عباس! لیکن میں آج بھی سمجھ نہیں پاتی تمہارے ان جملوں کا مطلب اس وقت کیا تھا؟“

”آپ نے میرا انتظار کچھ اور بڑھا دیا بی بی! لیکن غلام عباس انتظار سے جھکنے والا نہیں ہے۔“

”مجھے بتاؤ تو سہی ان جملوں کا مطلب؟“

”ابھی وقت نہیں آیا بی بی! تھوڑا اور انتظار کریں.....“

”ارے مھنگرو! کہاں مر گیا رہے.....؟“ باہر سے آنے والی کرخت آواز نے ان دونوں کی محویت توڑ دی۔

”بی بی! زندگی بھر یہ مھنگرو بس دوسروں کی خاطر بچتا رہا..... لیکن اس کی صدا میں چھپا کر دیکھی کسی نے محسوس نہ کیا۔ پر آپ کی ہر کراہ غلام عباس کے دل پر لکھی ہے۔ بی بی! آپ فکر نہ کریں جس رب نے تیس سال اسے اپنی اماں بخش آج بھی وہی رحیم و کریم اس کا حامی و ناصر رہے گا.....“

”اس کا کچھ پتہ چلا غلام عباس؟“ اسے اپنی آواز کسی کنویں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

”ابھی تک ان کے ہاتھ نہیں آئی تو سمجھیں خیریت سے ہے..... باقی کچھ دنوں میں میں خود چکر لگا کر آؤں گا..... آپ فکر نہ کریں۔“ غلام عباس کہہ کر باہر بڑی بائی جی کی بات سننے چلا گیا۔

”پتا نہیں! کس حال میں ہوگی تم؟ ایک ایک لمحہ اذیت سے گزر رہا ہے تمہارے بغیر۔ خدا کرے کوئی تکلیف تمہیں چھو کر بھی نہ گزرے..... تمہاری حراں نصیب ماں دعاؤں کے علاوہ اور کبھی کیا سکتی کے بعد بھی غلام عباس پر یا اس پر کسی کو شک نہیں

تھا۔ اسی وجہ سے ان دونوں کے ساتھ کسی قسم کی سختی نہیں کی گئی..... کوٹھے کے تمام امور اسی طرح جاری و ساری تھے لیکن در پردہ ستارہ بیگم عرف بڑی بائی جی چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح اندر ہی اندر پھل رہی تھی..... نئی اطلاع کے مطابق وہ دونوں جو اس کی تلاش میں گئے تھے اور انہوں نے اسے ڈھونڈ بھی نکالا تھا لیکن اس وقت پولیس کی حراست میں تھے۔ یقیناً اس کے شکار کو کوئی محفوظ پناہ گاہ مل گئی تھی لیکن شکار کو مل سے باہر کیسے نکالا جائے یہ اس سے بہتر اور کون جان سکتا تھا۔



پچھلے کئی دنوں سے مہوش کے اجنبیت آمیز رویے نے آریان کو بہت ریزہ کر دیا تھا۔ وہ باہر چچا اور زاہدہ چچی کی محبت اور فواد کی خواہش کے آگے ہار کر ان کے پاس آگئی تھی لیکن مہوش اٹھتے بیٹھتے اسے کسی نہ کسی طنز کا شکار کیے رکھتی۔ اس کا دل تو پہلے ہی دکھا ہوا تھا۔ عارب تایا کی تلخ ترش باتوں کے بعد سے وہ رویہ اور طریقہ کی طرف بھی نہیں گئی تھی۔ البتہ ہینا پچھو، رویہ اور البتہ باقاعدگی سے اسے ملتی بھی تھیں اور حتی الامکان اس کی دلجوئی کرنے کی کوشش بھی کرتیں۔ بڑی اماں کا خصوصی برتاؤ اسے کسی حد تک سہارا دیئے ہوئے تھا ورنہ کبھی کبھی چند لوگوں کی نفرت کے سامنے بہت سے لوگوں کی محبتیں بھی ہارنے لگتیں۔ اس وقت بھی وہ لاؤنج میں اکیلی بیٹھی ہوئی تھی۔ زاہدہ چچی مہوش کے ساتھ بازار گئی ہوئی تھیں کچھ شاپنگ کرنی تھی اور اس کے بعد انہوں نے اپنی بہن کے گھر جانا تھا۔ باہر چچا کوریڈور سے اندر داخل ہوئے تو وہ سامنے ہی خاموش بیٹھی نظر آگئی۔ وہ اپنے کمرے میں جانے کی بجائے اسی کی طرف آگئے۔ پتا نہیں وہ کیا سوچ رہی تھی کہ گرد و پیش سے اس حد تک بے نیاز تھی کہ ان کے آنے کی اسے خبر تک نہ ہوئی۔

”آریان بیٹا! کیا سوچ رہی ہو.....“ وہ اس کے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولے۔
 ”کچھ نہیں انکل..... بس یونہی.....“ ان کے پکارنے پر وہ جیسے کہیں بہت دور سے واپس پلٹی تھی۔

”میں دیکھ رہا ہوں کہ تم آج کل اداس اداس رہنے لگی ہو..... کیا زاہدہ یا مہوش نے کچھ کہہ دیا!“
 اپنی بیگم اور بیٹی کی عادت سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔ سوائس خدشہ تھا کہ ضرور اس کی اداسی کا پس منظر ان دونوں میں سے کسی کا رویہ ہوگا۔

”نہیں انکل اداس تو نہیں..... بس اکیلی بوریت محسوس کر رہی تھی۔ روزانہ اس وقت رویہ اور البتہ آجاتی ہیں۔ وہ آج اپنی نانی امی کے گھر گئی ہوئی ہیں.....“

”تو مہوش کے ساتھ گھبراہٹ کا لڑکھٹا کر...“ بھارتیہ ہنسی۔ ”باہر چچا پر شفقت انداز میں

اس سے باتیں کرنے لگے۔

”اتفاق سے وہ بھی آج گھر پر موجود نہیں۔“ آریان سکرادی۔

”فواد تو ہے ناں گھر پر.....“ انہوں نے پوچھا۔

”جی غالباً ان کا آج ہاف ڈے تھا۔ کچھ دیر پہلے ہی واپس آئے تھے شاید کھانا کھا کر سو رہے ہوں۔“

”کمال ہے! ہر ایک ہی اپنی مصروفیت میں پھنسا ہوا ہے کسی کو تمہارا خیال نہیں آیا۔“ باہر چچا متاسف لہجے میں بولتے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اسی پل فواد لاؤنج میں آتے دکھائی دیئے۔

”اسلام علیکم ابو.....“ کیلے بالوں میں تولیہ رگڑتے وہ قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

”وعلیکم اسلام..... اچھا ہے تم خود ہی آگئے..... ورنہ میں اب تمہیں ہی بلانے جا رہا تھا۔“

”کیوں خیریت ابو.....“

”تمہیں خود تو احساس نہیں ہوتا..... کم سے کم میری مان لو اور آریان جینی کو کہیں کھانے لے جاؤ.....“

”باہر چچا کے ذہن کے گوشے میں فواد کی پسندیدگی کا پوائنٹ موجود تھا۔ سودہ بڑی عمیق نظری سے ان کے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ آریان کے نام پر ایک ہلکا سا جگنو جوان کی آنکھ میں چمکا تھا۔ وہ

باہر چچا کی تیز نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ ایک طمانیت سی انہوں نے اپنے دل میں اترتی محسوس کی۔

”لیکن انکل.....“ آریان ہچکچا رہی تھی۔

”بس اب خاموش..... جب سے آئی ہو..... آئے روز نئے نئے مسائل میں پڑ کر بہت اپ

سیٹ ہو گئی ہو۔ کچھ چینج ہو جائے تو اچھا ہے..... چلو فواد..... آریان کو لے جاؤ کہیں۔“

”ٹھیک ہے ابو میں لے چلتا ہوں لیکن ایس۔ پی سے ملاقات کے بارے میں آپ نے کچھ بتایا

ہی نہیں۔ اس کا کیا بتا؟ کیا کہتا ہے وہ.....؟“ فواد نے بالوں میں گنگھی کرتے ہوئے پوچھا۔

”اس میں کچھ مشکلات ہیں لیکن قابل حل ہیں..... کچھ دنوں تک جانا ہے لاہور..... ایس۔ پی

بھی ہمارے ساتھ جائے گا۔“

”وہ کس لیے.....؟“

”وہ اس لیے کہ وہاں کا ایس۔ پی اس کا کزن ہے..... سو اس کے ہمارے ساتھ جانے کی وجہ

سے اس کی خصوصی اینشن ہمیں ملے گی۔“

”ہوں.....“ انہوں نے ہلکا سے ہنکارا بھرا۔ ”پہلے آریان..... اچھا اب بوس آدھے کھٹے تک

واپس آ جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے جاؤ.....“ آریان کچھ جھجکتے ہوئے ان کے ساتھ ہوئی۔ باہر چچا

کی گہری نگاہوں نے ان دونوں کے سراپے کا موازنہ کیا اور ایک ہلکی سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

”اگر یہ دونوں ہمیشہ کے لیے یونہی ساتھ ساتھ رہیں تو اس میں کوئی ہرج تو نہیں۔“

بیٹے کی پسندیدگی تو انہوں نے محسوس کر لی تھی..... خود انہیں بھی آریان اس حیثیت سے اچھی لگی

تھی..... اور انہیں یقین تھا کہ زاہدہ بیگم کو بھی اس فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا کہ اس دن، جب انہوں

نے بچوں کے سامنے باہر چچا کی ذات کو نامعتبر کیا تھا۔ اس دن کے بعد سے وہ بہت بدل گئی تھیں۔ وجہ

شاید یہ تھی کہ انہیں یہ احساس ہونے لگا تھا کہ باہر شاہ کے ساتھ انہوں نے زیادتی کی ہے۔ زندگی بھر جس

شخص نے انہیں کسی کمی کا شکار نہیں ہونے دیا۔ ان کا ہر حق ادا کیا۔ محبت پر اختیار نہیں ہوتا لیکن جس نے

ان کے لیے، اپنے بچوں کے لیے محبت سے دستبرداری کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسی شخص کو یوں سرعام نامعتبر

کر دینا بہت بڑی زیادتی تھی۔ سودہ پہلے کی نسبت بہت خیال رکھنے لگ گئی تھیں باہر چچا کا۔ شاید اپنی

زیادتی کا ازالہ کرنے کے لیے۔

گازی گیٹ سے باہر نکال کر فواد نے اپنے بائیں جانب خاموش بیٹھی آریان کی طرف دیکھا۔

”آریان ان کہاں چلیں.....؟“ انہوں نے پوچھا۔

”جہاں آپ کا دل چاہے۔“ وہ یونہی سر جھکائے بولی۔

”میرا خیال ہے کہ کسی خاص جگہ پر جانے کی بجائے لاگ ڈرائیو بہتر رہے گی.....“ آریان نے

کوئی جواب نہ دیا۔ گازی کے شیشے سے باہر کا منظر انتہائی خوبصورت لگ رہا تھا۔ اسلام آباد کی صاف

ستھری سڑکیں آسمان پر چھائے ہوئے بادل۔ اچانک ونڈ سکرین ننھے ننھے شبنم کے قطروں سے بھینکنے

لگی۔

”فٹافٹ..... دیکھو! موسم کو بھی ہمارے ساتھ کتنی ہمدردی ہے۔“ فواد کا انداز بالکل نیا تھا۔

یوں جیسے بہت عرصے بعد اندر کا جس ختم ہو گیا تھا۔ باہر کی ٹھنڈی پھوار دھیرے دھیرے اندر کی ساری

کثافت کو صاف کر رہی تھی۔ جذبے ٹکھرنے لگے۔ یہ احساس کہ ان کے بے حد نزدیک بیٹھا یہ مہکتا وجود

ان کی ساری محبتوں، ساری وفاؤں کا حق دار ہے..... پیار کی نری سے اس کے وجود اور روح کا ہر زخم

انہوں نے ہی رفو کرتا ہے خود بخود نشہ سا بن کر ان کی آنکھوں میں سما گیا۔

”آریان! ایک بات پوچھوں؟“ انہوں نے بات شروع کی۔

”جی.....“ گھنیری پلکیں اٹھا کر اس نے عجب قیامت خیز انداز میں ان کی طرف دیکھا تھا۔

”تم..... تم میرے بارے میں کیا سوچتی ہو.....؟“

”آ..... آ..... آ..... آپ کو پکاروں..... آپ کی عزت کرنے میں جان

لڑاؤں۔ کبھی کبھی ہوتا ہے ناں آپ کسی کے بارے میں احرام اور عزت سے اتنا سوچتے ہیں۔ جتنا شاید اپنے بارے میں بھی وقت نہیں نکالنا چاہتے۔ مجھے آپ کے بارے میں عزت سے سوچنا۔ آپ کو عزت دینا بہت اچھا لگتا ہے۔“

”کمال ہے فواد میاں؟ تم تو کچھ اور ہی سمجھے بیٹھے تھے۔“ انہوں نے دھیمے سے لہجے میں خود سے کہتے ہوئے ہلکی سی چپت اپنے سر پر لگائی۔

”جی۔۔۔۔۔“ وہ حیران سی ہو کر بولی۔ ان کا کہا ہوا جملہ وہ ٹھیک سے سن نہیں پائی تھی۔

”آپ کے خیال میں آریان! آپ کے لیے جو کچھ میں اتنے عرصے سے کرتا آ رہا ہوں اس کی کیا وجہ ہے؟“ وہ تم سے آپ پر آ گئے۔

”آپ نے جو کچھ بھی کیا میں اس کے لیے آپ کی شکر گزار ہوں۔ بلکہ یہ لفظ اس کیفیت سے بہت کم ہے جو میں دل میں آپ کے لیے محسوس کرتی ہوں۔“ وہ ممنونیت سے بولی۔

”یعنی یہ سب کچھ جو میں نے کیا محض انسانی ہمدردی میں کیا۔ ایم آئی رائٹ۔“

”جی۔۔۔۔۔“ وہ سر جھکا کر بولی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ یہ عجیب و غریب باتیں کیوں کر رہے ہیں۔

”کیا تم اپنا جج ہو۔ کوئی کمی ہے تمہاری ذات میں کہ تم سے ہمدردی کی جائے۔ یہ سب میں نے ہمدردی میں نہیں کیا۔“

”پھر۔۔۔۔۔؟“ وہ سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

”پھر کا مفہوم سمجھا تو دوں مگر تمہاری ناراضگی کا ذرہ ہے۔“ وہ شریر سے لہجے میں بولے۔

آریان کو تو آج ان کی ایک بات حیرت زدہ کیے دے رہی تھی۔ فواد نے اس کی طرف دیکھا۔

”حیران مت ہو۔۔۔۔۔ کچھ لفظ کچھ باتیں قبل از وقت کہہ دی جائیں تو اپنی دلکشی کھودیتی ہیں۔ سو پھر کا مفہوم پھر کبھی سہی۔ میرا خیال ہے واپس چلنا چاہئے۔“ گہری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے کہا۔ آریان کو ان کی نگاہوں میں لکھے جذبے عجیب سی کیفیت کا شکار کر رہے تھے۔ اس نے گردن موڑ کر باہر کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ ان کی آنکھوں میں دیکھنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ فواد بھی اس کی کیفیت سمجھ رہے تھے۔ سو زیادہ ڈسٹرب کرنا انہوں نے مناسب نہیں سمجھا۔ اور واپس ہو لیے۔

کبھی کبھی انسان کا دل چاہتا ہے کہ سفر ختم ہی نہ ہو۔ راستے طویل ہوتے چلے جائیں۔ لیکن یہ صرف اسی وقت ہوتا ہے جب ہماری دل کے قریب تر ہو۔ دل بمسافر کی رفاقت لحوں کے بجائے

صدیوں پر محیط ہو جانے کی دعائیں کرتا رہے۔ سو اس وقت فواد کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔ لفظ کسی آبشار کی صورت ان کے دل سے پھوٹ رہے تھے لیکن وہ انہیں ہونٹوں پر روک رہے تھے۔ شاید اس لیے کہ ابھی محبت کی اداس تھی۔۔۔۔۔ جذبات کی تشویش اس وقت بھلی لگتی ہے جب وہ کندن ہو چکے ہوں۔ وقت سے پہلے کوئی بھی بات کر دینا اس کی اہمیت کو ختم کر دینے کے مترادف ہے۔

اور آریان ان ان کے لفظوں کو کچھ۔۔۔۔۔ شش تھی۔۔۔۔۔ بھنگی بھنگی پلکوں میں جس کا عکس سمٹ رہا تھا پھیل رہا تھا۔ اس کے لہجے کی نزاکت کو وہ نہ سمجھتی تو پھر کون سمجھتا۔ وہ زندگی۔۔۔۔۔ وہ زندگی کیسی تھی۔ جب فواد شاہ کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو محبت کے مفہوم سے نا آشنا تھی۔ اس نے سوائے ماں کی محبت کے کسی اور محبت کا ذائقہ نہیں چکھا تھا۔ نہ باپ کی نہ بہن بھائیوں کی۔ جنگل کی اس البر ہوانے راستے کا تعین کر لیا تھا۔ وہ قفس زدہ ماحول سے نکل کر خوشبو کی تلاش میں تھی جو اس کی روح کو شانت کر دے۔ محبت کے لمس سے نا آشنا رہی تھی۔ مگر محبت آمیز مہربانوں سے بے خبر ہرگز نہیں تھی۔ جس سے دل کے گلزار مہلک اٹھتے ہیں۔ اس کا دل عجیب اتھاہ میں ڈوبتا ہوا رہا تھا۔

”آریان۔۔۔۔۔“ فواد نے اسے بہتر ہو سنے سے پکارا تھا۔ وہ ان کی طرف دیکھنے لگی۔

ایک نظم سنیں۔۔۔۔۔ سنیں گی۔“

”جی۔۔۔۔۔“ آریان کے کہنے پر ایکسر لکھے کو فواد خاموش ہوئے۔ گاڑی اس وقت جس روڈ سے گزر رہی تھی وہ کوئی مصروف روڈ نہیں تھا۔ انہوں نے گاڑی کی رفتار بہت دھیمی کر دی۔ ونڈ سکرین پر نظریں جمائے کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ بہتر نرم اور گہ زلہجے میں بولنے لگے۔

چلو تم کو بتاتے ہیں

کہ تم کو دیکھ کر دل نے

کہا تم رشتہ جاں سے بھی بڑھ کر ہو

دعا کی سرحدوں پر

جو ادھوری ہے، مری ایسی تمنا ہو

میرے دل کا مقدر ہو

کہ تم اک روشنی بن کر، شفاء لے کر

کبھی دست میحا کی طرح

اترے ہوئے، ہر زخم دل پر ہو

چلو تم کو بتاتے ہیں

کہ تم۔۔۔۔۔

سرائے دہر میں، اندیشہ زندگانی میں

تم ہی دل کا سہارا ہو

جو روح کے آسمان پہ جگمگایا ہے محبت سے

سہانی شام کی چاہتوں کا پہلا تارہ ہو

وفا کا استعارہ ہو

تمہارے قرب کی خوشبو سے پتھر کی طرح ہم نے

سلگتی دھوپ میں پھیلاؤ پایا ہے

تمہارے پیار کی رنگین کنول ٹھنڈی ہوا سے سرسراتے ہیں

ہم سادوں میں بھیگے پیزوں کو چھولیں تو

تمہارے لمس کی خوشبو کے لمحے جگمگاتے ہیں

چلو تم کو بتاتے ہیں

کہ ہم نے زندگی کے سب درق لے کر

سب ہی سطروں میں لکھ لی ہے تمنا تم کو پانے کی

زمانے بھر میں شاید کاتب تقدیر کے ہاتھوں

میرے دل نے لکھ لی ہے تمہاری چاہ کی خواہش

تمہاری آرزوؤں کا جواک اور اک ہے مجھ میں

کسی میں ہو نہیں سکتا

تمہاری مسکراہٹ کا جواک ارمان ہے مجھ میں

کسی میں ہو نہیں سکتا

چلو تم کو بتاتے ہیں۔

لفظوں میں بھی جان ہوتی ہے۔ یہ بھی دھڑکنوں کی طرح دھڑکتے ہیں۔ یہ بھی پھولوں کی طرح
 مہکتے ہیں اور بادلوں کی طرح برستے ہیں۔ آریان ان لفظوں کے ردھم میں پور پور بھیگ رہی تھی لیکن شاید
 ان دونوں کو ہی اپنی اپنی محبت کا بھرم رکھنا آتا تھا۔ واپسی کا سفر ختم ہونے والا تھا لیکن اس مختصر سے سفر کی
 رفاقت نے ان دونوں کے دلوں میں یقین بھر دیا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے ہی ہیں۔



آریان کا بیان قلمبند کروانے کے بعد بابر شاہ اسے لیے ایس۔ پی کے آفس سے باہر نکلے۔
 ”میرا خیال ہے بیٹا! کہ کم سے کم اب یہ دونوں تو اندر گئے..... ستارہ بیگم کے ہاتھوں کی پہنچ
 یہاں تک نہیں ہو سکے گی۔ اس ٹینشن سے نجات کے بعد اب ہم پوری دلجمعی سے لاہور جا کر ستارہ بیگم
 سے ملاقات کر سکتے ہیں..... کیا خیال ہے تمہارا؟“ گاڑی کا فرنٹ ڈور کھول کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے
 ہوئے وہ خود گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھے۔
 ”جی انکل.....“ آریان نے مختصر جواب دیا۔

”شام ہونے والی ہے میرا خیال ہے فہدی کو بھی ساتھ لے چلیں۔“ بابر چچا خود کلامی کے سے
 انداز میں بولتے ہوئے گاڑی چلا رہے تھے..... فواد کا کلیٹک راستے میں پڑتا تھا۔ سودہ اسی طرف چل
 پڑے۔ اصل مسئلہ تو کچھ اور تھا۔ اصل میں وہ اس مریض سے متعلق کافی الجھن میں تھے۔ سو ارادی
 غیر ارادی طور پر کلیٹک کی طرف رخ کر لیتے تھے۔ کلیٹک پہنچ کر وہ جس وقت آریان کے ہمراہ آفس میں
 پہنچتے تو وہاں کا ماحول دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ کاشف فواد پر بری طرح ناراض ہو رہا تھا۔

”فہدی! یہ کس مصیبت کو گلے ڈال رکھا ہے..... آج پھر بھاگ نکلا وہ تمہارا چہیتا..... کتنی مشکل
 سے قابو کر کے لائے..... دو گھنٹے سڑکوں پر مارے مارے پھرتے رہے اس کی تلاش میں..... کچھ حاصل
 نہ وصول مفت کی سردردی..... کل کلاں کو کسی گاڑی کے نیچے سردے دے تو ہمارے اوپر بلاوجہ مصیبت
 آجائے گی ناں.....“ کاشف آج سچ کچ ناراض تھا۔ بابر شاہ اور آریان آگے بڑھ کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔
 ”اسلام علیکم انکل.....“ کاشف کی نظر بابر شاہ پر پہلے پڑی۔ فواد نے بھی سلام دعا کی۔

”کیا ہوا؟ خیریت تو ہے.....“ بابر شاہ نے پوچھا۔
 ”انکل کیسی خیریت اور کہاں کی خیریت..... پتا نہیں کہاں سے راہ چلتے پاگل کو لا کر سر پر مسلط
 ہے..... ہر وقت آنے جانے کا جنون اس کے سر پر سوار

رہتا ہے۔ آج بھی بھاگ گیا۔ کیونکہ اس کا آدھا ٹکڑا اس کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ اتنی مشکل سے اسے ڈھونڈ کر قابو کر کے لائے۔ میں اس سے یہ پوچھ رہا تھا کہ کیا ہر سڑک پر پھرنے والے پاگل، بے سہارا کو یہ یونہی اٹھا اٹھا کر ٹینک لائے گا؟ فضول کی دروسری کا کیا اس نے ہی ٹھیکہ لے رکھا ہے؟“

”یار کاشف! اب تو وہ پہلے سے بہت بہتر ہو گیا ہے۔ بات سمجھنے لگا ہے۔ بس کچھ وقت لگے گا اور وہ ٹھیک ہو جائے گا لیکن اگر اسے ٹرینٹ دینے کی بجائے یونہی سڑکوں پر لوگوں کے پتھر، ٹھنڈے، دھکار ملی تو پھر شاید وہ کبھی ٹھیک نہ ہو۔۔۔۔۔۔ بلکہ ممکن ہے کہ مزید خراب ہو جائے اور پھر اسے صحیح کرنا ناممکن ہو جائے۔“ فواد کاشف کو سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کے لیے اس حد تک غصیلے انداز کے باوجود فواد بہت تحمل سے کام لے رہے تھے۔

”اب کہاں ہے وہ۔۔۔۔۔۔؟“ بابر شاہ نے سوال کیا۔

”کہاں ہوتا ہے موصوف نے۔۔۔۔۔۔ کسی بندر کی طرح کمرے میں باندھا ہوا ہے۔“ کاشف جلتے ہوئے لہجے میں بولا۔

”کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں؟“ بابر شاہ نے پوچھا۔

”آئیں میں خود لے چلتا ہوں۔۔۔۔۔۔“ فواد کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔۔۔۔۔۔ بابر شاہ نے بھی اٹھ کر ان کے ساتھ قدم آگے بڑھائے۔ آریان اٹھنے لگی تو فواد نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

”تم بیٹھو۔۔۔۔۔۔ ہم بس ابھی آتے ہیں۔۔۔۔۔۔“ انہوں نے کہا اور بابر شاہ کے ساتھ آفس کے دروازے سے نکل کر ملحقہ کمرے میں داخل ہو گئے۔ دروازے سے اندر آگے ہی انہیں وہ بینڈ پر دکھائی نہیں دیا تھا۔ زنجیروں سے باندھا ہوا تھا وہ لیکن بینڈ کے پائے کے ساتھ ٹیک لگائے نیچے زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ گھٹنے سینے سے لگا کر ان کے گرد بازو حائل کر کے ان پر سر رکھے بیٹھا تھا۔ وہ دونوں اس کے قریب جا کر بیٹھ گئے۔

”بابا۔۔۔۔۔۔“ فواد نے آہستگی سے پکارا لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا بدستور یونہی بازوؤں پر سر رکھے بیٹھا رہا۔

”بابا۔۔۔۔۔۔“ اب کی بار انہوں نے قدرے اونچی آواز میں پکارا تو اس نے بہت آہستگی سے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔۔۔۔۔۔ اس کی شکست خوردہ آنکھوں میں آنسو جھللا رہے تھے۔ فواد اور بابر شاہ بے چہین ہوا گئے۔

”مرد ہو کر روتے ہو؟“ بابر شاہ کا یہ جملہ تلخ سہی لیکن اس پر اثر انداز نہیں ہوا تھا۔ اس نے محض نفی میں سر ہلایا یہ اور بات کہ چلوں پر ٹکے آنسو چھٹک کر اس کے گالوں کو بھگونے لگے۔

”تو پھر یہ کیا ہے۔۔۔۔۔۔؟“ انہوں نے اس کی بھیگی آنکھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

یہ آنسو کیوں نکل رہے ہیں؟“

”اندر پانی بہت جمع ہو گیا ہے۔ آنسوؤں کے ذریعے ختم کر رہا ہوں۔ تاکہ پھر کبھی روؤں نہ۔“ بہت سلیقے سے اس نے جواب دیا۔ بابر شاہ اور فواد نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

”تم نیچے کیوں بیٹھے ہو۔۔۔۔۔۔ اوپر بیٹھو۔۔۔۔۔۔ اٹھو شاہاش۔“ بابر شاہ نے اس کا بازو پکڑ کر اسے اٹھانا چاہا لیکن اس نے بازو چمڑا لیا۔ کچھ دیر انہیں گھورتا رہا۔ عجیب سا انداز تھا اس کا۔

”آپ سید ہیں نا۔۔۔۔۔۔“ ان کے سوال کے جواب میں بجائے جواب دینے کے اس نے جو سوال پوچھا وہ ان کے لیے غیر متوقع تھا۔

”ہاں۔۔۔۔۔۔ میرا تعلق سادات فیملی سے ہے۔۔۔۔۔۔“ ان کا جواب سن کر وہ ایک طرف کو سرک گیا۔ جیسے خود کو سینٹا چاہتا ہو۔

”آپ۔۔۔۔۔۔ آپ یہاں نہ بیٹھیں۔۔۔۔۔۔ اوپر بیٹھیں۔۔۔۔۔۔ آپ سید ہیں۔۔۔۔۔۔ اوپر بیٹھیں۔۔۔۔۔۔“ اس کی آواز لرز رہی تھی۔

”تم بھی تو نیچے بیٹھے ہوئے ہو۔۔۔۔۔۔ میں بیٹھ گیا تو کیا ہو گیا۔“ بابر شاہ بولے۔

”نہیں۔۔۔۔۔۔ میں تو بیچ ذات کا ہوں۔۔۔۔۔۔ میرا کوئی نسب نہیں۔۔۔۔۔۔ میری کوئی پہچان نہیں۔۔۔۔۔۔ میں آپ کے برابر کیسے بیٹھوں۔۔۔۔۔۔ کیوں بیٹھوں۔۔۔۔۔۔“

بابر شاہ کے لاشعور کی اتھاہ گہرائیوں میں اس کا جواب سن کر کہیں کوئی سوئی ہوئی یاد دھیرے سے کسائی لیکن وہ اس یاد کے وجود کو محسوس نہ کر پائے۔

”تمہیں کس نے کہا کہ تم بیچ ہو۔۔۔۔۔۔ تمہارا کوئی نسب نہیں۔“ بابر شاہ نے اس سے پوچھا۔ تو وہ انہیں یوں دیکھنے لگا جیسے ان کی سوچ پر افسوس کر رہا ہو۔

”ضروری تو نہیں کہ کسی کے بتانے پر ہی میں سمجھوں۔۔۔۔۔۔ میرے وجود کا کوئی مجھے احساس دلائے تو تب ہی مجھے احساس ہو گا کیا۔۔۔۔۔۔“ وہ کس مضمون میں بول رہا تھا بابر شاہ نہیں سمجھے۔ پھر انہوں نے دل میں سوچا کہ یہ کون سا نارمل انسان ہے ذہنی طور پر اپ سیٹ ہے اور میں اس سے ایسے گفتگو کر رہا ہوں جیسے یہ بالکل ٹھیک ہے۔ انہوں نے اس کی طرف دیکھا جو اپنی بات مکمل کرنے کے بعد دوبارہ سر جھکا کر بیٹھ گیا تھا۔

”تم کسی فیاض کو جانتے ہو؟“ بابر شاہ نے پوچھا تو ایک جھٹکے سے اس نے سر اٹھایا۔ اف خدا یا کس قدر وحشت تھی اس کے چہرے پر۔ سارے جسم کا خون جیسے آنکھوں میں سمٹ آیا تھا۔ اس کی نظریں مسلسل بابر شاہ کو دیکھ رہی تھیں۔ ان آنکھوں کی وحشت دیکھ کر بابر شاہ اور فواد ایک قدم پیچھے سرک گئے۔

انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس پر وہ ب کی کیفیت طاری ہونے والی ہے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس نے

ان کے چہروں پر نگاہیں نکائے نکائے ہی عجیب سے انداز میں نفی میں سر بلایا۔
 ”میرے ساتھ چلو گے؟“ بابر شاہ نے پوچھا۔
 ”کہاں.....؟“ بھاری سی آواز اس کے حلق سے برآمد ہوئی۔
 ”جہاں تم کہو گے؟“

”شاہ صاحب! کیوں مذاق اڑاتے ہو میرا..... یہ آپ کے بس کی بات نہیں۔ میں نے جانا ہے
 ناں تو خود جاؤں گا۔ اور اب کہ جاؤں گا تو ہاتھ نہیں آؤں گا..... حیدروں میں بیڑیاں ڈال کر کہتے ہو کہ تم
 آزاد ہو..... پرندے کے پر کاٹ کر اسے اڑنے کا مشورہ دیتے ہو..... اب کہ جاؤں گا تو نہیں
 آؤں گا..... خود جاؤں گا کسی کی مدد نہیں چاہئے..... جاؤں گا کوئی نہیں روک پائے گا.....“ پھر وہ سر پیچھے
 کر کے بیز کی پٹی سے ٹیک کر غلاؤں کو گھورتے ہوئے کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔
 ”میں آؤں گا..... ننگوں کا یہاں سے..... جاؤں گا..... جلد آؤں گا.....“

”بابا.....“ فواد نے اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ پھر بابر شاہ نے بھی اسے پکارا لیکن وہ ان کی
 طرف متوجہ نہیں تھا یا شاید ان کی طرف متوجہ ہونا ہی نہیں چاہتا تھا۔ فواد نے بابر شاہ کو اٹھنے کا اشارہ کیا
 اور دونوں دوبارہ آفس میں آ گئے۔

”فواد! تمہارا کہنا درست ہے..... پہلے کی نسبت بہت بہتر ہو چکا ہے یہ..... آج اس نے جتنی
 باتیں بھی کیں بہت سلیقے اور تہذیب سے کیں..... بے ربط جملے اس کے منہ سے بہت کم نکلے ہیں۔“ وہ
 کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

”جی ابو! میں یہی کاشف کو سمجھانا چاہ رہا تھا کہ اب وہ اپنی پرسنٹ ٹھیک ہو چکا ہے۔ بس کسی کسی
 وقت مٹری سے اتر جاتا ہے۔ اب اگر ہم اس سے مزید بولنے کی کوشش کرتے کسی قسم کا استفادہ کرتے تو
 وہ بھڑک اٹھتا..... لیکن مجھے یقین ہے کہ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا..... آپ یہ بتائیں کہ آریان سمیت
 کہاں سے آرہے ہیں.....“ فواد نے بات کے اختتام پر ان سے پوچھا۔
 ”صبح بتایا تو تھا تمہیں کہ آریان کا بیان قلمبند کروانا تھا..... ایس۔ پی صاحب سے اس کی تفصیلی
 بات ہوئی ہے.....“

”پھر کیا نتیجہ نکلا.....؟“ فواد نے پوچھا۔

”نی الحال تو کچھ نہیں کہہ سکتے..... بہر حال امید کے کئی پہلو روشن ہیں..... تم یہ بتاؤ کہ گھر چل
 رہے ہو ہمارے ساتھ یا ابھی کام ہے کلینک میں.....“ بابر شاہ نے ان سے پوچھا۔
 ”ابو اس وقت تو نہیں جاسکتا..... ایک ایکسیڈنٹ کیس آیا ہوا ہے کچھ سیریس ہے اس لیے ایک
 دو گھنٹے مجھے لگ جائیں گے۔“

”تو ٹھیک ہے پھر ہم چلتے ہیں..... چلو بیٹا۔“ انہوں نے پہلے فواد اور پھر آریان کو مخاطب
 کیا۔ آریان اٹھ کھڑی ہوئی..... وہ دونوں کلینک سے نکل کر گاڑی میں آ بیٹھے۔

بابر شاہ گاڑی ڈرائیو کر رہے تھے لیکن ان کے ذہن کا ہر نقطہ اس پاگل پر مرکوز تھا۔ اس کا لہجہ اس
 کی باتیں ردہ کران کے دماغ میں کھلبلی مچا رہی تھیں۔

”اندرا پانی بہت جمع ہو رہا ہے اس لیے آنسوؤں کے ذریعے ختم کر رہا ہوں کہ پھر کبھی روؤں ہی
 نہ۔“

”میں بچ ذات ہوں..... میری کوئی پہچان نہیں..... میرا کوئی نسب نہیں..... میں آپ کے برابر
 کیسے بیٹھ سکتا ہوں.....“ ان کے دماغ میں شائیں شائیں ہونے لگی..... آنسوؤں کے جھکڑ سے چلنے
 لگے..... سوچ کے تناور درخت اس آندھی کے سامنے ایک ایک کر کے گرنے لگے تھے۔ پھر اچانک دماغ
 کی گہرائیوں میں دور تار یکیوں کے اندر ایک جھماکا سا ہوا۔ بے اختیارانہ ان کا پاؤں پوری قوت سے
 بریک پر جا پڑا..... گاڑی کے تائر بہت بری طرح چرچرائے اور گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی۔ آریان
 گھبرا گئی وحشت زدہ انداز میں ان کی طرف دیکھنے لگی۔ اسے یہی لگا کہ بابر شاہ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔
 ان کے چہرے کے تنے ہوئے عضلات، وحشت ناک حد تک خوں رنگ ہوتی آنکھیں اسے متوحش
 کر گئیں۔ بابر شاہ کی نظریں پتا نہیں کون سے نقطے پر مرکوز تھیں کہ بالکل ساکت دکھائی دے رہی تھیں۔
 جبکہ دماغ جیسے کسی زلزلے کی زد میں تھا۔

وہ ایک پھانس جو کافی عرصے سے دماغ میں نیزے کی انی کی طرح کھبی ہوئی تھی وہ نکل گئی تھی۔
 وہ کون ہے..... انہیں یاد آ گیا تھا..... اچانک تمام پردے سرک گئے تھے..... انہیں سب کچھ یاد آ گیا وہ
 پہچان گئے..... بھلا وہ کس طرح فراموش کر سکتے تھے..... آریان نے بہت دیر سے بابر شاہ کے
 اسٹیرنگ پر دھرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

”انکل کیا بات ہے..... آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟“ اس نے بابر شاہ سے پوچھا تو وہ
 جیسے ہوش میں آ گئے۔

”کچھ نہیں..... کچھ نہیں بیٹا..... میں ٹھیک ہوں..... سوری بیٹا۔“ آریان سے بات کرنے کے
 بعد انہوں نے گاڑی سٹارٹ کی اور تقریباً فل سپید میں بھگاتے ہوئے گھر لے آئے۔ گاڑی روک کر
 نیچے اترے۔ لان میں اس وقت فیض چچی، ہینا پھپھو، روبی، انید اور بڑی اماں موجود تھیں۔ بابر شاہ
 جس کیفیت اور عالم میں وہاں سے گزرے تھے اس میں انہیں رسماً بھی کسی سے دعا سلام کا خیال نہ آیا۔
 چہرے پر شدید ٹینشن کا غبار سب ہی نے دیکھ لیا تھا اور محسوس کر رہے تھے کہ یقیناً کچھ غیر معمولی
 ہو گیا ہے۔ مگر نہ بابر شاہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اپ سیٹ ہونے والے آدمی نہیں تھے۔ آریان گاڑی سے

اتر کر جب ان کے قریب آئی تو وہ سب پریشانی میں اس سے استفسار کرنے لگے کہ بابر شاہ کو کیا ہوا؟ بڑی اماں کے پوچھنے پر اس نے بتایا۔

”پتا نہیں بڑی اماں! ایس۔ پی صاحب کے آفس سے واپسی پر کھینک چلے گئے تھے۔ وہاں کسی مریض سے ملنے کے بعد کچھ اپ سیٹ ہوئے تھے۔ ڈرائیونگ کے دوران راستے میں بھی ایک دو بار حادثہ ہوتے ہوتے بچا۔“ آریان کو جو معلوم تھا اس نے بتا دیا لیکن اس سے بابر شاہ کی پریشانی کا کیا ربط ہے کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

بابر شاہ کمرے میں داخل ہوئے تو زاہدہ چچی وارڈ روم کھولے پر پس شدہ کمزوروں کی سیٹنگ میں مصروف تھیں۔ انہوں نے پلٹ کر ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔

”آپ آگئے..... کیا بنا؟“ انہوں نے یونہی پوچھ لیا تھا۔ ورنہ ان کے چہرے پر پھیلی مینشن وہ پہلی ہی نظر میں دیکھ چکی تھیں۔

بیان ہو گئے..... ”کھوئے کھوئے لہجے میں کہتے ہوئے وہ ہینڈ سائینڈ ٹیبل کھول کر دیکھنے لگے۔

”کیا تلاش کر رہے ہیں.....“

”وہ میرے سگریٹ کہاں ہیں؟“

”نیچے دالی دراز میں ہیں.....“

”اگر زحمت نہ ہو تو ایک کپ چائے بنا لاؤ۔“ سگریٹ سلگاتے ہوئے انہوں نے زاہدہ چچی سے کہا۔

”جی اچھا.....“ وہ بغیر کچھ اور کہے خاموشی سے کمرے سے نکل گئیں۔ بابر شاہ کوئی عادی سموکر نہیں تھے۔ صرف شدید پریشانی کے عالم میں کبھی کبھار سگریٹ پینے لگ جاتے تھے۔

جب وہ چائے بنا کر لائیں تو کمرہ دھوئیں سے بھر ا ہوا تھا۔

”خیر تو ہے.....“ کپ سائینڈ ٹیبل پر رکھ کر وہ پریشان سے لہجے میں بولیں۔

”ہاں خیریت ہی ہے.....“ ان کے اندر کیا نوٹ پھوٹ ہو رہی تھی۔ کسی سے بھی شیر نہیں کر سکتے تھے۔ دماغ کے نیچے ادھر رہے تھے۔ عجیب سی اذیت رگ و پے میں دوڑ رہی تھی..... انہوں نے ادھ جلا سگریٹ الٹھڑے میں مسلا اور بغیر چائے سے انھ کر چلے گئے۔

”پتا نہیں کیا پریشانی ہے..... مجھے بھی نہیں بتاتے بس اکیلے ہی اذیت سہتے رہیں گے۔“ وہ بھی خود کلامی کرتی کمرے سے نکل آئیں اور لان میں بڑی اماں کے پاس آکر بیٹھ گئیں۔

”زاہدہ بچی..... یہ بابر کو آخر پریشانی کیا ہے؟“ بڑی اماں نے پوچھا۔

”کچھ نہیں پتا اماں بی..... کچھ بتاتے بھی تو نہیں ہیں۔“

”یہ آریان بتا رہی تھی..... کھینک میں کسی مریض سے ملنے کے بعد ایسے پریشان ہو گیا ہے۔“

”جی اماں..... فواد نے کھینک میں کوئی پاگل مریض لا کر رکھا ہوا ہے..... جس دن سے اس کو دیکھا ہے انہوں نے..... رات رات بھر جاگتے رہتے ہیں..... انہیں اتنا پریشان میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ کچھ میں نہیں آتا کہ آخر مسئلہ کیا ہے۔“ وہ حقیقتاً بابر شاہ کے ناقابل فہم رویے پر پریشان تھیں۔

پھر رات گئے بابر شاہ گھر میں داخل ہوئے..... سادات گھر کے آدھے مکین سو چکے تھے اور کچھ سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ زاہدہ چچی کی بے خواب آنکھیں خواب گاہ کے دروازے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ انہیں اندر آتے دیکھ کر وہ جلدی سے اٹھ بیٹھیں۔

”آپ آگئے.....“

”ہوں.....“ وہ خاموشی سے ایزی چیئر پر بیٹھ گئے۔ سگریٹ بدستوران کے ہاتھ میں سلگ رہا تھا۔

”آخر آپ اپنی پریشانی کیوں نہیں بتاتے مجھے۔“

”کیا بتاؤں.....“ بہت کمزور اور ٹوٹا ہوا لہجہ تھا ان کا۔ ”بس اتنا سمجھ لو زاہدہ آج سارے گھاؤ کھل گئے..... ٹوٹ کر بکھر گیا ہوں میں..... بہت بند باندھ رکھے تھے طوفان کے آگے لیکن..... لیکن سب کچھ بہ گیا۔“

”ہو کیا گیا..... کچھ بتائیں تو سہی۔“ زاہدہ چچی ان کے ٹوٹے ہوئے انداز پر گھبرا کر بولیں۔

”کچھ دن پہلے تمہیں میں نے بتایا تھا کہ فواد کے کھینک میں ایک مریض کو دیکھا تھا میں نے۔“

”جی ہاں..... یاد ہے مجھے..... کیا ہوا اسے؟“

”اسے کچھ نہیں ہوا..... وہ اب محض دور ہو گئی جو اسے دیکھ کر دماغ میں پیدا ہوئی تھی..... کہ اسے کہاں دیکھا ہے۔“

”تو کیا پتا چل گیا.....“

”ہاں پتا چل گیا..... پہچان لیا میں نے اسے..... یاد آ گیا مجھے کہ میں اسے کیسے جانتا ہوں۔ کہاں دیکھا تھا میں نے اسے؟“

”کون ہے وہ.....؟“ زاہدہ چچی کے لہجے میں اشتیاق سٹ آیا۔

”تم جان کر کیا کرو گی؟“ انہوں نے پہلو پچایا۔

”جس شخص کے لیے آپ اتنے پریشان ہیں وہ کوئی معمولی یا غیر اہم شخص نہیں ہو سکتا۔ میں آپ کی شریک زندگی ہوں باہر! کم سے کم مجھے تو پتا ہونا چاہئے۔“ ان کی بات کے جواب میں وہ کچھ نہیں بولے..... سگریٹ کا ایک گہرا کش لگا کر دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے انہوں نے دھوئیں کے مرغولوں پر نگاہیں نکا دیں۔ ماحول میں کچھ دیر کو ٹھہراؤ اور گھمبیری خاموشی در آئی۔

”زاہدہ بیگم! کیس سال سلسلے میں نے اس شخص کو دیکھا تھا۔ محض دو لمحوں کے لیے مگر آج تک

نہیں بھلا سکا۔“

”کمال ہے..... اتنی مختصر ملاقات اور ابھی تک یاد ہے وہ آپ کو..... اور اس کی خاطر اس قدر پریشان ہو رہے ہیں آپ.....“

”ہاں..... وہ شخص کس قدر اہم ہے میں نہیں بتا سکتا۔ بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ شخص اس ایک بندے کی ذات کی وجہ سے اس گھر کی خوشیاں جس نہیں ہوئیں۔ ہمارے سروں سے باپ کا سایہ اٹھا..... اماں بی کی آنکھوں میں آنسو آئے ایسے جواب بھی تک خشک نہیں ہوئے۔“ بابر شاہ کی بات سن کر زاہدہ چچی جیسے سناٹے میں رہ گئیں۔ بیسیوں بار اس گھر میں ڈھکے چھپے لفظوں میں اس کا تذکرہ ہوا تھا۔ اس کا نام کئی بار ان کی سماعت سے نکرایا تھا۔ وہ لرزتے ہوئے لہجے میں بولیں۔

”آپ کہیں فر..... فر جاؤ کی بات تو نہیں کر رہے!“

”ہاں زاہدہ! وہ پاگل..... کوئی اور نہیں..... وہ فر جاد ملک ہے۔ مسرت جہاں کی محبت اس کا شوہر..... بہت ٹھہرے ہوئے بے سکوت لہجے میں انہوں نے کہا۔ زاہدہ چچی دل پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئیں۔

”اور سرتی! اس کا کچھ پتا چلا..... وہ کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟“

”نہیں..... کچھ پتا نہیں چلا..... پتا چل بھی کیسے سکتا ہے جو ہمیں اس کے بارے میں بتا سکتا ہے وہ تو حواسوں میں ہی نہیں..... زاہدہ..... دعا کرو وہ ٹھیک ہو جائے۔ اس کا ٹھیک ہونا بہت ضروری ہے۔ مسرت جہاں اس گھر کی وہ دکھتی رگ ہے جو اکیس سال سے مسلسل رس رہی تھی۔ اب اس عذاب مسلسل سے جھٹکارہ مل جانا چاہئے..... بہت سزا دے چکے ہم اسے..... اور بہت کچھ تادے کما چکے ہیں ہم۔“ بابر چچا کا لہجہ ہار ماننے والوں جیسا تھا۔ وہ ایک طعنے ایک ناراضگی جو مسرت جہاں کے لیے ان کے دل میں تھی وہ تو بیٹے برسوں میں وقت کی دھول کے نیچے دب چکی تھی۔ اب صرف محبت تھی۔ اپنی اکلوتی بہن کے لیے دل میں موجود میٹھے میٹھے نرم سے جذبے تھے۔ زاہدہ چچی خاموش بیٹھی ایک بدلے ہوئے شخص کو دیکھ رہی تھی۔

”تم ہی بتاؤ زاہدہ کیا بہت بڑا گناہ تھا اس کا..... کسی کو پسند کرنا اتنا بڑا جرم تو نہیں۔ رشتہ مناسب نہیں تھا تو انکار کیا جاسکتا تھا اس طرح کہ فر جاد اور مسرت اس میں اپنے لیے ہنگ یا زیادتی محسوس نہ کرتے..... لیکن ابامیاں نے جس طرح کا رویہ فر جاد ملک کے ساتھ روا رکھا اور ہم جس طرح اس کے خون کے پیاسے ہو گئے..... یہ ان دونوں کو ہی بہت ہنگ آمیز لگا ہوگا۔ وہ بچی تھی نا سمجھ تھی عمر کی جس میزمری پر وہ کھڑی تھی وہاں ایسے خواب آنکھیں ضرور دیکھتی ہیں لیکن ہم نے اسے اپنے ہی گھر میں اجنبیت کی دیوار میں چن دیا۔ اس کے ساتھ ایسا رویہ رکھا جیسے وہ چھوٹ کی مریضہ ہو۔ اس کے ساتھ بات تک کرنی چھوڑ دی۔ ایسے حالات میں اس نے اگر انتہائی قدم اٹھالیا تو قصور دار اکیلی وہی

نہیں..... ہم بھی برابر کے شریک ہیں..... پھر سزا صرف اسی کے لیے کیوں؟“ بابر چچا آج آئینے میں اپنا اصل دیکھ رہے تھے۔ قصور اور سزا کو کوئی پر پرکھ رہے تھے کہ کون کتنا گناہ گار ہے۔ اور انہیں مسرت جہاں کے انتہائی قدم اٹھانے جانے میں اپنا قصور بھی دکھائی دے رہا تھا۔

”یہ سب اپنی جگہ ٹھیک! لیکن آپ کی پریشانی اور وہ بھی اس قدر سنگین پریشانی کی وجہ کیا ہے وہ میں سمجھ نہیں پاتی۔“

”زاہدہ! میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ فر جاد چنی طور پر بیمار شخص ہے۔ مسرت کے بارے میں ہمیں تب ہی پتا چلے گا ناں جب وہ ٹھیک ہوگا..... اور وہ..... وہ کلینک میں نکلتا ہی نہیں۔ موقع ملنے پر بھاگنے لگتا ہے..... آج بھی دو گھنٹے مسلسل تلاش کے بعد وہ کلینک کے عملے کے ہاتھ لگا اگر وہ ایسے ہی کسی دن پھر بھاگ گیا تو پھر شاید ہی ہمیں مل سکے..... اگر وہ بھیڑ میں گم ہو گیا تو تمام عمر کے لیے ہمیں تہی داماں کر دے گا۔“ بابر چچا حساس لہجے میں بولے۔

”تو آپ اس کو گھر لے آئیں.....“ زاہدہ چچی نے تجویز دی۔

”کمال ہے! ایک فیر آدمی کو..... وہ خاموش ہو گئے۔

”غیر کیوں ہے..... اس گھر کا داماد ہے وہ..... اس گھر کی بہت قیمتی متاع اس کے پاس ہے..... وہ غیر کیسے ہو گیا۔“ زاہدہ چچی کی بات ان کے دل کو لگی۔

”ہاں کہتی تو تم ٹھیک ہو..... اس گھر سے اس کا رشتہ بہت مضبوط ہے پھر وہ غیر تو نہ ہوا لیکن گھر کے باقی سب افراد.....“

”آپ کا کیا خیال ہے مسرتی کی محبت صرف آپ کے دل میں ہی جاگی ہے۔ بابر! اس گھر کا ایک ایک فرد اس کو یاد کرتا ہے۔ برطانیہ کسی..... ڈھکے چھپے انداز میں ہی کسی لیکن اس کا ذکر سب ہی کرتے ہیں۔ سوائے عارب بھائی کے..... آپ اسے گھر لے آئیں..... کسی کو اعتراض نہیں ہوگا..... سب ہی سر آنکھوں پر ہٹائیں گے اور ممکن ہے گھر کا ماحول اور اپنے ارد گرد خوشگوار چہروں کو دیکھ کر وہ بھی جلدی ٹھیک ہو جائے..... اتنا تو مجھے یقین ہے کہ وہ ایک بار اگر یہاں آ گیا تو پھر یہاں سے بھاگے گا نہیں۔“ زاہدہ چچی وثوق سے بولیں۔ بابر چچا کو لگا ان کے ذہن سے آدھا بوجھ سرک گیا ہے۔

”ٹھیک ہے! پھر دیر نہیں کرنی چاہئے میں ابھی اماں بی سے بات کرتا ہوں..... بہت جلد اسے ہم یہاں لے آئیں گے۔“ بابر شاہ مطمئن ہوئے تو انہیں اس کو جلدی لانے کی فکر پڑ گئی۔ وہ اٹھ کر اماں بی کے کمرے کی طرف چل دیئے۔

☆.....☆.....☆

چھٹی کی گھنٹی بجی آریان نے ٹھیل پر بکھری چیزیں سمیٹیں اس کا آخری پیریز فری ہوتا تھا اور وہ یہ وقت پر ٹھیل آفس میں بیٹھ کر اخبار وغیرہ کا مطالعہ کر کے گزارتی تھی۔ تھوڑی دیر میں تمام ٹیچرز وہیں آ گئیں۔ انینڈنس لگا کر سب ہی آفس سے نکلتی چلی گئیں وہ اور روبیہ بھی سکول کے گیٹ سے باہر نکل آئیں۔ سکول کے سامنے دکانوں کی ایک قطار تھی اور قدرے فاصلے پر ایک چائے کا ہوٹل تھا۔ وہ دونوں سر جھکائے چلی آرہی تھیں یہ جانے بغیر کے دو انگارہ آنکھیں مسلسل انہیں دیکھ رہی ہیں۔ پہلے روبیہ کو اپنے چہرے پر غیر محسوس سی تپش محسوس ہوئی تو اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ہوٹل کے باہر بچے ہوئے بیچ پر کالے ٹھیل میں لپٹا ہوا وہ شخص اس کے لیے بالکل انجان تھا لیکن اس کی متلاشی نظروں کی چھن روبیہ کو اپنے وجود کے اندر اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے آریان کا ہاتھ تھام لیا۔ آریان نے اس کی طرف دیکھا۔

”کیا بات ہے روبی؟“

”رینی..... وہ..... وہ شخص.....“ روبیہ نے دائیں جانب دیکھتے ہوئے کہا تو آریان اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھنے لگی۔ سیاہ کبیل میں منہ سر لپیٹے وہ شخص اس کے لیے بھی اجنبی ہی تھا۔ اس کا چہرہ تقریباً کبیل میں چھپا ہوا تھا۔ صرف آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ انہیں اپنی طرف متوجہ دیکھ کر وہ بیچ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”رینی..... وہ..... وہ اٹھ گیا ہے بیچ سے.....“ روبیہ اس کے اس طرح اٹھنے پر گھبرا گئی۔

”روبی..... تیز تیز قدم اٹھاؤ..... آج انکل بھی نہیں.....“ آریان بولی۔ روبیہ کی ساری توجہ اس سیاہ کبیل والے پر مرکوز تھی جواب دہیرے دہیرے قدم اٹھاتا اسی راستے پر آگیا تھا جدھر سے چل کر وہ آئی تھیں۔ غیر محسوس طریقے سے روبیہ اور آریان کے قدموں میں تیزی آگئی..... کمرشل ایریا ختم ہو چکا تھا اور رہائشی کالونی شروع ہو گئی۔ دو پہر کا وقت تھا..... چلچلاتی دھوپ میں سب گھروں میں تھے گلیاں تقریباً سنسان تھیں۔ وہ شخص مسلسل ان کے پیچھے آ رہا تھا۔ وہ تیز قدم اٹھاتیں تو اس کے قدموں میں بھی تیزی آ جاتی۔ وہ دھیمے قدموں سے چلتیں تو وہ بھی آہستہ آہستہ چلنے لگتا۔ لیکن ان کا درمیانی فاصلہ اب کم ہوتا جا رہا تھا۔ آریان اور روبیہ کو اب یقین ہو گیا تھا کہ وہ ان کا پیچھا کر رہا تھا۔ وہ دونوں گھبرا رہی تھیں۔

”رینی! یار کیا مصیبت ہے..... یہ کون ہے؟ اب تو ستارہ بیگم کے غنڈے بھی گرفتار ہو چکے ہیں۔“ روبیہ پریشانی سے بولی۔

”تو تم کیا سمجھتی ہو ستارہ بیگم کے پاس غنڈوں کی کمی ہے۔ چنانچہ کتنے پال رکھے ہیں حرام کی کمانی کھلا کھلا کر.....“ آریان کا خون کھولنے لگا۔ دہیرے دہیرے وہ شخص اب ان کے بے حد قریب آگیا تھا۔ روبیہ اور آریان کی تو جان ہی حلق میں اٹک گئی۔ وہ اب تقریباً بھاگنے کا سوچ رہی تھیں جب اچانک بہت نرم سی آواز آئی۔

”رانی بیٹا.....“ تیز ہوتے قدم سسٹ پڑ گئے۔ دھڑکنیں جیسے تھم سی گئیں۔ آریان کو شاید اپنی ہمت پر یقین نہیں آیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ رک نہیں تھی۔

”رانی بیٹا.....“ آواز پھر آئی اور اب کی بار آریان کے قدم رک گئے۔ اس نے گھوم کر اس سیاہ ٹھیل والے کو دیکھا۔ ایسے تو اسے صرف گھٹکر و بابا پکارتے تھے۔ پھر جیسے وہ جان گئی۔

”گھٹکر و بابا.....“ اس کے ہونٹوں سے ادا ہوا۔

”روبی..... روبی یہی ہیں میرے گھٹکر و بابا..... یہی ہیں میرے دوست، میرے ہمراز، میرے بچپن کے ساتھی..... یہی ہیں گھٹکر و بابا آپ..... آپ ٹھیک تو ہیں ناں.....“ آریان بے تابی سے ان کا ہاتھ تھام کر خود فراموشی کی سی کیفیت میں بولی۔ اس لمحے وہ یہ بھی بھول گئی کہ وہ گھر کی چار دیواری میں نہیں بلکہ گلی میں کھڑی ہے۔ روبیہ بھی خاموش کھڑی اس کو دیکھ رہی تھی۔

”رانی بیٹا! معاف کرنا تمہیں پریشان کیا..... تمہاری خیریت معلوم کرنا بھی ضروری تھا۔ بس اسی لیے چلا آیا۔ منہ اس وجہ سے چھپا رکھا ہے کہ ستارہ بیگم کے کتے پہچان نہ لیں۔“ اسی وقت ایک گاڑی ان کے قریب آرکی۔ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص نے بہت غور سے ان کی طرف دیکھا تھا۔ گھٹکر و بابا نے ایک نظر گاڑی کی طرف دیکھا۔

”بس رانی بیٹا! میں اب چلتا ہوں۔“ وہ کہہ کر تیز تیز قدموں سے چل پڑے۔ بابر شاہ گاڑی سے اتر آئے۔

”آریان بیٹا! کون ہیں یہ؟“ وہ آریان کو ان سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ چکے تھے۔

”انکل..... یہ میرے گھٹکر و بابا ہیں.....“ آریان فخریہ لہجے میں بولی۔ گھٹکر و بابا تھے ہی ایسے کہ جن سے تعلق پر وہ بجا طور پر فخر کر سکتی تھی۔

”تو رو کو انہیں! کہاں جا رہے ہیں یہ۔“ بابر شاہ تیزی سے گھٹکر و بابا کی طرف بڑھے۔

”ایک منٹ رکھیں پلین.....“ بابر شاہ کے پکارنے پر گھٹکر و بابا نے رک کر پلٹ کر ان کی طرف دیکھا اور پھر آریان کی طرف۔

”بابا! آپ گھر چلیں ہمارے ساتھ..... وہاں تفصیل سے بات کریں گے۔“ وہ بولی۔

”نہ رانی بیٹا! بی بی بے کل ہوں گی۔ وہ تو کہہ رہی تھیں غلام عباس تمہارے چوکھٹ سے جبر باہر رکتے ہی میرا انتظار شروع ہو جائے گا..... جلدی آنے کی کوشش کرنا۔ بی بی کا کہا رکھنا ہے مجھے..... میں دیر نہیں کر سکتا.....“

”گھٹکر و بابا! میں بھی تو آپ کی بی بی کی کچھ گتی ہوں۔ ناراض ہوں تو میرا نام لے دیجیے.....“

”ان کا بازو تھام کر گاڑی تک لائی تو انہیں گاڑی میں

”پھر کیا ہمیں قانونی راستے سے انہیں حاصل کرنا ہوگا۔۔۔۔۔“ بابر شاہ استغفایہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

”قانون۔۔۔۔۔“ بڑی زہر خند مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر چلی۔ ”قانون تو خود بائی جی کے تلوے چاٹتا ہے۔ یہ وردی والے جودن بھر کمزوروں پر قہر بن کر ٹوٹے رہتے ہیں۔ رات کی سیاہی میں ستارہ بیگم کے آگے یوں جھکتے ہیں جیسے نیاز مند بچہ و مرشد کے آگے۔ اپنا ایمان، اپنی عزت گردی رکھ رکھی ہے انہوں نے۔۔۔۔۔ لیکن آپ ہمت نہ ہاریں۔ کوشش کر کے دیکھتے ہیں۔ ان کی دکھتی رگ کو پکڑیں۔ شاید وہ مان جائے۔“

”کیا مطلب۔۔۔؟“

”طوائف کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ جیب دیکھ کر روپے میں روہ بدل کرتی ہے۔ جہاں نوٹ نظر آئے وہاں مسکراہٹ ہوگی اور الفت بھی۔ آپ کو ان سے سودا کرنا ہوگا۔ ممکن ہے وہ مان جائے۔“

”ہوں۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے۔ آپ ہمارے ساتھ ہی چلیے گا۔ ایک آدھ دن میں۔“

”نہیں شاہ جی! مجھے اجازت دیں۔ بی بی کو جا کر تسلی دینی ہے کہ رانی بیٹا بالکل ٹھیک ہے اور خوش بھی ہے۔۔۔۔۔ بس آپ سے التجا ہے اس کا بہت خیال رکھیے گا۔“ ٹھنکھرو بابا نے اسے اپنے بازو کے حلقے میں لے کر اس کا سر سینے سے لگایا۔ اس کی پیشانی چومی۔

”آپ کی مجبوری نہ ہوتی تو ہم مزید اصرار کرتے لیکن ایک ماں کی تکلیف کو سمجھتے ہیں۔ اس لیے آپ کو رکنے پر مجبور نہیں کریں گے لیکن آپ یہاں سے جاتے ہوئے مطمئن رہیے۔ آریان کو یہاں کوئی تنگی نہیں ہوگی۔“ بابر شاہ انہیں رخصت کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور ان کے ساتھ ہی گیٹ تک آئے۔

ٹھنکھرو بابا نے بہت گرم جوش سے بابر شاہ سے مصافحہ کیا ایک بار پھر آریان کو پیار کیا اور بھگی آٹکھیں لیے رخصت ہو گئے۔ آریان کی آنکھوں کے گوشے بھی بھیگ گئے لیکن یونہی کسی دکھ کی وجہ سے نہیں ان سے ملنے کی خوشی کی وجہ سے تھی۔

☆.....☆.....☆

دہلیز پرنگی آنکھوں میں انتظار کی ریت چھینے لگی تھی۔ دو دن سے اس نے کوئی محفل بھی انیند نہیں کی تھی۔ ستارہ بیگم جانتی تھی کہ ماما کو بیٹی کی تکلیف برداشت نہیں ہو رہی لیکن وہ ہمدردی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ یہاں ہمدردی کر کے خود ہی نقصان اٹھانے والی بات تھی۔ اس نے اگر ذرا سی بھی چاندنی کی دلجوئی کرنی تھی تو جواب میں چاندنی کی التجا اور آرزو یہی ہوتی تھی کہ اس کی بیٹی سے دستبردار

ہو جائے۔۔۔۔۔ اور ستارہ کے لیے یہ گھانٹے کا سودا تھا۔ اسی لیے اس نے چاندنی کے اس رویے کا زیادہ نوٹس نہیں لیا تھا۔ ٹھنکھرو بابا بھی کل سے غائب تھا۔ نہیں تو اسی کے ذریعے چاندنی کو سمجھا بھالیتی۔ تماش بین بار بار چاندنی کی فرمائش کر رہے تھے اور وہ اس کی ناسازی طبیعت کا بہانہ کیے جا رہی تھی۔

رات ہو گئی لیکن وہ کمرے سے باہر نہیں نکلی۔ کمرے میں ہی اندھیرا کیے بستر پر پڑی رہی۔ طبلوں پر تھاپ پڑنے لگی۔ ٹھنکھرو بیروں میں بندھنے لگے، کچکتے، مٹکتے، مہکے ہوئے سراپے ادھر سے ادھر سے آ جا رہے تھے لیکن کسی کو فرصت نہیں تھی کہ کوئی اس سے اس کا دکھ پوچھتا۔

”ایک وہ نہیں۔۔۔۔۔ تو یہاں کسی کو بھی میرا خیال نہیں۔ یہ لوگ جو میرے ارد گرد بستے ہیں۔ زندہ دل، بے فکرے لوگ۔۔۔۔۔ یہ لچکدار ڈالیوں جیسی لڑکیاں جن کی مائیں خود انہیں غیروں کی آغوش میں دھکیل کر بے غیرتی کے اس سر عام مظاہرے پر کھلکھلا کر ہنستی ہیں۔ یہاں میرا کون ہے۔۔۔۔۔ میں یہاں کس لیے ہوں۔۔۔۔۔ برسوں دامن کو بچائے میں نے کرب سہتے زندگی گزار دی اور اب اب میری بیٹی بھی ٹھنکھرو دبانہ ہے گی۔ اس کے ڈھکے چھپے ہوئے سراپے کو ہولناک نظریں برے کی طرح چھیدیں گی اور میں۔۔۔۔۔ میں کچھ نہیں کر سکوں گی۔ یا الہی! تیری اس دنیا میں کوئی جائے اماں ہے بھی یا نہیں۔۔۔۔۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔“

”بی بی۔۔۔۔۔“ اندھیرے میں آواز ابھری تو وہ تڑپ کر بستر پر اٹھ بیٹھی۔ اسی پل کمر اردشنی میں ٹہا گیا۔ مسافت میں دھول دھول ہوتا ہوا غلام عباس اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”غلام عباس! اتنی دیر کر دی تم نے۔۔۔۔۔ میں نے تمہیں بتایا بھی تھا کہ یہ انتظار نہیں ہوتا مجھ سے۔ بہت بے صبری ہوں میں۔۔۔۔۔ پھر بھی۔۔۔۔۔ پھر بھی تمہیں احساس نہیں ہوا۔۔۔۔۔ اتنی دیر لگا کر آئے۔۔۔۔۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

”بی بی۔۔۔۔۔ بی بی معاف کر دیں پر یوں نہ روئیں۔۔۔۔۔ بی بی۔۔۔۔۔ خدا را۔۔۔۔۔ چپ ہو جائیں۔“ غلام عباس نے آگے بڑھ کر اس کے پیروں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

”غلطی ہو گئی بی بی! پر رانی بیٹا کے اصرار پر مجھے وہاں کچھ دیر رکنا پڑ گیا تھا۔ میں نے اس سے کہا بھی تھا کہ بی بی خطر ہوں گی۔ پر اس نے کہا کہ میرا نام لے لینا وہ تاراض نہیں ہوں گی۔“ غلام عباس سر جھکا کر بولا۔ چاندنی نے ہر سمیٹ لیے اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو تھم گئے۔

”کیسی ہے وہ۔۔۔۔۔ ٹھیک تو ہے۔۔۔۔۔!“

”بی بی! ہماری رانی بیٹا کو تو اللہ نے انسی امان دی ہے کہ کیا کہوں۔۔۔۔۔ شاید فرشتے اگر انسانوں کے روپ میں آئیں تو وہ ایسے ہی ہوں گے جیسے وہ لوگ۔۔۔۔۔ انہوں نے رانی بیٹا کو بالکل اپنی بیٹیوں کی طرح رکھا ہوا ہے۔ اگر ہر ضرورت ہر سہولت کا خیال رکھتے ہیں۔ میں پیسے دینے لگا تو منع کر رہے تھے

کہ یہ ہماری بیٹی ہے اور اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھنا ہمارا فرض ہے۔ پر میں نے آپ کا نام لے کر اصرار کیا تو وہ خاموش ہو گئے۔“

”اچھا..... تو وہ..... وہ خوش بھی ہے۔“ چاندنی بے تاب سے بولی۔

”ہاں بی بی! بہت خوش ہے وہ بس آپ کو یاد کر کے اداس ہو گئی تھی۔ بی بی! پتا ہے وہ لوگ کیا کہتے ہیں..... آپ اطمینان رکھیں..... وہ رانی بٹیا کو بائی جی کے چنگل سے آزاد کرا لیں گے خواہ انہیں اس کے لیے کتنا ہی نقصان اٹھانا پڑے.....“ غلام عباس کی بات سن کر چاندنی کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو آ گئے۔

”مولا! تو معاف کر دینا۔ بہت تھڑ دلی ہوں میں..... تکلیف آئی تو شکوہ کر بیٹھی تھی سے حالانکہ یہ میرا مقام نہیں..... تو تو بہت بلند ہے اور میں حقیر ذرہ..... میری کیا بساط کے تجھ سے شکایت کروں۔ مجھے معاف کر دینا پالنے والے۔“ وہ دل ہی دل میں اپنے رب سے مخاطب تھی۔ سچی بات یہ تھی کہ غلام عباس کی باتیں سن کر وہ بہت حد تک مطمئن ہو گئی تھی کہ اب آریان کو بظاہر کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن ماں کبھی مکمل طور پر سکون نہیں پاسکتی سودہ بھی اس کے لیے پریشان تھی۔



PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

اماں بی اور گھر کے دوسرے افراد کے ساتھ بات کر کے باہر شاہ کافی حد تک مطمئن ہو گئے تھے۔ فرجاد کو گھر لانے کی مخالفت کسی نے نہیں کی تھی۔ البتہ عارب تایا ابھی بے خبر تھے کہ گھر میں کیا کچھڑی پک رہی ہے۔ اماں بی کے دل کا درد سوا ہو گیا تھا۔ مسرت جہاں کو اٹھارہ سال انہوں نے اپنی آغوش میں سمیٹ سمیٹ کر رکھا تھا۔ پانچ بھائیوں کے بعد کتنی منتوں مرادوں سے انہوں نے بیٹی پائی تھی۔ اس کی ہلکی سی تکلیف پر اماں بی ساری ساری رات جاگ کر گزار دیتیں۔ اس کی پرورش کے دوران وہ گھر، بچوں، میاں حتیٰ کہ اپنے آپ سے بھی غافل ہو گئی تھیں۔ وہی مسرت جہاں جوان کے گلے میں بازو ڈال کر اور ان کے بازوؤں میں جھول جھول کر فرمائشیں کیا کرتی تھی جب اس گھر کی دلہیز پار کرنے لگیں تو ایک پل کو بھی ماں کی قربانیوں، اس کی محبت کے بارے میں نہیں سوچا ہوگا۔ اگر سوچتیں تو ضرور یہ خیال بھی آتا کہ میری ماں جیتے جی مر جائے گی۔ وہ تو سادات گھر کی ساری محبتیں، ساری رفاقتیں، سارے رشتے بھول کر ایک نئی منزل کی طرف چل پڑی تھیں لیکن شبیر حسین شاہ کے لیے وہ رات ساری زندگی محیٹ ہو گئی۔ انہوں نے خود کو اس امتحان کے قابل نہ سمجھا کہ اس رات کی کالک منہ پر تھوپ کر وہ ایک با پھر دنیا کا سامنا کرتے۔ سو اس رات کی سیاحی میں ہی مدغم ہو گئے۔ ایسے خاموش ہوئے کہ پھر کبھی نہ بولے پائے..... بھری دنیا میں حقیر اور اذیت کے تیر سہنے کو اماں بی رہ گئیں۔ بیٹوں نے مسرت جہاں کے گھر سے چلے جانے کے بعد چپ سادہ لی۔ سارا جوش، ساری غیرت اپنی موت آپ مر گئی۔ وہ دنیا کے کارخانوں میں اپنے حصے کا کام کرتے رہے۔ سانس بھی لیتے رہے لیکن مسرت جہاں جو زخم ان کے دل پر لگا تھا۔ وقت بھی اس کا مرہم نہ بن سکا۔

پر اب اکیس سال بعد اس کے ملنے کی امید نظر آئی تو سارے گلے شکوے جیسے کہیں د جا سوئے۔ ایک خلش تو تھی لیکن اب وہ اتنی اذیت نہیں دیتی تھی۔ اور اماں بی..... وہ تو اپنے جگر پار سے ملنے کو اتنی بے گل ہو گئی تھیں کہ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھیں فرجاد جلدی سے ٹھیک ہو جائے۔ انہوں نے ان کی مسرت جہاں کا پتا تادے۔ وہ ایک بار اسے اپنے سینے سے لگا کر دل میں جلتی مٹا کی آگ ٹھنڈ

کر لیں۔ پھر چاہے زندگی ان سے روٹھ جائے۔ شاید وہ ابھی تک اسی امید اور اسی آرزو پر جی رہی تھیں۔ شاید پروردگار نے انہیں مہلت اسی لیے دی ہوئی تھی۔

بابر شاہ فرجاد کو کلینک سے لے آئے تھے۔ گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو فرجاد نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

”یہ کہاں لے کر آئے ہیں مجھے.....“

”آج سے تم نے یہیں رہنا ہے ہمارے پاس..... وہ کلینک والے تمہیں تنگ کرتے تھے ناں۔ تمہارے ہاتھ پیر باندھتے تھے زنجیروں سے..... تمہیں زبردستی انجکشن لگاتے تھے۔ میں اس لیے تمہیں یہاں لے آیا ہوں..... یہاں تم آزاد پھر دو گے۔ تمہارے پیروں میں کوئی زنجیر نہیں ڈالے گا۔“ بابر شاہ بات مکمل کر کے گاڑی سے نیچے اترے۔ پھر گھوم کر دوسری طرف آئے اور اس کی طرف کا دروازہ کھولا۔

”آؤ.....“ انہوں نے اسے باہر آنے کو کہا تو وہ بغیر مزاحمت کے خاموشی سے اتر آیا۔ وہ چاروں طرف دیکھ رہا تھا لیکن ان آنکھوں میں کوئی جذبہ، کوئی رنگ نہیں تھا۔ جیسے اس کے لیے یہ کوئی اجنبی جگہ نہ ہو۔ بہت مام سا انداز تھا اس کا۔ بابر شاہ کے ہمراہ وہ لان میں آگیا۔ شام کا وقت تھا سب ہی حسب معمول وہیں بیٹھے ہوئے تھے۔ اماں بی اسے دیکھ کر اضطرابی انداز میں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ بابر شاہ نے سب کو تنبیہ کی ہوئی تھی کہ اس پر ابھی اپنی یا اس کی حقیقت واضح نہ کی جائے۔ اسے بس یہاں گھر کا ماحول ملنا چاہئے۔

”اماں بی..... یہ ہیں میرے دوست..... اور دوست یہ میری اور اب تمہاری بھی اماں بی ہیں۔“ بابر شاہ نے مبہم سا تعارف کروایا۔ فرجاد بہت دھیمے قدموں سے چلتا تقدس کی اس صورت کے قریب آن رکا جنہیں بابر شاہ نے اماں بی کہا تھا۔

”اماں بی.....“ یہ لفظ اسے اپنے ہونٹوں پر بہت غیر مانوس اور اجنبی سے لگے۔ اماں بی کا لرزنا ہوا ہاتھ اس کے سر پر ایک لمحے کو ٹکا اور پھر ان کے پیلو میں جھول گیا۔ کیسی کیفیت تھی جس کا عذاب وہ اپنے دل پر سہہ رہی تھیں۔

”یہ شخص جو خود سے بھی بے گانہ ہے..... ان کی مسرت جہاں کا شریک زندگی ہے..... اس شخص کے خواب مسرت جہاں کی آنکھوں نے دیکھے..... پتا نہیں کتنا عرصہ اس شخص کے ساتھ گزارا ہوگا انہوں نے..... پتا نہیں اب کس حال میں ہوگی وہ؟“ اماں بی کو خود پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ کیسی ماں تھیں وہ جو اپنی بیٹی سے اکیس سال تک بے خبر رہیں۔ پتا نہیں یہ سال اس نے ہنس کر گزارے یا رو کر، سکھ میں بتائے یا کھ میں۔

بابر شاہ نے فرجاد کو کچھ دیر کے لیے سب کے درمیان

سے اس گھر کے داماد کو دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے تو پہلی بار دیکھا تھا۔ اچھا خاصا پنڈت سم آدی تھا وہ بس ذہنی طور پر اپ سیٹ ہونے کی وجہ سے خود سے لا پرواہ ہو گیا تھا۔ بابر شاہ نے جب دیکھا کہ فرجاد اب تنگ محسوس کر رہا ہے تو وہ اسے لے کر اپنے پورشن میں آگئے..... جہاں پہلے ہی اس کے لیے کمرہ سیٹ کیا ہوا تھا۔ اسے کمرے میں بستر پر لٹا کر زاہدہ چچی کو اس کا خیال رکھنے کا کہہ کر وہ خود کسی ضروری کام سے دوبارہ باہر نکل گئے۔

رات کو عارب تایا کو جب یہ خبر ملی کہ فرجاد ملک کو بابر شاہ گھر لے آئے ہیں تو ایک بار پھر خون کھول اٹھا۔ وہ غصے سے تن فٹن کرتے اماں بی کے پاس پہنچ گئے۔

”اماں بی..... یہ باہر آخر چاہتا کیا ہے..... کیوں سادات گھر میں کوئی ایسا طوفان لانا چاہتا ہے کہ اس آشیانے کا جناح کا بکھر جائے۔“

”کیا ہو گیا..... آرام سے بیٹھ کر بات کرو.....“

”اماں بی! پہلے ایک طوائف زادی کو زبردستی اس گھر لانے پر تھوپا اس کے بیٹے نے..... اور بجائے روک ٹوک کے الٹا سب نے اسی کی حمایت کی..... اور اب یہ فرجاد..... اس کو کس خوشی میں یہاں آنے کی اجازت دیدی گئی؟“

”وہ یہاں خود نہیں آیا..... اسے لایا گیا ہے۔“

”وہی وجہ جاننا چاہتا ہوں کہ کس لیے اسے یہاں لایا گیا۔“ عارب شاہ بلند آواز میں بول رہے تھے۔

”اس لیے کہ وہ ذہنی طور پر ٹھیک نہیں۔ اس کا ٹھیک ہونا بہت ضروری ہے۔ وہ کلینک میں ٹکنا نہیں تھا۔ مجبوراً بابر اس کو گھر لے آیا تاکہ اس کے ٹھیک ہونے پر مسرت بچی کے بارے میں پوچھا جائے کہ وہ کس حال میں ہے کہاں ہے؟“

”آخر کس لیے..... جب یہاں سے چلی گئی ہے وہ تو مرے یا جیے ہمیں اس سے کیا؟“ وہ برا فروختہ ہوتے ہوئے بولے۔

”اتنے پتھر دل مت بنو عارب! بے شک اس نے جو کیا غلط کیا لیکن اس گھر کی دہلیز چھوڑ کر چلے جانے کے باوجود وہ اب بھی یہاں حق رکھتی ہے۔ اب بھی خون کا رشتہ قائم ہے اس سے.....“

”میں ایسے رشتوں کو نہیں تسلیم کرتا جن کو نبھاتے ہوئے عزت اور غیرت کا جنازہ نکل جائے..... جس دن اس نے یہ دہلیز چھوڑی..... ہر رشتہ تو وہ خود توڑ گئی۔ کیا باپ کی غیرت، بھائیوں کی ناموس، ماں کی ممتا اس قدر بے وقت اور حقیر تھیں جنہیں وہ روند کر چلی گئی..... معاف کیجیے گا اماں بی اسے..... لیکن میں اس کے بارے میں سوچنا بھی گوارا نہیں کرتا۔“ عارب

شاہ کے لہجے میں نفرت کھلی ہوئی تھی۔ اماں بی نے ملاحتی نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

”نہ جانے عارب تمہاری فطرت کیسی ہے..... میں یا تمہارے ابا میاں تو ایسے نہیں تھے۔ اور اگر آج وہ زندہ ہوتے تو یقیناً مسرت جہاں کے لیے ان کے دل میں بھی میری ہی طرح محبت جاگ اٹھتی۔“

”وہ زندہ ہوتے تب ناں..... انہیں تو آپ کی لاڈلی خود اپنے ہاتھوں قتل کر کے گئی ہے..... اور آپ کتنی آسانی سے ایک قاتل کو معاف کر رہی ہیں۔ اس لیے کہ وہ آپ کی بیٹی ہے۔ اکیس سال تک اس گھر میں اس کا نام تک نہ لیا گیا اور اب، اب اس شخص کو جس کی وجہ سے سادات مگر طوقانوں کی پیٹ میں آیا تھا۔ اس گھر میں داماد کی حیثیت دی جا رہی ہے۔ کل کو مسرت جہاں کے لیے بھی اس گھر کا دروازہ کھل جائے گا..... سب کچھ دیر سے ہو جائے گا لیکن کیا ابا میاں کی زندگی اتنی ارزاں تھی کہ جسے بالکل نظر انداز کر دیا جائے۔ اماں بی اگر وہ اس گھر میں آئی تو میں اس گھر میں نہیں رہوں گا۔“ عارب شاہ فیصلہ کن لہجے میں کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔ اماں بی سردی آہ بھر کر رہ گئیں۔

ادھر فرجاد جب سے سادات مگر میں آیا تھا وہ بالکل خاموش ہو گیا تھا۔ زیادہ تر وہ اپنے کمرے میں ہی رہتا کبھی کبھار لان میں لٹکا تو ایک گوشے میں بیٹھا رہتا۔ کلیںک سے آنے کے بعد سے اسے دورہ بھی نہیں پڑتا تھا۔ بابر شاہ اس کی حرکات و سکنات کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ محض دو تین دنوں میں ہی اس کی آنکھوں میں کچھ چمک آگئی تھی۔ زاہدہ چچی اس کی خوراک اور دوا کا بہت باقاعدگی سے خیال رکھ رہی تھیں۔ بابر شاہ ایک دن اسے ہینر کٹنگ سیلون بھی لے گئے تھے۔ ہال ترشوانے اور شیو کروانے کے بعد اس کی شخصیت بہت نکھری نکھری لگنے لگی تھی۔ بابر شاہ نے محسوس کیا تھا کہ وہ گھر کے بڑوں کی نسبت بچوں کے درمیان بیٹھ کر خوشی محسوس کرتا ہے۔ گھر کے سب ہی بچے اور نو جوان اس کے قریب رہنے لگے تھے۔ آہستہ آہستہ فواد بھی ان میں شامل ہونے لگے۔ فرجاد ملک کے لیے یہ دنیا بہت نرالی اور اچھوتی سی تھی۔ لڑکیاں اور لڑکے سب اس کے ساتھ یوں فریک ہو گئے تھے جیسے وہ شروع سے ہی اس گھر کا ایک فرد رہا ہو۔ اس کی ذہنی کیفیت آہستہ آہستہ اعتدال پر آنے لگی تھی۔

آج سب کزنز فواد کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے اور فرجاد کو بھی اپنے پاس بٹھا رکھا تھا۔ پہلے بڑے کزنز کے درمیان بیت بازی کا مقابلہ ہوا..... کافی دیر تک شعر و شاعری ہوتی رہی پھر اپنے اپنے قصے سنانے شروع کر دیے۔ چھوٹے بچے پور ہونے لگ گئے۔

”فہدی بھائی! ہم پور ہو رہے ہیں.....“ طاہر منہ بسور کر بولا۔ بڑوں کی محفل میں انہیں کیا مزہ آتا تھا۔

”تو پھر کیا کیا جائے.....“ فواد نے مسکرا کر کہا۔

”یہ کیا جائے..... کہ ہمیں کہانی سنائی جائے۔“ باصر نے مشورہ دیا۔

”کہانی..... اوں..... جیٹا کہانی تو عرصہ ہوا پڑھنی چھوڑ دی سو یاد نہیں ہاں..... ایسا کرتے ہیں انکل سے کہتے ہیں کہ وہ تم سب کو کوئی کہانی سنائیں۔“ فواد نے فرجاد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”بالکل ٹھیک.....“ باصر چمک کر بولا اور پھر باصر، اطہر، طاہر اور حسنین نے بھی فرجاد کے گرد کیر اڑال لیا۔

”ہاں انکل ہمیں کہانی سنائیں.....“

”کہانی.....“ فرجاد نے ان سب کی طرف دیکھا۔

”جی..... ہم نے آج آپ سے کہانی سنی ہے۔ کوئی بہانا نہیں چلے گا۔“ حسنین نے کہا۔

”نادیں انکل! اور نہ یہ نمونے آپ کی جان نہیں چھوڑیں گے۔“ ایدہ نے کہا تو فرجاد نے ایک نظر سب کی طرف دیکھا۔

”ٹھیک ہے ننھے سنے دوستو! ایک کہانی یاد تو ہے مجھے لیکن تم پور تو نہیں ہو گے۔“ فرجاد نے کہا۔

”نہیں انکل ہم پور نہیں ہوں گے لیکن کہانی میں دیو ہوں گے ناں۔“ ہارر کا ولدادہ اطہر اشتیاق سے لبریز لہجے میں بولا۔

”ہاں اس کہانی میں ایک شہزادہ ہے اور ایک شہزادی۔ اور دیو بھی ہیں۔“ سب خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ فواد بہت غور سے فرجاد کو دیکھنے لگا۔ شاید وہ اس کی ذہنی کیپ اٹھانی کا جائزہ لینا چاہتے تھے۔ فرجاد نے سر جھکا لیا۔ اب صرف چھوٹے بچے ہی نہیں ایدہ، روبیہ، آریان، مہوش، شاذان سب ہی اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”یہ کہانی ایک شہزادی کی ہے ایک انتہائی خوبصورت اور پیاری سی شہزادی کی..... وہ بادشاہ کی انکوتی بیٹی تھی اور بہت لاڈ پیار میں پلی گئی۔ شہزادی کو پتا ہے کیا عادت تھی؟“

”کیا.....؟“

”وہ سادون میں جھولے جھولا کرتی تھی۔ گیت گایا کرتی تھی۔ اس کی زندگی میں خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔ رنگ ہی رنگ تھے..... پھر ایک دن اس شہزادی کی ملاقات ایک شہزادے کے ساتھ ہوئی لیکن وہ شہزادہ اس کی طرح نہ تو امیر تھا اور نہ ہی لاڈلا.....“

”انکل..... کیا شہزادے بھی غریب ہوتے ہیں.....؟“ باصر مصومیت سے بولا تو فرجاد نے مسکرا کر اس کا گال تپستیا یا۔

”ہاں! کبھی کبھی شہزادے بھی غریب ہوتے ہیں۔ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ جس مدرسے میں شہزادی پڑھنے جاتی تھی شہزادہ بھی اسی مدرسے میں پڑھتا تھا۔ شہزادے کو شہزادی کی پیاری پیاری صورت اور اس

کا بھولیں بہت اچھا لگا وہ اس سے چپکے چپکے پیار کرنے لگا۔

”انکل ہمیں تو نہیں پتا پیار کیسے ہوتا ہے؟“

”جب بڑے ہو گئے تو سمجھ جاؤ گے۔ فی الحال چپ کر کے کہانی سنو۔“ شاذان نے اظہر کے سر پر ہلکی سی چیت لگائی۔

”ایک دن موقع پا کر شہزادے نے شہزادی کو بتا دیا کہ وہ اسے بہت چاہتا ہے۔ شہزادی پہلے تو بہت گھبرائی، کسمپاسی لیکن آخر کار اس نے شہزادے کی محبت قبول کر لی۔ پھر وہ ایک دوسرے سے ملنے لگے۔ شہزادی کا باپ بہت سخت بادشاہ تھا۔ شہزادی اس سے ڈرتی بھی بہت تھی لیکن شہزادے کی محبت کی وجہ سے اس میں کچھ ہمت آ گئی۔ اس نے شہزادے سے کہا کہ وہ بادشاہ سے اس کا ہاتھ مانگ لے۔“

”اس کا بھلا کیا مطلب ہوا؟“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ بادشاہ سے درخواست کرے کہ وہ شہزادی کی شادی اس کے ساتھ کر دے۔“

”تو کیا بادشاہ نے ان دونوں کی شادی کر دی۔“ ظاہر غفلت میں بولا۔

”تم سچ میں ناگ نہ اڑاؤ تو شاید ہو جائے۔ ظالم سماج کی طرح بار بار سامنے آ کھڑے ہوتے ہو۔“ شاذان ظاہر کے منہ پر ہاتھ رکھ کر بولا تو فرجاد نے مسکرا کر دونوں کی طرف دیکھا۔

”نہیں بیٹا! ان کی شادی نہیں ہو سکتی تھی شہزادی امیر تھی اور شہزادہ غریب۔ پھر بھی شہزادے سے بادشاہ سے کہا کہ وہ شہزادی کو ہر طرح خوش رکھ سکتا ہے۔ پر بادشاہ نے شہزادے کو دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیا۔ شہزادی کے پانچ بھائی جو اصل میں دیوتے تھے وہ اس شہزادے کے دشمن ہو گئے۔ شہزادہ اپنے گھر چلا گیا چپ چاپ لیکن شہزادی کو بادشاہ کے رویے پر بہت دکھ تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ شہزادے کے ساتھ چلی جائے گی اپنا محل اور ساری دولت چھوڑ کر۔“ فرجاد کی نگاہیں دور خلاؤں کے پار جیسے کسی نقطے پر مرکوز تھیں۔ باہر سے گزرتے ہوئے بابر شاہ وہیں کھڑکی کے قریب رک گئے تھے۔

”پھر کیا ہوا انکل۔ کیا شہزادے کو دیوؤں نے مارا؟“

”نہیں۔ شہزادہ ان کے ہاتھ ہی نہیں آیا لیکن انہوں نے شہزادی پر ظلم ڈھانے شروع کر دیے۔ ایک دن شہزادی تنگ آ کر اپنا سب کچھ چھوڑ کر شہزادے کے پاس چلی گئی۔“

”واہ یہ ہوئی تاباں بات۔ بڑی بہادر شہزادی تھی۔“ شاذان خوش ہو کر بولا۔

”ہاں شہزادی بہت بہادر اور حوصلے والی تھی۔ شہزادے نے اس شہزادی کا ملک چھوڑ دیا اور اسے لے کر ایک دوسرے ملک میں اپنے ایک دوست کے پاس چلا گیا۔ وہاں جا کر شہزادے نے ایک چھوٹا

ساگر بنایا اور اپنے دوست کے ساتھ کاروبار کرنے لگا۔ ان دونوں کی زندگی میں بہت سکون تھا۔ اور پھر جب انہیں یہ پتا چلا کہ ان کے گھر ایک اور ننھا شہزادہ یا شہزادی آنے والا ہے تو وہ دونوں خوشی سے پاگل ہو گئے۔ شہزادہ جی جان سے اس کا خیال رکھتا تھا۔ وہ تھی ہی اتنی پیاری۔ لیکن شہزادے کا دوست درپردہ اس کا دشمن بننا چلا گیا۔ اس کی نیت شہزادے کی دولت پر بھی تھی اور شہزادی پر بھی۔ پھر جب ایک دن وہ کام کے سلسلے میں کسی دوسرے ملک گئے ہوئے تھے۔ شہزادے کے دوست نے سیر کا پروگرام بنایا اور پھر جب سیر کرنے کے لیے وہ کسی پہاڑی علاقے میں گئے تو شہزادے کے دوست نے اسے پہاڑ سے دھکادے دیا۔“

”تو کیا شہزادہ مر گیا اور انکل۔۔۔۔۔ اس ننھے ننھے شہزادے کا کیا بنا۔“ انا جو بڑی محویت سے سن رہی تھی اسے کہانی میں یہیں دلچسپی محسوس ہوئی۔ فواد اس سارے دور اپنے میں نہایت خاموشی سے فرجاد کا جائزہ لیتے رہے۔

”پتا نہیں شہزادہ مر گیا یا بچ گیا۔۔۔۔۔ یہ بھی نہیں پتا کہ ننھا شہزادہ تھا یا شہزادی۔ شہزادے کو تو اپنی شہزادی کی بھی خبر نہیں ہوگی کہ وہ کس حال میں ہوگی۔“ بات ختم کر کے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”انکل کہاں جا رہے ہیں آپ۔۔۔۔۔“

”میں۔۔۔۔۔ میں جا رہا ہوں۔۔۔۔۔ میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔۔۔۔۔“ وہ یکدم ہی ڈسٹرب نظر آنے لگا تھا۔ اس کے کمرے سے نکلنے کے بعد بہت آہستہ سب ہی اٹھ کر چلے گئے تو بابر شاہ اندر داخل ہوئے۔

”فہدی۔ کیا ہو رہا تھا بیٹا۔“ وہ کہتے ہوئے فواد کے قریب ہی بیٹھ گئے۔

”ابو۔۔۔۔۔ کچھ خاص نہیں اصل میں انکل جب سے آئے ہیں بالکل خاموش خاموش سے رہتے ہیں۔ سو ان کو ذرا انجوائے کرانے مل بیٹھے تھے کہ شاید ماحول کی خوشگواریت ان کی سوگواری کو کم کر دے۔“

”تو اس نے تم لوگوں کے ساتھ گفتگو میں حصہ لیا یا نہیں۔“

”بچوں کو ایک کہانی سنائی بس۔“

”اس کے بولنے سے کچھ اندازہ لگایا تم نے۔“ بابر شاہ نے پوچھا۔

”جی ابو! وہ نامکئی قانیو پرسٹ ٹھیک ہو چکے ہیں بس ایک محض خول سا ہے جو انہوں نے اپنے ارد گرد چڑھا رکھا ہے۔ جب یہ خول بھی ٹوٹ گیا تو سمجھیں بالکل ٹھیک ہو جائیں گے انشاء اللہ اور دنیا بہت جلد ہوگا۔“ فواد نے یقین لہجے میں بولے۔ اس کی کہانی بچوں کے لیے تھی لیکن فواد کو بہت سے کلیوں گئے انہیں لگایا اس کی اپنی کہانی تھی۔

گو یا فرجاد کے ساتھ جو حادثہ پیش آیا اس کا ذمہ دار اس کا دوست ہے اور پچھو کے ساتھ جانے اس نے کیا سلوک روا رکھا ہوگا۔ کیا خبر وہ زندہ بھی ہیں یا۔۔۔ فواد اس سے آگے نہ سوچ سکے۔

”تم کس سوچ میں گم ہو گئے؟ میں تمہیں یہ بتانے آیا تھا کہ ایس بی صاحب دو تین دنوں کے لیے لاہور جا رہے ہیں، اپنے آفیشل کام کے سلسلے میں اور انہوں نے ہمیں بھی ساتھ جانے کو کہا ہے تاکہ آریان والا معاملہ بھی لگے ہاتھوں نمٹا لیا جائے۔“ بابر شاہ نے ظاہر ہی نہ کیا کہ وہ فرجاد کی ساری کہانی سن چکے تھے اور مسرت جہاں کے معاملے میں بھی قدرے مایوس تھے۔ اس لیے کہ فرجاد اب ٹھیک ہو بھی جاتا تو انہیں مسرت جہاں کے بارے میں شاید کچھ نہ بتا پاتا۔ بہر حال یہ تو بعد کی باتیں تھیں پہلے جو مسئلہ ان کے سامنے تھا اس کا حل بہت ضروری تھا۔

”تو ٹھیک ہے ابو چلے چلتے ہیں ان کے ساتھ۔۔۔۔۔“ فواد نے بھی ہائی بھری۔۔۔۔۔ رات میں اماں بی کے کمرے میں جب بابر شاہ نے یہی بات تفصیل سے بتائی تو اظہر شاہ بھی ان کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئے۔ اماں بی خوش تھیں کہ آریان کی طرف اب میلی لگائیں نہیں انھیں گی۔ اب وہ ایک گھر کی چار دیواری میں محفوظ ہوگی۔

”اماں بی آریان کے ساتھ ساتھ اس کی والدہ کا بھی رہائی پانا ضروری ہے ورنہ یہ آزاد ہونے کے باوجود کبھی خوش نہیں رہ سکے گی۔“ بابر شاہ نے کہا۔

”اور ابو دوسری بات یہ ہے کہ وہ بھی اس کی طرح بے گناہ ہیں، وہ کوئی پیشہ ور نہیں ہیں۔ ستارہ بیگم ان کی مجبوری کا سودا کرتی رہی ہے۔۔۔۔۔“ فواد نے کہا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ اب ستارہ بیگم سے دو دو ہاتھ کرنے ہیں۔“ اظہر شاہ جوش سے بولے۔ علی الصبح وہ تینوں جانے کو تیار کھڑے تھے۔ سبھی گھر والے انہیں رخصت کرنے گیٹ تک آئے۔ اماں بی نے تینوں کے سروں پر شفقت سے ہاتھ پھیرا، چیشانی چومی اور دعائیں دیں۔ آریان اماں بی کے کندھے سے لگی کھڑی تھی۔ فواد اماں بی سے پیار وصول کرنے کے بعد جانے کے لیے پلٹے پھر کچھ سوچ کر رک گئے۔۔۔۔۔ رخ موڑ کر شریر نظروں سے آریلن کی طرف دیکھ کر بولے۔

”مانا کہ آپ دعائیں نہیں دے سکتیں لیکن دعا کر تو سکتی ہیں۔“ آریان جھینپ گئی۔

”میں دعا کروں گی۔۔۔۔۔“

”بہت بہت شکریہ۔۔۔۔۔ بڑی نوازش۔۔۔۔۔“ لہجہ شرارتی اور آنکھوں میں جھلملاتی جوت۔ آریان نے خود کو اماں بی کے پیچھے چھپانے کی کوشش کی۔

”اب آ جاؤ۔۔۔۔۔ ایس بی صاحب ہمارے انتظار میں بیٹھے نہیں رہیں گے۔۔۔۔۔ فلائٹ میں بہت کم وقت رہ گیا ہے۔“ اظہر چچا نے ہانک لگائی تو وہ مسکراتے ہوئے سب کو خدا حافظ کہہ کر گیٹ سے باہر نکل

گئے۔ آریان جانتی تھی کہ وہ ناممکن کو ممکن بنانے نکلے ہیں۔ اماں بی کے ہاتھ میں تسبیح کے دانے اوپر تلے گر رہے تھے اور ہونٹوں پر جانے والوں کے لیے ڈھیروں دعائیں۔

”الٹی۔۔۔۔۔ تو جانتا ہے میرے بچے ایک نیک کام کی تکمیل کے لیے گھر سے نکلے ہیں۔ تیرا حکم ہے برائی کو روکو، زبان سے ہاتھ سے کسی بھی طرح اور میرے بچے برائی کو روکنے کی خواہش لے کر گئے ہیں۔ مولا! تو ان کی مدد کرنا۔۔۔۔۔ اس بچی کی عزت کا اب تو ہی محافظ ہے۔“ وہ زیر لب بڑبڑاتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ آریان بھی باقی سب کے ساتھ واپس ہوئی تھی یہ اور بات کہ اس کا رواں رواں فواد، بابر شاہ اور اظہر شاہ کی کامیابی کے لیے دعا گو تھا۔

لاہور پہنچ کر ایس بی صاحب ان تینوں کے ہمراہ پہلے اپنی عارضی قیام گاہ گئے جہاں انہوں نے ان تینوں کی رہائش کا بندوبست کروایا اور پھر سب ہی فریش ہو کر لاہور کے ایس بی زاہد صاحب کے آفس چل پڑے۔ وجہ یہ تھی کہ کامران صاحب سرکاری دورے پر تھے اس لیے انہوں نے اپنے ریست نام میں ان کا معاملہ دیکھنا تھا۔ سو وقت ضائع کئے بغیر وہ انہیں اپنے ہمراہ لے کر زاہد صاحب کی طرف آ گئے۔ وہاں ان کا بہت اچھی طرح استقبال کیا گیا۔ زاہد صاحب پولیس میں ہونے کے باوجود خاصی خوشگوار طبیعت کے مالک تھے۔

”زاہد بھائی! ہم ایک بہت اہم معاملے پر آپ سے ڈسکس کرنا چاہ رہے تھے اسی لیے آپ دیکھ رہے ہیں کہ ابھی لاہور پہنچے ہیں اور بغیر ریست کئے آپ کی طرف آ گئے۔“ کامران نے بات شروع کی۔

”اس کا مطلب ہے کوئی بہت اہم مسئلہ ہے۔۔۔۔۔“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ بہت اہم اور انتہائی نازک بھی لیکن آپ کی پہنچ میں ہے۔ آپ چاہیں تو سلجھ جائے گا۔“ کامران بہت اچھے طریقے سے انہیں اپنے ٹریک پر لا رہے تھے۔

”ارے یار جب اپنی پہنچ میں ہے تو پھر پریشانی کا بہنے کی۔۔۔۔۔ جلدی سے بتاؤ۔“ زاہد صاحب سیدھے کرسی پر ہو بیٹھے۔ کامران نے ساری بات ان کے گوش گزار کر دی۔

”ہوں۔۔۔۔۔ میرے بھائی معاملہ بڑا ٹیڑھا ہے۔۔۔۔۔ بڑے سبب سے حل کرنا پڑے گا۔ ستارہ بیگم کا نام تو بڑے اونچے اسٹینس کے لوگوں میں لیا جاتا ہے، بڑی مضبوط معاشرتی ساکھ رکھتی ہے وہ۔۔۔۔۔ اس پر ہاتھ ڈالنا اتنا آسان نہیں۔“ زاہد صاحب سنجیدگی سے بولے۔

”کیا مطلب؟ کیا پولیس اس معاملے میں کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی۔“

”ارے بھائی میرے! پولیس کا خیال تو تم اپنے ذہن سے نکال ہی دو۔۔۔۔۔ قانون اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ ہم اس پر ہاتھ ڈال بھی دیں تو اس کا مخبر ایک فون پر رہے تھانے کے عملے کی

گو یا فرجاد کے ساتھ جو حادثہ پیش آیا اس کا ذمہ دار اس کا دوست ہے اور پھپھو کے ساتھ جانے اس نے کیا سلوک روا رکھا ہوگا..... کیا خبر وہ زندہ بھی ہیں یا..... فواد اس سے آگے نہ سوچ سکے۔

”تم کس سوچ میں گم ہو گئے؟ میں تمہیں یہ بتانے آیا تھا کہ ایس پی صاحب دو تین دنوں کے لیے لاہور جا رہے ہیں، اپنے آفیشل کام کے سلسلے میں اور انہوں نے ہمیں بھی ساتھ جانے کو کہا ہے تاکہ آریان والا معاملہ بھی لگے ہاتھوں نمٹا لیا جائے۔“ بابر شاہ نے ظاہر ہی نہ کیا کہ وہ فرجاد کی ساری کہانی سن چکے تھے اور مسرت جہاں کے معاملے میں بھی قدرے مایوس تھے۔ اس لیے کہ فرجاد اب ٹھیک ہو بھی جاتا تو انہیں مسرت جہاں کے بارے میں شاید کچھ نہ بتا پاتا۔ بہر حال یہ تو بعد کی باتیں تھیں پہلے جو مسئلہ ان کے سامنے تھا اس کا حل بہت ضروری تھا۔

”تو ٹھیک ہے ابو چلے چلتے ہیں ان کے ساتھ.....“ فواد نے بھی ہامی بھر لی..... رات میں اماں بی کے کمرے میں جب بابر شاہ نے یہی بات تفصیل سے بتائی تو اظہر شاہ بھی ان کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئے۔ اماں بی خوش تھیں کہ آریان کی طرف اب پہلی نگاہیں نہیں اٹھیں گی۔ اب وہ ایک گھر کی چار دیواری میں محفوظ ہوگی۔

”اماں بی آریان کے ساتھ ساتھ اس کی والدہ کا بھی رہائی پانا ضروری ہے ورنہ یہ آزاد ہونے کے باوجود کبھی خوش نہیں رہ سکے گی۔“ بابر شاہ نے کہا۔

”اور ابو دوسری بات یہ ہے کہ وہ بھی اس کی طرح بے گناہ ہیں، وہ کوئی پیشہ ور نہیں ہیں۔ ستارہ بیگم ان کی مجبوری کا سودا کرتی رہی ہے.....“ فواد نے کہا۔

”ہاں..... اب ستارہ بیگم سے دو دو ہاتھ کرنے ہیں۔“ اظہر شاہ جوش سے بولے۔ علی الصبح وہ تینوں جانے کو تیار کھڑے تھے۔ سبھی گھروالے انہیں رخصت کرنے گیٹ تک آئے۔ اماں بی نے تینوں کے سروں پر شفقت سے ہاتھ پھیرا، پیشانی چومی اور دعائیں دیں۔ آریان اماں بی کے کندھے سے لگی کھڑی تھی۔ فواد اماں بی سے پیار وصول کرنے کے بعد جانے کے لیے پلٹے پھر کچھ سوچ کر رک گئے..... رخ موڑ کر شریر نظروں سے آریاں کی طرف دیکھ کر بولے۔

”ماما کہ آپ دعائیں نہیں دے سکتیں لیکن دعا کر تو سکتی ہیں۔“ آریان جھینپ گئی۔

”میں دعا کروں گی.....“

”بہت بہت شکریہ..... بڑی نوازش.....“ لہجہ شرارتی اور آنکھوں میں جھلملاتی جوت۔ آریان نے خود کو اماں بی کے پیچھے چھپانے کی کوشش کی۔

”اب آ جاؤ..... ایس پی صاحب ہمارے انتظار میں بیٹھے نہیں رہیں گے..... فلائٹ میں بہت کم وقت رہ گیا ہے۔“ اظہر چچا نے ہانک لگائی تو وہ مسکراتے ہوئے سب کو خدا حافظ کہہ کر گیٹ سے باہر نکل

گئے۔ آریان جانتی تھی کہ وہ ناممکن کو ممکن بنانے نکلے ہیں۔ اماں بی کے ہاتھ میں تسبیح کے دانے اوپر تلے گر رہے تھے اور ہونٹوں پر جانے والوں کے لیے ڈھیروں دعائیں۔

”الٹی..... تو جانتا ہے میرے بچے ایک نیک کام کی تکمیل کے لیے گھر سے نکلے ہیں۔ تیرا حکم ہے برائی کو روکو، زبان سے ہاتھ سے کسی بھی طرح اور میرے بچے برائی کو روکنے کی خواہش لے کر گئے ہیں۔ مولا! تو ان کی مدد کرنا..... اس بچی کی عزت کا اب تو ہی محافظ ہے۔“ وہ زیر لب بڑبڑاتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ آریان بھی باقی سب کے ساتھ واپس ہوئی تھی یہ اور بات کہ اس کا رواں رواں فواد، بابر شاہ اور اظہر شاہ کی کامیابی کے لیے دعا گو تھا۔

لاہور پہنچ کر ایس پی صاحب ان تینوں کے ہمراہ پہلے اپنی عارضی قیام گاہ گئے جہاں انہوں نے ان تینوں کی رہائش کا بندوبست کروایا اور پھر سب ہی فریش ہو کر لاہور کے ایس پی زاہد صاحب کے آفس چل پڑے۔ وجہ یہ تھی کہ کامران صاحب سرکاری دورے پر تھے اس لیے انہوں نے اپنے ریٹ نام میں ان کا معاملہ دیکھنا تھا۔ سو وقت ضائع کئے بغیر وہ انہیں اپنے ہمراہ لے کر زاہد صاحب کی طرف آ گئے۔ وہاں ان کا بہت اچھی طرح استقبال کیا گیا۔ زاہد صاحب پولیس میں ہونے کے باوجود خاصی خوشگوار طبیعت کے مالک تھے۔

”زاہد بھائی! اہم ایک بہت اہم معاملے پر آپ سے ڈسکس کرنا چاہ رہے تھے اسی لیے آپ دیکھ رہے ہیں کہ ابھی لاہور پہنچے ہیں اور بغیر ریٹ کئے آپ کی طرف آ گئے۔“ کامران نے بات شروع کی۔

”اس کا مطلب ہے کوئی بہت اہم مسئلہ ہے.....“

”جی ہاں..... بہت اہم اور انتہائی نازک بھی لیکن آپ کی پہنچ میں ہے۔ آپ چاہیں تو سلجھ جائے گا۔“ کامران بہت اچھے طریقے سے انہیں اپنے ٹریک پر لا رہے تھے۔

”ارے یار جب اپنی پہنچ میں ہے تو پھر پریشانی کا ہے کی..... جلدی سے بتاؤ۔“ زاہد صاحب سیدھے کرسی پر ہو بیٹھے۔ کامران نے ساری بات ان کے گوش گزار کر دی۔

”ہوں..... میرے بھائی معاملہ بڑا ٹیڑھا ہے..... بڑے سجاؤ سے حل کرنا پڑے گا۔ ستارہ بیگم کا نام تو بڑے اونچے اسٹینڈ کے لوگوں میں لیا جاتا ہے، بڑی مضبوط معاشرتی ساکھ رکھتی ہے وہ۔ اس پر ہاتھ ڈالنا اتنا آسان نہیں۔“ زاہد صاحب سنجیدگی سے بولے۔

”کیا مطلب؟ کیا پولیس اس معاملے میں کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی۔“

”ارے بھائی میرے! پولیس کا خیال تو تم اپنے ذہن سے نکال ہی دو..... قانون اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ ہم اس پر ہاتھ ڈال بھی دیں تو اس کا محض ایک فون پورے تھانے کے عملے کی

ہیشیاں اتر داسکتا ہے۔۔۔۔۔

”تو پھر۔۔۔۔۔“ کامران شش و پنج میں مبتلا ہو کر بولے۔

”تو پھر یہ کہ اس کو کسی قسم کی دھمکی دینے کی بجائے۔۔۔۔۔ اس پر کوئی دباؤ ڈالنے کی بجائے اس سے طریقے سے بات کرنی ہوگی۔“ زاہد صاحب نے کہا

”وہی تو پوچھ رہے ہیں وہ کون سا طریقہ ہے۔“ فواد پہلی بار بولے۔ باہر شاہ اور اظہر اس تمام وقت میں خاموش رہے۔

”یہ اس طرح کہ ہمیں خود کو اس کے رنگ میں رنگ کر اس سے ملاقات کرنی ہوگی، ہم ایک خریدار کی حیثیت سے اس سے متعارف ہوں گے، بعد میں آہستہ آہستہ اس کو اپنی لائن پر لے آئیں گے۔“

”لگتا ہے ستارہ بیگم کی بڑی دہشت ہے لاہور میں۔“ اظہر شاہ طر سے بھرپور لہجے میں بولے۔ انہیں ایس پی زاہد جیسے عہدیدار کے منہ سے ایک طوائف کے بارے میں اس طرح کی باتیں اچھی نہیں لگیں۔

”دیکھئے جناب! ہم اس سے ڈرتے نہیں لیکن مصلحت سے کام لیتے ہیں، ہم اس پر دباؤ ڈالنا چاہیں تو ڈال سکتے ہیں لیکن جواب میں کیا ہوگا۔ کسی وزیر کی مشیر کا بھانجا، بھتیجا، بیٹا اس کے ہاں آنے جانے والا چند لکھوں میں ہی اس کی جان چھڑو دے گا۔ یہ ایک جمن ہے میرے بھائی۔ بڑے بڑے عہدیداروں اور کوٹھے والوں کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے اس لیے یہاں مصلحت سے کام لینا ہماری مجبوری ہے۔ بہر حال آپ کامران کے ساتھ آئے ہیں سو میرے لیے انتہائی محترم ہیں۔ میری کوشش یہی ہوگی کہ پہلی فرصت میں آپ کا کام کیا جائے جس کی خاطر آپ اتنی دور سے یہاں آئے۔“

زاہد صاحب اظہر شاہ کے طر کو نظر انداز کر کے بہت دھیمے لہجے میں بولے۔

”تو بھائی اس مسئلے پر اب کرنا کیا ہے؟“ کامران نے سوال کیا۔

”کامران آج تو دو تین بہت ضروری کام ہیں۔۔۔۔۔ کل شام دو چار سول پکڑوں میں پولیس والوں کے ہمراہ وہاں چلے چلیں گے، ماحول بھی دیکھ لیں گے اور مناسب وقت دیکھ کر ستارہ بیگم سے بات بھی کر لیں گے۔“

”پھر ہم چلیں۔۔۔۔۔“ کامران اٹھے تو فواد، باہر شاہ اور اظہر شاہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

”ایز بولا ٹیک۔۔۔۔۔ لیکن کل شام تیار رہنا۔“ سب سے باری باری مصافحہ کرتے ہوئے انہوں نے کامران سے کہا تو سر ہلاتے ہوئے ان تینوں کے ہمراہ آفس سے باہر نکل آئے۔ باہر شاہ اس دوران کچھ نہیں بولے تھے لیکن سوچوں کا ایک طویل آسمان تھا جس پر ان کا تخیل محو پرواز تھا۔

☆.....☆.....☆

آج کا دن اپنے جلو میں بہت سی الجھل لیے آیا تھا۔ ستارہ بیگم کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ شہر کے ایس پی صاحب آج اس کے دولت کدے کو رونق بخشنے آرہے تھے۔ صبح انہوں نے فون کر کے اپنی آمد کا بتا دیا تھا اور ستارہ بیگم اچھی طرح جانتی تھی کہ ان اونچے لوگوں کو کس طرح مٹھی میں کیا جاتا ہے۔

”ارے مھنگرو! جاؤ رانیلو کی طرف۔“ سمجھا دیا اسے کہ آج کسی تماش بین نے نہیں آنا۔ کوئی مجرا نہیں ہو رہا۔“ ستارہ بیگم نے پاس سے گزرتے غلام عباس کو روک کر کہا تو وہ حیران سے ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

”بڑی بائی جی! یہ کیسے ہو سکتا ہے برسوں پرانا اصول ٹوٹ جائے گا۔ لوگ ہمارے کوٹھے کا رخ کرنا چھوڑ دیں گے۔“ غلام عباس نے کہا۔

”ارے ہم نے یہ اس لیے کہا کہ کوئی عام تماش بین نہ آئے۔ آج خاص پروگرام ہے صرف خاص بندوں کے لیے سمجھا کیا۔“ ستارہ بیگم کا معنی خیز لہجہ ان کی سمجھ میں آ گیا۔

”ٹھیک ہے بائی جی میں جا کے کہہ دیتا ہوں۔“ غلام عباس بیرونی سیڑھیوں کی طرف لپکے۔ نیلو کہنے کو تو اس بازار میں ایک پھولوں والی تھی لیکن کس کوٹھے پر کیا ہو رہا ہے۔۔۔۔۔ کس طوائف کا لیا چکر ہے اور کون یہاں سے فرار ہونے کو پر تول رہی ہے، اسے سب خبر ہوتی تھی۔ اب بھی یہ خبر اس نے منٹوں میں سارے بازار میں پھیلا دینی تھی اور نتیجہ ستارہ بیگم کی مرضی کے مطابق ہی نکلتا تھا۔ سو اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اس نے چند دن کو بلا کر کوٹھے کی صفائی، ستھرائی، تزئین و ترتیب اس کے ذمے لگائی۔ سمجھو اس کوٹھے کا پرانا سا ہو کا ر تھا۔ خاص شہرت کی ساری سپلائی وہی کیا کرتا تھا۔ ستارہ بیگم نے اسے بھی فون کر دیا۔ آج کی شام وہ کسی طور بھی ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ سو اپنی طرف سے کیل کانتوں سے لیس ہو کر میدان میں اترنے کی تیاری کر رہی تھی۔ چاندنی کے کمرے میں آ کر ایک ہل کو رک کر اس نے ادھر ادھر کا جائزہ لیا۔

”چاندنی! تیرے کو کیا ہے ری۔۔۔۔۔ کیوں منہ سر پینے پڑی ہے؟“ چاندنی کو بستر پر دراز دیکھ کر وہ بولی لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”شام میں ایس پی صاحب آرہے ہیں چند خاص مہمانوں کے ساتھ۔ محفل میں کسی چیز کی کمی نہیں ہونی چاہئے۔۔۔۔۔ بستر چھوڑ اور تیاری کر۔۔۔۔۔ چل اٹھ شاہاش۔“

”بائی جی! آج میں محفل نہیں کر سکوں گی۔۔۔۔۔ دو تین دن سے مجھے شدید بخار ہو رہا ہے۔“ چاندنی نے اسے ٹالنا چاہا۔

”نہ چاندنی! ایسا نہ کر۔۔۔۔۔ اس نے کہا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے دوبارہ بولی۔“ چل ٹھیک ہے

زیادہ نہیں پر ایک گیت تو تجھے گانا پڑے گا۔ ایس پی مٹھی میں آگیا تو سمجھ لاہور پر راج ہو جائے گا ہمارا۔ دوسرے کٹھنوں والے جلسے کے۔ ستارہ بیگم خلا میں نظر میں جماتے ہوئے بولی۔

”اچھا.....“ چاندنی آزرہ لہجے میں بولی۔ ایک طویل عرصہ ہو چکا تھا اسے یونہی اپنی ممتا کا خون کرتے ہوئے۔ ستارہ بیگم ماں نہیں تھی..... بہن نہیں تھی..... کسی کی بیٹی نہیں تھی..... بس ایک طوائف تھی۔ بھلا وہ ایک ماں کے جذبات و احساس کو کیا سمجھتی اور چاندنی کی مجبور ممتا ستارہ بیگم کی خواہشات کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی تھی۔ وہ چپ چاپ سب حکم ماننی رہی تھی صرف اس لیے کہ اس کا کوئی قدم اس کی معصوم بیٹی کے راستے میں کانٹے نہ بچھا دے لیکن شاید وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا ایسی جگہ پر قیام اس کی بیٹی کی زندگی کا ایک حصہ ہے وہ چاہنے کے باوجود بھی اس کی پہچان بن گئی تھی۔ اس کی جدائی کا زہر پیچھے چیتے اس کی روح نیلی ہو گئی تھی لیکن ستارہ بیگم ایک چیل تھی اور آریان ایک ننھا سا چوزہ..... جب تک وہ کسی محفوظ جائے پناہ پر نہیں پہنچ پاتی اسے چین کیسے آسکتا تھا۔ غلام عباس نے اس کی تسلی تو کر دی تھی لیکن پھر بھی وہ اپنی ممتا کے ہاتھوں مجبور تھی اور پچھلے دو چار دنوں سے بس اس کا ذہن سوچوں کی انہی بھول بھلیوں میں سفر کرتے کرتے تھک گیا تھا۔ وہ اس ماحول سے فرار چاہتی تھی۔ کسی ایسی جگہ چلی جانا چاہتی تھی جہاں اس کے ماتھے کا یہ سیاہ داغ لوگوں کی نظروں میں نہ آتا۔

ستارہ بیگم کمرے سے نکل گئی تو چاندنی بستر پر اٹھ بیٹھی۔ دائیں طرف دیوار میں لگے قد آدم آئینے میں اس نے اپنے منہ پر سراسرے پر بھر پور نگاہ ڈالی، بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں اپنی چمک اور رعنائی تقریباً کھو چکی تھیں۔ سیاہ گھنیری زلفوں کے بیچ کہیں کہیں سفید چاندی کے تار دکھائی دے رہے تھے۔ حوادث زمانہ نے اس کی صبح پیشانی پر چند ریکھائیں کھینچ ڈالی تھیں۔ وہ پھٹکی سی ہنسی ہنس دی۔

”گویا میری سزا اب ختم ہونے والی ہے، چڑھتے سورج کے پجاریوں کو ڈھلتے ہوئے سورج کی پھٹکی روشنی کہاں بھا سکتی ہے۔“ وہ دل میں خود سے مخاطب تھی۔ اس کی چمک ماند پڑ رہی تھی اور ستارہ بیگم کی جہاندیدہ نظروں نے بھانپ لیا تھا کہ یہ چراغ اب کم روشنی دے رہا ہے سو اس کا ہم البدل اس نے آریان میں تلاش کر لیا۔

”تمہاری سزا ختم نہیں ہوئی چاندنی بی بی بس اس کی نوعیت بدل گئی ہے۔“ چاندنی کے دماغ نے سرگوشی کی۔

”کیا مطلب؟“ وہ جیسے تڑپ اٹھی۔

”ہاں! اصل سزا تو اب شروع ہوئی ہے۔ تم سمجھ رہی ہو اس لیے اب اس کو ٹھٹھے کے ایک ستور میں تمہارے لیے تھوڑی سی جگہ بنائی جائے گی جہاں زندگی کے آخری ایام نوے فیصد طوائفوں کی طرح تم خون تھوکتے اور بیمار یوں سے مدد سر پیکار ہو کر گزر دو گی..... لیکن چاندنی! تمہاری جگہ کون لے گا.....“

آریان..... آریان لے گی تمہاری جگہ..... اس کے پیروں میں گھٹکھروں ہوں گے اور زلفوں میں پھول۔ اب تمہاری جگہ وہ تماشا بینوں کی نگلی نظروں کا سامنا کرے گی۔“ دماغ ایک حقیقت کا نشتر اس کی روح میں اتار رہا تھا اور وہ تڑپ رہی تھی۔

”نہیں! ایسا نہیں ہوگا..... میں..... میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔“

”پھر کیا کرو گی تم؟“ دماغ استہزائیہ انداز میں بولا۔

”کچھ بھی..... کچھ بھی کر گزروں گی لیکن، آریان کو یہاں سے بچاؤں گی.....“ چاندنی کرب میں ڈوبی آواز میں بڑبڑائی۔ ”میں ستارہ بیگم کی ہر بات مانوں گی۔ بس اس سے التجا کروں گی کہ آریان کا پیچھا چھوڑ دے۔ وہ جہاں ہے اسے وہیں رہنے دے، اس کے بدلے میں، میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔“ وہ مصمم ارادہ کرتے ہوئے بستر سے اٹھی، گالوں پر پھسل آنے والے بے بس آنسو بے دردی سے ہتھیلی سے رگڑ ڈالے۔ آئینے سے صرف نظر کرتی وہ کپڑوں کی الماری کی طرف بڑھی، شام کو محفل تھی تا اور اسے آنے والے خاص مہمانوں کا خاص انداز سے سواگت کرنا تھی۔ اپنے مرجھائے ہوئے پھولوں جیسے گالوں کو غارے سے تروتازہ کرنا تھا۔ اپنے سراپے کو قیامت خیز بنانا تھا، اسے بھولنا تھا کہ وہ ایک ماں ہے۔ بس وہ ایک طوائف ہے اور طوائف کبھی ماں، بہن، بیٹی نہیں ہوتی۔

سورج ڈھل چکا تھا۔ ارد گرد کے کٹھنوں پر آبادی ہونے لگی تھی۔ گھٹکھروں اور طبلے کی تھاپ ہوا کے دوش پر چکرانے لگی تھیں لیکن خلاف معمول ستارہ بیگم کا کوٹھا آج خاموشیوں کی زد میں تھا۔ ارد گرد والے آج بڑے خوش تھے کہ ستارہ بیگم کے کونٹھے کی ویرانی ان کے کٹھنوں پر رونق بڑھانے کا باعث بن گئی تھی۔ خوش تو ستارہ بیگم بھی تھی لیکن اس کی خوشی کی وجہ کچھ اور تھی۔ سارا کوٹھا آئینے کی طرح چمک رہا تھا، ہال کمرے میں سرخ قالین بچھے ہوئے تھے اور چاروں طرف دیواروں کے ساتھ ساتھ گدے بچھا کر گڈ بچھے لگائے گئے تھے۔

ہال کے وسط میں چھت پر لگے فانوس کی روشنی نے عجیب سا جادوئی تاثر بنا دیا تھا۔ آنے والے مہمانوں کی دلچسپی کا ہر طرح سے سامان کر رکھا تھا ستارہ بیگم نے..... چاندنی آج ایک طویل عرصے بعد تیار ہوئی تھی۔ سفید کنو اب کے غرارے پر سرخ قمیض پہنے بڑا سا سرخ اور سفید کنٹر اسٹ کا دوپٹہ اوڑھے لمبے بالوں کی چٹیا میں موچے کے پھول گوندھے ہوئے اور ہاتھوں، کانوں اور گلے میں پھولوں کے گہنے پہنے ہوئے وہ کوئی اپسرا لگ رہی تھی۔ ستارہ بیگم نے بڑھ کر اس کی بلائیں لیں اور بولیں۔ ”اے چاندنی تو تو اب بھی قیامت ہے ری..... تیرے کو کتنا سمجھایا۔ آج صبح لائن پر۔ ارے لگ جاتی نا دھندے سے تو دولت تیرے گھر کی باندی ہوتی، پر تو تو سودا کی جھلی رہی اسے۔ اب رانی بنیا کو سمجھا دے ہوں پراد، تیری بھیا، استاد سر، کتا، ا۔۔۔۔۔ نہہ۔۔۔۔۔ کر لے آوے گا اسے۔ ہم خود سمجھا لیں گے۔“ ستارہ

بیگم اپنی بات مکمل کر کے آگے بڑھ گئی اور چاندنی جیسے پتھر کے مجسمے کی طرح وہیں گڑی کی گڑی رہ گئی۔
 ”یہ نظریں..... یہ آدم خور نظریں کھا جائیں گی اسے..... میری بیٹی کو کھا جائیں گے یہ سب لوگ مل کر..... یہ اسے جینے نہیں دیں گے۔“ وہ سکتے کی سی کیفیت میں کھڑی تھی لیکن وجود کے اندر جیسے زلزلے برپا تھے۔ وہ مردہ قدموں سے چلتی وہاں اپنے کمرے میں لوٹ آئی، اس کی روح کسی پتے کی طرح لرزائی تھی۔

میرے مولا! میری سزا معاف کر دے..... میرے پالنے والے تو جانتا ہے ایک چھوٹی سی خطا کی تھی لوگ تو کتنے بڑے بڑے گناہ کر کے بھی تیری زمین پر گردن اکڑا کر چلتے ہیں۔ اڑے میں تو جیتے جی مرنے رہی ہوں۔ پچھتاؤں کی آگ میں جل جل کر خاکستر ہوتی رہی ہوں۔ کب تک سزا دے گا مجھے..... کب تک خزاؤں کی زد میں رہے گا میرا وجود..... اے رحیم و کریم! ایک ہی بار موت کیوں نہیں دے دیتا مجھے۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ پتہ نہیں کتنا روچکی تھی وہ کہ آنکھوں کے سوتے بھی خشک ہو گئے تھے مگر شاید اس کے آنسو بھی اس کی طرح بے قیمت تھے۔ اوپر والے کو ان آنسوؤں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ بستر پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔ سر جھکائے کسی گہری سوچ میں گم..... جب ستارہ بیگم نے دروازہ سے اندر جھانکا۔

”چاندنی! مہمان آنے والے ہیں..... تیار رہتا۔“ اس نے جواب میں نہ سراٹھایا تھا اور نہ ہی کوئی بات کی تھی۔ ستارہ بیگم بھی اس کے جواب کا انتظار کرنے کی بجائے اپنی بات کر کے ہال کمرے کی طرف جانے لگی۔ اسی پہلے بیرونی جانب سے غلام عباس آتا دکھائی دیا۔
 ”مہمان آگئے بڑی بائی جی۔“ اس نے آکر بتایا۔

ستارہ بیگم پُر جوش انداز میں تیزی سے دروازے تک آئی۔ اسی ہی صاحب کے ہمراہ چار افراد اور بھی تھے۔ ستارہ بیگم نے ان کے اندر داخل ہوتے ہی ہاتھ میں پکڑے پھول ان کے قدموں میں رکھ دیئے۔



زندگی بھی بعض اوقات کیسے کیسے رنگ دکھاتی ہے۔ جس گہری دلہیز پر پاؤں رکھنے پر اسے دھکے اور ٹھوکریں ملی تھیں جہاں کے درو دیوار نے اس کی تضحیک کی تھی جن رشتوں نے اس کی ذات کو اس کا جرم قرار دے کر تسلیم نہیں کیا تھا آج وہ ان سب کے درمیان تھا۔ ان کے قریب اتنا کہ ہر رشتے سے منسلک شخص کا قرب اسے میسر آ گیا تھا یہاں تک کہ اماں بی کی پیاسی نگاہوں میں بھی اس نے اپنے لیے ایک محبت بھرا سہا پیا تھا۔ ان سب کی توجہ اور محبتیں پا کر یقیناً وہ خود پر نازاں ہوتا لیکن اب وہ خود کو مجرم سمجھ رہا تھا۔ آج بہت دنوں بعد اسے تنہائی میسر آئی تو پتہ درا کا بنارہ اس کے سامنے کھل گیا۔ وہ تنہا رہا،

دشت سے گھبرا کر خود میں ہی پناہ ڈھونڈنے لگا۔

”وہ جو میری خاطر اس عالی شان گھرانے کی عزت قدموں تلے روند کر میرے ساتھ ہمسفری کے خواب دیکھتے ہوئے دلہیز پار گئی۔ میں نے کیا کیا اس کے لیے..... کانٹے ہی کانٹے بچھا دیئے اس کی راہوں میں۔ اپنی محبت میں اندھا ہو کر میں نے اس پر بھی زندگی تنگ کر دی۔ خدا جانے کہاں ہوگی وہ..... کس حال میں ہوگی؟ اس کی کوکھ میں پلنے والی میری نشانی اس دنیا میں سانس بھی لے پائی ہوگی یا..... پہلی بار ان سوچوں نے اس کے وجود روح کو جھنجھوڑ ڈالا۔“

یہ سب بچے جو میرے ارد گرد اپنی محبتوں کا حصار کیے ہوئے ہیں جانتے ہیں کہ میں ان کے لیے غیر نہیں۔ ان کا اپنا ہوں۔ ایک ایسا رشتہ میرے وجود سے وابستہ ہے جس سے برسوں اس گھر کے مکیںوں نے نظریں چرا لی ہیں۔ یہ بچے میرے وجود میں اسی رشتے کی آسودگی ڈھونڈتے ہیں اور میں..... میں ان سب کی محبتوں کے آگے ہارنے لگتا ہوں۔ زندگی کے روز و شب میرے لیے محض اذیت کے سوا کچھ نہیں۔ محبتیں بچپن سے میرے لیے بس ایک حسین خواب رہی ہیں شاید یہ بچے جانتے ہیں کہ میں ہر زنجیر توڑ سکتا ہوں لیکن محبت کی زنجیر نہیں توڑ سکتا۔ تبھی تو میرے پیروں میں محبتوں کی بیڑیاں ڈال دی ہیں انہوں نے..... لیکن نہیں..... مجھے ان زنجیروں کو توڑنا ہوگا اس لیے نہیں کہ ان سب کو دکھ پہنچاؤں اس لیے کہ ان سب کو ان کے ایک کشیدہ حصے سے ملانے کے لیے..... مجھے یہاں سے جانا ہوگا، میں اسے سماش کروں گا۔“

وہ خود کشاکی کے سے انداز میں بڑبڑا رہا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ اس وقت سادات نگر کے ہر مکیں کی نگاہیں اسی پر جمی ہیں۔ ہر ایک کی سوچ کا محور اس وقت اسی کی ذات ہے۔ وہ سب اس کی ذات سے ایک امید وابستہ کئے ہوئے ہیں۔ مسرت جہاں، اس گھر کا روشن چراغ جو ایک طویل عرصہ پہلے فرجاد ملک کے خانہ دل میں نیا، نکھیرنے کی چاہ لیے سادات نگر کی دیواروں کو اندھیروں کے حوالے کر گیا تھا۔ وہی مسرت جہاں جو ماں باپ کی آنکھوں کا تارہ تھیں جو بھائیوں کی جان تھیں وہی مسرت جہاں جنہوں نے محض چند دن اپنے پیار کرنے والوں کا دوسرا روپ دیکھ کر دلبرداشتہ ہو کر ایک انتہائی قدم اٹھایا تھا اور ان کے اس قدم نے شبیر حسین شاہ کی جان لے لی تھی۔ وہی مسرت جہاں آج بھی ایک کسک بن کر سادات نگر کے مکیںوں کے دلوں میں آباد تھیں۔ اور فرجاد ملک وہ واحد شخص تھا جو ان سب کو ان کے بارے میں بتا سکتا تھا لیکن یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ بھی ویسا ہی بے خبر اور لاعلم ہے جیسے وہ سب۔

کبھی کو اس کے صبح ہونے کی جلدی تھی اور وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ جب یہ سب جان لیں گے کہ وہ ٹھیک ہو چکا ہے تو ان سب کا پہلا سوال مسرت جہاں کے بارے میں ہی ہوگا اس کے دماغ میں

سوچیں کسی لاوے کی طرح پک رہی تھیں۔

”اس سے پہلے کہ سب جان جائیں کہ میری اپنی کیفیت اعتدال پر آچکی ہے۔ مجھے یہاں سے جانا ہوگا۔ جتنی محبتیں سمیٹیں تھیں سمیٹ لیں۔ جتنی رفاقت میسر آئی تھی آچکی۔ مجھ جیسے حرام نصیب کے لیے یہ تھوڑا بھی بہت زیادہ ہے۔ میری منزل سادات مگر نہیں، مسرت جہاں کا حصول ہے، اسے پا کر ان سب سے ملا کر ہی میں اپنی اور سب کی نظروں میں سرخرو ہو سکوں گا۔ جانے اتنے طویل عرصے خود فراموشی کی کیفیت میں، میری مسرت جہاں پر کیا بنتی ہوگی۔ وہ مجھے فریبی، دھوکے باز سمجھتی ہوگی۔ شاید اس نے یہ بھی سوچا ہو کہ میں کوئی آوارہ، بدقماش شخص ہوں جو محض چند دن اس کے ساتھ رکھیں لمحات گزار کر اپنے راستے ہولیا۔ اس کی معصوم آنکھوں میں اپنی ہمراہی کے خواب سجا کر بیچ راستے میں چھوڑ گیا لیکن وہ ملے گی تو اسے سب کچھ بتاؤں گا۔۔۔۔۔۔ اکیس سال خوابیدہ ذہن کے ساتھ گزارے ہیں میں نے۔ میں نے جان بوجھ کر اسے نہیں چھوڑا جس کی محبت پانے کے لیے میں تڑپا رہا تھا اسے جان بوجھ کر کیسے چھوڑ سکتا تھا۔“ وہ جیسے خود کو تسلی دے رہا تھا۔

”میں یہاں سے چلا جاؤں گا تو ان سب کی سوائیہ لگاؤں بھی دکھائی نہیں دیں گی۔ بس ایک دو دن۔۔۔ پھر میں چپ چاپ یہاں سے چلا جاؤں گا بالکل اسی طرح جیسے اکیس سال پہلے مسرت جہاں چپ چاپ یہاں سے چلی گئی تھی۔“

اس نے دل ہی دل میں پختہ ارادہ کر لیا۔ صرف دو دن بعد یہاں سے جانے کا فیصلہ کر چکا تھا کہ اس نے سوچ لیا تھا کہ اب وہ یہاں صرف اسی صورت میں آئے گا جب اس کے ہمراہ مسرت جہاں ہوں گی اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو وہ اس دنیا کی بھیڑ میں ایسے کھو جائے گا کہ پھر خود کو بھی تلاش نہ کر سکے۔



سبک ہوا کے نرم لمس سے جھومتے درخت اور پودے، آسمان پر پھیلا بادلوں کا رتھ اور دور غروب ہوتے ہوئے سورج کی تاریخی کرنیں جنہوں نے بادلوں کو بھی شفق کی سرخی عطا کر دی تھی۔ سبھی کچھ زندہ تھا، جاندار اور خوبصورت لیکن وہ سب اس وقت ان چیزوں کے حسن سے بالکل بے نیاز تھے۔ سادات مگر کالان اس وقت وہاں کے مکینوں سے آباد تھا۔ بچے بھی، بڑے بھی سبھی موجود تھے۔ سوائے ایقہ کے جو چائے بنانے کے خیال سے اٹھ گئی تھی۔ سادات مگر کے مکینوں میں یہ خوبی ضرور تھی کہ پریشانی کے وقت سب ایک دوسرے کا آسرا سہارا بن جاتے تھے۔ اس سے پریشانی ختم تو نہیں ہوتی لیکن اس کی گھنٹی بہت کم ہو جاتی ہے۔ اس وقت بھی سب ہی پریشان تھے لیکن اپنی دانست میں ایک دوسرے کی پریشانی دور کرنے کو مل بیٹھے تھے۔

”ہینا بچی! یہ عارب کل سے دکھائی نہیں دیا۔ کیا کہیں گیا ہوا ہے؟“ بڑی اماں نے ہینا پھپھو

سے پوچھا جو ان کے دائیں طرف لان چیمز پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ بڑی اماں کے پوچھنے پر انہوں نے ان کی طرف دیکھا تو وہ خاموش سی ہو کر ان کو دیکھنے لگیں۔ ایک طویل عرصہ ہو چکا تھا انہیں ان خاموش نگاہوں کو پڑھتے اور ان کی بے بسی کا مفہوم سمجھتے ہوئے۔

”جی اماں بی! وہ گھر پر نہیں ہیں۔ دو تین دنوں سے بہت عجیب رویے سے پیش آرہے تھے۔ کل ایک دو دوست آگئے تو ان کے ساتھ کہیں چلے گئے ہیں کہہ رہے تھے چند دن لگ جائیں گے۔“ ہینا پھپھو کے لہجہ میں محسوس کی جانے والی آرزوگی نے بڑی اماں کا دل دکھا دیا۔

”پتہ نہیں بچی! یہ ایسا کیوں ہے۔ ارے تو تو میری سب سے پیاری بیٹی ہے پر تیری اچھائیاں اس کو زمین کو کیوں نہیں نظر آتیں۔“

”اماں بی! آپ کیوں دل پر لگاتی ہیں۔ اب تو عرصہ ہو گیا عادت سی پڑ گئی ہے۔“ ہینا پھپھو زخمی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر بولیں۔

”یہ خبر نہیں سادات مگر کی خوشیاں کہاں کھو گئیں۔ سکھ اور شانتی جیسے ہم سے منہ ہی موڑ گئی ہے، اب تو ہواؤں کی تیزی سے بھی خوف آتا ہے۔ کل سے میرے بچے سفر پر نکلے ہوئے ہیں۔ دل بہت پریشان ہے۔ اللہ ان کی حفاظت کرے۔ اپنی امان میں رکھے۔“ بڑی اماں کے لہجہ میں اندیشے کھلے ہوئے تھے۔

”اماں بی! وہ ایک نیک مقصد کو لے کر گھر سے نکلے ہیں۔ اللہ ان کی حفاظت کرنے والا ہے۔ بس مجھے طاہر کے پاپا کی طرف سے خدشہ ہے غصے کے تیز ہیں کہیں کچھ کرنے بیٹھیں۔“ فیضی چچی سر سراتے لہجہ میں بولیں۔

”یہ بات تو ہے۔ چاچو کا غصہ تو اللہ معاف کرے۔۔۔ خلاف توقع بات پر کتنی بری طرح بھڑک اٹھتے ہیں وہ۔“ شاذان نے مزید دہشت کڑی ایٹ کرنے کی کوشش کی۔

”اگر ایسی بات ہے تو اظہر بھائی کو جانا ہی نہیں چاہئے تھا۔ غصے پر کنٹرول نہ کر سکے تو بہت برا بھی ہو سکتا ہے۔“ حد ایقہ چچی نے بھی اپنی سیٹ سنہال لی۔ اتنی دیر میں ایقہ بھی چائے لے کر آگئی تھی۔ سب کو چائے سرو کر کے اپنا کپ ہاتھ میں لیے وہ آریان کے قریب نیچے گھاس پر براجمان ہو گئی۔

”کیا بحث چل رہی ہے۔“ آریان کے کان کے پاس منہ لے جا کر اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

”باہر انکل اور اظہر انکل کی باتیں ہو رہی ہیں۔“ آریان نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

”بڑی اماں اگر جو اظہر چچا نے وہاں کوئی ہنگامہ کر دیا پھر۔۔۔“ شاذان بولا۔

”آئے ہائے خیر کے کلمات منہ سے نکالو بچے۔۔۔ اتنے بڑے لوگوں کے بچے کے پھنسے ہوئے ہیں۔ اللہ نہ کرے جو کوئی فساد کھڑا ہو۔ اظہر کو جانا ہی نہیں چاہئے تھا۔“

”اماں بی! آپ کیوں ہلکان ہوئی جارہی ہیں۔ اظہر بچہ تو نہیں۔ سمجھدار، ذمہ دار آدمی ہے معاملہ فہم ہے۔ کیا حالات کی نزاکت کا علم نہیں اسے۔ اس کا اٹھایا ہوا کوئی بھی الناقہ ماریاں اور اس کی مظلوم ماں کے لیے کوئی مصیبت بھی لاسکتا ہے۔“

ہینا پھپھو نے بھی اماں کی پریشانی رفع کرنے کی کوشش کی۔

”ارے بچی معاملہ فیہی اپنی جگہ پر جب وہ کسی بات پر اڑ جاتا ہے تو پھر ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ ضد میں بالکل اپنے مرحوم باپ پر پڑا ہے۔ خدا نخواستہ وہاں کوئی بات مرضی کے خلاف ہوگئی تو فساد کھڑا کر دے گا۔ ارے میرے تودل کو ہول اٹھنے لگے ہیں۔ خدا خیر کرے۔“ بڑی اماں حقیقتاً انتہائی پریشان ہوگئی تھیں۔

”اماں بی! حوصلہ کریں، اللہ سے دعا مانگیں کہ وہ ہماری مدد کرے۔ آریان اور اس کی امی ظالموں کے چنگل سے نکل آئیں۔“ زابدہ چچی بڑی اماں کا ہاتھ تھام کر نرمی سے بولیں۔

”ہاں باہر بتا رہا تھا کہ وہ لوگ بہت برے ہیں۔ وہ اتنی آسانی سے بچھا نہیں چھوڑیں گے۔ وہ کبہر ہاتھ کہ ہم پوری کوشش کریں گے لیکن ممکن ہے آریان کی ماں کو وہ لوگ نہ آنے دیں۔ ارے بچی میں نے تو اسی لیے اس سے کہا تھا کہ اکیلا نہ جا۔ ساتھ اظہر، شاکر میں سے کسی کو لے جا۔ اتنے خطرناک لوگوں کے تو سائے سے بھی بچنا چاہئے۔“ بڑی اماں بولیں لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھیں کہ ان کے ان چند جملوں نے آریان پر کیا اثر کیا تھا۔ وہ تو کل سے پریشان تھی ہی لیکن امید کی ایک ننھی سی کرن نے مایوسی کے اندھیروں کو گدرا دیا ہوا تھا اور اب بڑی اماں کی بات نے امید کی اس ننھی سی کرن کا بھی گلا گھونٹ دیا، اس کی پلکیں نم ہونے لگیں۔

”اماں! ساری زندگی یونہی گھسنے رہنا ہے تمہیں بھی اور مجھے بھی کوئی نہیں جو ہمیں بچا سکے۔ ہمیں جینے کا حق دلا سکے۔“ آنسو پلکوں کی منڈیروں سے پھلکنے کو تھے وہ یک دم اٹھ کر اندر چلی گئی۔

”اسے کیا ہوا.....؟“ حدیقہ چچی نے مھنوں میں اچکا کر عجیب ناگوار لہجے میں کہا۔

”بچی ہے۔ پریشان ہے اپنی ماں کے لیے شاید میری کوئی بات اچھی نہیں لگی۔“ بڑی اماں دھیمے لہجے میں بولیں۔

”آپ نے ایسا کیا کہہ دیا۔“ وہ ہٹ دھرمی سے بولیں۔

”حدیقہ بچی! ضروری نہیں کہ کسی کو طعنوں کے تیروں سے ہی زخمی کیا جائے۔ بعض اوقات جڑے ہوئے زخموں پر نرم روئی کا پھوہا بھی چھتا ہے۔ میں آریان کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ بڑی مہر اور برداشت والی بچی ہے۔ میرے لفظ اس کو ناگوار نہیں گزرے ہوں گے ہاں کوئی بات اس کے دل کو لگی ہوگی۔ اہیقہ، روہیہ بچی تم دونوں اس کے پاس جاؤ۔ اس کی دلجوئی کرنے کی کوشش کرو۔“ بڑی اماں کسی

ماہر نبض شناس کی طرح نہایت مہارت سے آریان کے رویے کی جانچ کرتے ہوئے بولیں۔ اہیقہ اور روہیہ اٹھ گئیں۔

”خیال کرنا بیٹا کوئی دکھ دینے والی بات نہ منہ سے نکالنا۔ تمہارے مضبوط لہجے اس کی ہمت بڑھائیں گے۔“

”جی بڑی اماں!“ وہ سر ہلاتے ہوئے اندر کی جانب بڑھ گئیں۔ فیضی چچی بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”تم کہاں چل دیں فیضی۔“ بڑی اماں نے ان سے استفسار کیا۔

”اماں بی دل بہت پریشان ہے، ان کی طرف سے جی گھبرا رہا ہے، ان کی خیریت اور کامیابی کے لیے اللہ کے حضور دعا کروں گی۔“ وہ بات مکمل کر کے اپنے پورٹن کی طرف بڑھ گئیں۔ ہینا پھپھو پہلے ہی عصر کی نماز کے لیے اٹھ کر جا چکی تھیں۔

”میرا خیال ہے مجھے بھی چلنا چاہئے۔“ حدیقہ چچی بھی اٹھ کھڑی ہوئیں غالباً ماحول میں اب ان کی دلچسپی کی کوئی چیز باقی نہیں رہی تھی اور آج انہوں نے خلاف توقع طور بھی کم ہی کیا تھا۔ ان کے چلے جانے کے بعد اماں بی وہاں اکیلی رہ گئی تھیں، ان کی ہڈ سوچ لگا ہیں غلامیں جی ہوئی تھیں اور ہاتھوں کی انگلیاں تیزی سے تسبیح کے دانوں پر متحرک تھیں۔

اہیقہ اور روہیہ جب کمرے میں داخل ہوئیں تو منظر حسب توقع تھا۔ آریان بند کے ایک طرف سگری سمنی سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی، ہلکی ہلکی لرزش اس کے وجود پر طاری تھی جس سے انہیں اندازہ ہو گیا کہ وہ رو رہی ہے۔ وہ دونوں تیزی سے آگے بڑھیں۔ روہیہ اس کے قریب بیٹھ کر بیٹھ گئی جبکہ اہیقہ نیچے بیٹھ گئی۔ اس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر وہ تھوڑا آگے کو جھکی۔ آریان کے بھیکے گالوں کو دیکھا اور پیچھے ہو گئی۔

”رہنی آپی! موسم بہت خوشگوار سی لیکن آج برسات دیکھنے کو دل نہیں چاہ رہا۔“ اہیقہ کا اشارہ اس کے آنسوؤں کی طرف تھا لیکن وہ خاموش رہی کچھ نہ بولی۔

”رہنی ہم ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں نا..... ہم دوست ہیں نا۔“ روہیہ اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر بولی۔ جواب میں آریان شدت گریہ کے باعث بول تو نہ سکی لیکن اثبات میں سر ہلا دیا۔

”تو پھر اپنے ان قیمتی آنسوؤں کو ضائع مت کرو۔ مجھے بتاؤ کس بات نے تمہیں اتنی تکلیف دی۔ کیا بڑی اماں کی بات سے.....“ روہیہ نے بات ادھوری چھوڑ کر آریان کی طرف دیکھا۔

”نن..... نہیں..... انہوں نے تو ایسا کچھ نہیں کہا۔“ آریان نے تردید کی۔ روہیہ اور اہیقہ کے آنسوؤں سے جیسے اسے کچھ حوصلہ ملا تھا لیکن اس کی آنکھیں ہنوز بھیگی ہوئی تھیں۔

”پھر..... پھر بتاؤ تو کسی رہنی شاید تم نہیں جانتیں کہ تمہارا اس طرح رونا ہمیں کتنی اذیت دے رہا

ہے۔" روبیہ انتہائی سنجیدگی سے بولی۔ آریان نے اس کی طرف دیکھا۔

"روبی! مجھے کسی کی بات نے دکھ نہیں دیا۔ پتھروں کے سچ محبوس تھی میں، پھولوں کا لمس پا کر بہت نازک ہو گئی ہوں شاید اسی لیے آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ روبی! میری ماں..... میری ماں کس قدر عظیم ہے اور کتنی دکھی بھی..... میں نہیں بتا سکتی، لوگوں کی نظروں میں وہ طوائف ہے لیکن کوئی میرے دل سے پوچھے کہ اس کا تقدس اس کی روح کی پاکیزگی کیسی ہے۔ روبی وہ محبت کے قابل ہے لیکن اسے ٹھوکر مل رہی ہیں، اذیتیں اس کا مقدر ہیں۔ پتہ نہیں فواد، باہر نکل اسے ان ٹھوکروں سے بچا بھی سکیں گے یا۔" آریان ایک بار پھر سسک اٹھی۔

"رینی! میں اتنا جانتی ہوں کہ وہ تمہاری ماں ہیں تو ہمارے لیے انتہائی قابل احترام، تمہیں ان کے تقدس کا ثبوت دینے کی ضرورت نہیں۔ جس ماں نے تمہارے حصے کا بھی کرب جھیلنا وہ کوئی بری عورت نہیں ہو سکتی اور پروردگار پر یقین رکھو برائی کبھی بھی نیکی کی راہ نہیں روک سکتی۔" روبیہ اسے تسلی دیتے ہوئے بولی۔

"اور رینی! آپ! یہ جو ہمارے باہر چچا ہیں نا..... یہ اول تو کسی کام میں ہاتھ نہیں ڈالتے اور اگر ذمہ لے لیں تو پھر جب تک اس کام کو انجام تک نہ پہنچائیں سکون کا سانس نہیں لیتے اور خیر سے ہمارے ضدی بچیا بھی پچھا ایسے ہی ہیں۔ اس لیے ہر فکر پریشانی چھوڑ دیں۔ بس دعا کریں کہ اللہ میاں یہ مشکل ہم سب پر آسان کر دے۔" ایقہ جگے پھٹکے انداز میں بولی۔

"ہاں رینی! اس وقت گھر کا ہر فرد اپنی اپنی جگہ دعا گو ہے۔ سب پروردگار سے خیریت اور کامیابی کے لیے دعا گو ہیں۔ تم بھی دعا کرو انشاء اللہ آنے والے دن اذیتوں سے رہائی کے دن ہوں گے۔ خوشیاں تمہارے حصے میں بھی آئیں گی اور وہ عورت جو تمہاری ماں ہے اور ایک عمر سے کرب کے زندان میں مشید ہے اس کو بھی آزادی ملے گی۔ جب رات بہت تاریک ہو جائے نا تو سمجھ لینا چاہئے کہ اس کے پہلو سے روشنی طلوع ہونے والی ہے اور اب یہی روشنی تمہارا مقدر بننے والی ہے۔" روبیہ کے لفظ آریان کے زخموں پر مرہم کا کام دے رہے تھے۔ اس کی آنکھوں کے کنارے خشک ہونے لگے۔ دل بھی کچھ پرسکون ہو گیا شاید رونے سے اندر کا سارا غبار نکل گیا تھا۔ دھڑکنیں دھل گئی تھیں اور سانسوں پر طاری بوجھ بھی ہلکا پڑ گیا تھا۔ اس نے روبیہ کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھام کر وفور عقیدت سے آنکھوں کو لگا لیا۔ سادات گھر کے کیمنوں کی دعاؤں میں اس کی دعائیں بھی شامل ہو گئیں۔



"نہدی! اب بس کرو چلو اب..... پہلے ہی کافی لیٹ ہو گئے ہیں ہم۔" باہر شاہ نے گھڑی پر ایک نظر ڈال کر فواد کو مخاطب کیا جو آئینے کے سامنے کھڑے ٹائی کی ناٹ درست کر رہے تھے۔ اس وقت وہ

اظہر شاہ، باہر شاہ اور ایس پی کامران ریست ہاؤس کے ایک کمرے میں موجود تھے۔ مغرب کی اذان میں کچھ ہی وقت باقی تھا۔ وہ سب ایس پی خاور ملک کی طرف جانے کے لیے تیار تھے۔ فواد نے ناٹ ٹھیک کرنے کے بعد جینڈ بیک ہاتھ میں لیا اور وہ سب کمرے سے نکل آئے۔ اظہر شاہ اور باہر شاہ نے گاڑی کی پچھلی نشستیں سنبھال لیں۔ فواد فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئے جبکہ ایس پی کامران ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہو گئے، ابھی انہوں نے گاڑی اشارت نہیں کی تھی کہ موبائل کی بیل بج اٹھی۔ ایس پی کامران نے کوٹ کی جیب سے موبائل نکالا، آن کر کے کان سے لگایا، کال خاور ملک کی تھی۔

"یار کامران! کہاں رہ گئے ہو تم لوگ! میں کتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں..... وہ لوگ ہمارے منتظر ہوں گے، میں انہیں فون کر کے اپنی آمد سے مطلع کر چکا ہوں۔"

"بس خاور بھائی! ہم نکلنے ہی والے تھے۔" کامران نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے پھر جلدی پہنچو۔" ایس پی خاور ملک نے ریسیور رکھ دیا۔ کامران نے گاڑی اشارت کی اور قدرے تیز رفتاری سے بیک کرتے ہوئے گیٹ سے باہر نکال لے گئے۔ معروف شاہراہوں پر مناسب حد تک تیز رفتار ڈرائیونگ کرتے ہوئے تقریباً دس منٹ میں وہ ایک عالی شان ہنگلے کے سامنے موجود تھے۔ بہت بڑے آگنی گیٹ کے سامنے بیٹھا ہوا گن بردار چوکیدار انہیں گاڑی روکتے دیکھ کر چونک کر ہو گیا تھا۔ کامران نے گاڑی بالکل اس کے قریب روکی۔

"صاحب کو بلاؤ۔" کامران نے بغیر کسی تمہید کے حکم پر لہجے میں کہا۔

"آپ کون ہیں؟" چوکیدار گہری نظروں سے ان چاروں کو دیکھنے لگا۔

"اپنے صاحب سے کہو کہ کامران صاحب آئے ہیں۔" کامران قدرے کرحشت لہجے میں بولے تو چوکیدار کچھ مرعوب سا ہو کر پلٹا۔ اسی پل آگنی گیٹ کے قریب لگا بغلی دروازہ کھلا اور اس میں سے ایس پی خاور ملک برآمد ہوئے غالباً انہوں نے گاڑی روکنے کی آواز سن لی تھی۔ وہ بھی ہانگلے تیار تھے البتہ کوٹ پہننے کی بجائے ایک بازو پر ڈال رکھا تھا۔ گچھلی سائیڈ کا دروازہ کھول کر وہ اظہر شاہ کے ساتھ بیٹھ گئے اور دروازہ بند کر دیا۔

"ہم اس وقت ایک گھنٹہ لیٹ ہو چکے ہیں کامی۔" ایس پی خاور ملک نے کامران کو مخاطب کیا جنہوں نے ان کے جینٹے ہی گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔

"تو کیا آپ نے ان کے ساتھ نام فکس کر رکھا تھا؟"

"ہاں میں نے فون پر ان سے وقت لے لیا تھا اور وہاں بھی ہمارے منتظر ہوں گے۔"

"کیا مطلب؟ ہم کیا وہاں تماش بین بن کر جا رہے ہیں۔" اظہر شاہ تنگ کر بولے۔

"ارے صاحب! ہمارا مال، حال، ناکام مقصد کیا ہے یہ تو صرف ہم جانتے ہیں نا۔ وہ تو یہی جانتے

ہیں کہ شہر کا ایس پی آج ان کے کوٹھے پر آ رہا ہے۔" ایس پی خاور ملک نے مسکراتے ہوئے کہا۔ گاڑی اس وقت نسبتاً سکون اسیا سے گزر رہی تھی۔ کامران مشتاقی سے ڈرائیونگ کر رہے تھے۔

"کامی! تمہارے نزدیک اس مسئلے کو کس طرح ہینڈل کیا جائے، تم نے اس پر کوئی ہوم ورک کیا؟"

"کیا مطلب خاور بھائی؟ میں سمجھا نہیں۔"

"بھئی یہاں تک تو معاملات اور حالات کسی حد تک درست رہے ہیں لیکن اب معاملہ صرف ہمارے درمیان نہیں رہے گا۔ اب دوسرا فریق بھی اس میں شامل ہو جائے گا اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ اب آگے کیا کرنا ہے کچھ اس بارے میں سوچا۔ وہاں جا کر کیا کرنا ہے کیا کہنا ہے؟"

"ملک صاحب! کہنا کیا ہے جس مقصد کے لیے آئے ہیں اسے پورا کرنا ہے بس دو لفظی بات ہی تو کرنی ہے، ہم کون سا کسی مباحثے میں شرکت کرنے جا رہے ہیں۔" اظہر شاہ مضبوط لہجے میں بولے۔

"شاہ جی! مقصد کے حصول کے لیے تک دو بھی تو کی جاتی ہے ہم جس کام کے لیے جا رہے ہیں وہ اتنا معمولی نہیں ہے جتنا آپ سمجھ رہے ہیں اور نہ ہی یہ دو لفظوں میں نمٹنے والی بات ہے۔" خاور ملک معاملے کی گہرائی اور الجھاؤ کو بخوبی سمجھ رہے تھے۔

"اتنا غیر معمولی بھی نہیں ہے ملک صاحب! بھلا ہم چار پانچ مرد مل کر ایک عورت کو نہ ہینڈل کر سکیں گے۔"

"شاہ جی! آپ شاید اس قسم کی عورتوں کے بارے میں معلومات نہیں رکھتے، وہ کوئی مجبور و بے بس، حالات کی چکی میں پسنے والی مظلوم عورت نہیں بازار حسن کی سب سے مشہور ناگہ ہے۔ بڑے بڑے بیوروکریٹس اس کی ایک جنبش ابرو پر کچھ بھی کر گزرنے کو تیار ہو جائیں۔" خاور ملک بولے۔

"لیکن اس کی پہنچ سے ڈر کر ہم پیچھے تو نہیں ہٹ سکتے۔" مگر سیدھی انگلیوں سے نہ نکلا تو انگلیاں نیز مچی بھی کی جاسکتی ہیں۔"

"اظہر صاحب! جوش سے نہیں ہوش سے کام لیں۔ آپ کوئی نوجوان یا غیر ذمہ دار شخص تو نہیں کہ معاملے کی سنگینی اور نزاکت کو نہ سمجھ سکیں۔ اس وقت گیند ستارہ بیگم کے کورٹ میں ہے سو ہمیں نہایت طریقے سے چلنا پڑے گا، ہمیں مسئلے کو حل کرنا ہے اس میں مزید پیچیدگیاں پیدا نہیں کرنی۔"

"تو میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں کہ بجائے اس عورت سے ڈرنے کے اپنا مدعا اس کے سامنے بیان کر دیں گے، سیدھی طرح مان گئی تو ٹھیک ورنہ پھر کوئی اور طریقہ استعمال کرنا پڑے گا۔"

"دیکھئے! ہم اس عورت سے ڈر نہیں رہے اور نہ ہی اپنا مدعا بیان کرنے کی ہمیں جلدی ہے۔ پہلے اسے رام کر کے اپنے ٹریک پر لانے کے بعد اصل مقصد پر آئیں گے تو ہمیں کامیابی حاصل ہوگی۔ آپ

ایک کاروباری شخص ہیں یہی سمجھ لیں کہ ہم یہاں ایک ڈیل کرنے جا رہے ہیں۔ ایک ٹینڈر پاس کروانا ہے لیکن اس ٹینڈر کے اور بھی کئی امیدوار ہیں سب سے زیادہ ٹینڈر کا مالک دلچسپی لے رہا ہے۔ ایسی صورت میں ہمیں بہت سوچ سمجھ کر چلنا ہے کہ ہر امیدوار کو کلک آؤٹ کر کے مالک اپنی دلچسپی کو پس پشت ڈال کر وہ ٹینڈر ہمارے حوالے کر دے۔ ایک بزنس مین سمجھ سکتا ہے کہ یہ کس قدر مشکل ڈیل ہے، ہم اسے نہ تو مجبور کر سکتے ہیں اور نہ ہی طاقت کے زور پر اپنی بات منوا سکتے ہیں پھر یہی ہے کہ معاملہ کیونسی کیشن کے ذریعے حل ہو اور اگر اس پروجیکشن میں آپ کچھ سخت کہیں گے تو معاملہ الٹ بھی ہو سکتا ہے۔"

خاور ملک نے انہیں رسانیت سے سمجھایا۔

"مجھے سمجھ نہیں آرہی ملک صاحب! کہ سیدھا صاف راستہ ہے پھر ہمیں پیچیدہ بل کھائے ہوئے راستے پر چلنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"یہی تو بات ہے نا شاہ جی! کہ یہاں پیچیدہ راستے میں ہمارے لیے نسبتاً کم دشواریاں ہیں۔"

"ملک صاحب! کیا اس سلسلے میں آپ کے اختیارات بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ بالفرض محال اگر ہمیں قانون کا راستہ اختیار کرنا پڑے تو کیا تب بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

"قانون..... کون سے قانون کی بات کر رہے ہیں، اظہر صاحب؟ ہم جیسے بظاہر ہر اختیار لوگ انہی اختیارات کی جھلکیوں میں جکڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ مجبور..... ہم سے اسی قانون کی آزمائش غیر قانونی کام لیے جاتے ہیں۔ ان اونچی کرسیوں پر بیٹھنے والوں نے قانون کو رکھیل بنا رکھا ہے۔ ان کے ہاتھ میں ڈوریاں ہیں اور قانون کے اصول کٹھ پتلیاں۔ جیسے چاہیں نچا دیں۔ اور یہ ستارہ بیگم اور اس جیسی کئی بڑی ٹائیکانیں ہم سے زیادہ اختیار ہوتی ہیں کہ قانون بنانے والے ان کے تلوے چانتے ہیں، ہم ان پر ہاتھ ڈال بھی دیں تو اگلے دن اوپر سے ان کی سفارش آ جائے گی، ان کے بڑے بڑے لٹکس ہماری پیشیاں تو اتر دیا سکتے ہیں لیکن ہم ان کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔" خاور ملک کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

"حیرت ہے! ایک بیوروکریٹ ہو کر آپ اس طرح کی بات کر رہے ہیں۔ آپ چاہیں تو کیا نہیں ہو سکتا، پورے شہر کے حاکم ہیں آپ۔"

"نہیں اظہر صاحب! حاکمیت تو دور کی بات ہم تو خود حکم کے غلام ہیں، ہم جیسے بیوروکریٹس کو تو ستارہ بیگم جیسی عورتیں چٹکی میں مسل دیں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں ایک اسلامی مملکت میں جہاں مکمل عام گناہ کبیرہ کی دعوتیں دی جاتی ہیں، قحبہ خانے اور ریڈ لائٹ ایریا ہیں، یہ سب ہماری یا ہمارے قانون کی نگاہوں میں نہیں ہیں، ایسی بات نہیں ہم سب کچھ جانتے ہیں، کہاں کیا ہو رہا ہے لیکن ان لوگوں کے پاس کچھ ایسے قانونی جواز ہوتے ہیں جن کی بناء پر ہم ان پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے پھر ان لوگوں کی پشت پناہی کرنے والوں کی بے حساب طاقت کے سامنے بھی ہمارا پانچ قانون نہیں ٹک سکتا۔ یہ اگر اتنا آسان ہوتا

تو یہ کوٹھے آپ کو آباد نہ کھائی دیتے۔۔۔۔۔ یہ انہی اونچے ایوانوں کے مالکان کے دم قدم سے ہیں۔“ ایس بی خاور ملک نے ایک تلخ حقیقت بیان کی۔

”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم سب نے ایک طوائف کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہیں، ہم اس کی پہلی سے خوف زدہ ہو گئے ہیں، اعنت ہے ہمارے مرد ہوتے پر۔“ اعظم شاہ کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔ ایس بی خاور ملک نے ایک نظر ان کے چہرے کے کھڑے تاثرات پر ڈالی اور گویا ہوئے۔

”یعنی آپ کا خیال ہے کہ کسی قسم کا ہنگامہ کر کے اپنا مقصد حاصل کیا جائے۔۔۔ یہی کہنا چاہیے جس ناں آپ۔۔۔ لیکن سوری نو سے اعظم صاحب! یہاں مردانگی آزمانے کا نتیجہ مائتس زہرہ کے سوا کچھ نہیں نکلتے گا۔ بہر حال میرا مقصد تو آپ کو سمجھانا تھا، آگے آپ لوگوں کی مرضی۔“ خاور ملک کے لہجے میں ناراضگی تھی۔ اعظم شاہ سے بات کرنے کے بعد انہوں نے ڈرائیونگ کرتے کامران کو مخاطب کیا۔

”کافی۔۔۔ میرا خیال ہے میرا تم لوگوں کے ساتھ چلنا بھی کچھ زیادہ فائدہ مند نہیں ہو گا اور میری کچھ ایسی ضرورت بھی نہیں، گاڑی روکو میں واپس جانا چاہتا ہوں۔“

”ارے خاور بھائی! ناراض نہ ہوں۔۔۔ جیسے آپ بہتر سمجھیں گے اور کریں گے ہم بھی وہ کریں گے۔“ کامران بخیرگی سے بولے

”میں ناراض نہیں۔۔۔ لیکن میں اپنے کیریئر کو داؤ پر لگانا نہیں چاہتا۔ اب تک کے بے دارغ کیریئر پر کوئی دھبہ لگ جائے، کم سے کم یہ مجھے منظور نہیں پھر میرا خیال ہے کہ یہ معاملہ ان کا یا ستارہ بیگم کا ہے یا آپس میں جیسے چاہیں گے ڈیل کر لیں گے۔“ خاور ملک حقیقتاً اعظم شاہ کی ضد سے ٹالاں تھے۔

”نہیں ملک صاحب! ہم آپ کے توسط سے جا رہے ہیں اس لیے آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہو گا۔ آپ اس مسئلے پر ہماری مدد کا وعدہ کر چکے ہیں اس لیے پلیز کول ڈاؤن۔۔۔ اور اعظم یار تم بھی قفل سے کام لو۔۔۔ ابھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا ہے محض مفروضے قائم کئے جا رہے ہو۔ دیکھو، جھگڑا یا ہنگامہ کسی مسئلے کا حل نہیں ہو سکتا۔ اس وقت ہم حاجت مند ہیں سو ہمیں جھگڑنا پڑے گا اگر وہ کچھ سخت ست سنائے بھی تو چپ کر کے من میں گے۔ اس لیے کہ مسئلہ دو افراد کی زندگی کا ہے۔ کچھ دیر کے لیے اپنے آپ کو جھکا لینے میں کوئی ہرج نہیں۔“ بار شاہ پہلے خاور ملک سے اور بعد میں اعظم شاہ سے مخاطب ہوئے۔

”لیکن بھائی!۔۔۔“ اعظم شاہ نے کچھ کہنا چاہا۔

”اعظم! تمہیں میری بات پر یقین ہے یا نہیں، ابھی تو ہم اس عورت سے ملے ہی نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ پہلی بار ہی میں مان جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمیں یہاں چند بار آنا پڑے۔ تو یار! آئیں گے۔ ہر ممکن طریقے سے کوشش کریں گے کہ یہ معاملہ پس من و خوبی منت جائے اور اگر ایسے نہ مل ہو تو پھر تمہارے طریقے پر چلنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہے گا۔“ بار شاہ بہت دھمے لہجے میں بولے

اور ان کے الفاظ کا خاطرہ خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔ اعظم شاہ مان گئے۔

”ٹھیک ہے جس طرح آپ مناسب سمجھیں۔“ ان کا لہجہ اور چہرے کے تاثرات بھی کسی حد تک نرم پڑے گئے۔ بار شاہ نے طمانیت بھری سانس لے کر بیٹ کی پشت سے سر نکا دیا۔ خاور ملک کے ستے ہوئے اعصاب بھی کچھ ڈھیلے پڑ گئے۔ اس تمام عرصے میں فواد کچھ نہیں بولے تھے، ان کا ذہن مسلسل ادھیڑ میں تھا وہ حالات کی نزاکت کو پوری طرح سمجھ رہے تھے اور یہ بھی جان رہے تھے کہ جو مسئلہ انہیں درپیش ہے اس کا حل بے انتہا قفل، بردباری اور سو جہ بوجھ سے ہی ہو سکے گا۔ ذرا سی بے احتیاطی، ذرا سا اشتعال سارے کئے کرائے پر پانی بھیرنے کو کافی تھا۔

آریان اور اس کی ماں ستارہ بیگم کی ملکیت تھیں۔ وہ چاہتی تو انہیں آزاد کر دیتی۔ چاہتی تو ان کی قیمت لے لیتی یا پھر ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ وہ کسی قیمت پر ان دونوں کو نہ جانے دیتی کہ بہر حال وہ دونوں اس کے کاروبار کی بنیادی اکائیاں تھیں۔ بار شاہ نے اعظم شاہ کو تو سمجھا بھجا دیا تھا لیکن وہ شکر تھے اس لیے کہ کوٹھے کا ماحول اور وہاں بسنے والوں کی ذہنیت کو وہ بہت اچھی طرح سمجھتے تھے۔ وہاں پہنچ کر بھی اعظم شاہ کی طرف سے انہیں فکر لگی دینی تھی کہ خراج کے خلاف کوئی بھی بات سن کر وہ سچے سے اکھڑ سکتے تھے بہر حال اوکھلی میں سر دے کر موصولوں سے ڈرنے والوں میں سے تو وہ بھی نہ تھے۔ اب جو ہونا تھا اسے فیس کرنا تھا۔

گاڑی چند ایک خوبصورت کوئٹوں کے قریب سے گزر کر سڑک کے ایک طرف رکتی۔

”یہاں سے پیدل آگے جانا پڑے گا، گاڑی آگے نہیں جاسکتی۔“ خاور ملک اپنی جانب کا دروازہ کھولتے ہوئے بولے تو وہ سب بھی گاڑی سے نیچے اتر آئے۔ سڑک کے دائیں طرف قدرے کشادہ گلی تھی۔ خاور ملک اس گلی کی طرف چل پڑے تو باقی سب بھی ان کی تقلید میں آگے بڑھنے لگے۔ فواد نے بازار حسن کا صرف ہم ہی سنا تھا۔ پہلی بار ایسی جگہ آئے تھے، انہیں یہ جگہ کوئی غیر معمولی نہیں دکھائی دی۔ دو منزلہ تین منزلہ مکانات کی آسنے سامنے بنی قطاریں کہیں سے کشادہ اور کہیں سے تنگ گلیاں کافی آگے آنے کے بعد وہ دو بارہ دائیں جانب مڑ گئے۔ بائیں ہاتھ پان سٹریٹ بیڑی کی دو تین دکانیں تھیں یہ گلی کچھلی گلیوں کی نسبت قدرے وسیع تھی اور لوگوں کی آمد و رفت بھی تھی۔ قدم قدم پر پھول بیچنے والے ہاتھوں میں پھولوں کی لڑیاں لیے کھڑے تھے اور ہر نووارد کی طرف پلکتے تھے۔ مغرب کی لڑان ہو چکی تھی، مکانات کے اوپری چو بارہ سے روشن ہو چکے تھے۔

”ہاں۔۔۔ پھول تو لے لو۔۔۔“ ایک عورت جلدی سے آگے بڑھی اور اس نے پھولوں کی لڑیوں والا ہاتھ کامران کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔

”نہیں چاہئیں۔“ کامران سنی ان سنی کر کے آگے بڑھے۔